سلسلۂ تجدیدِ دین (۳)
تجدیدِ
تصوّف و سُلوک
حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ
خلیفۂ اقدس
حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی
رحمہما اللہ تعالیٰ
المکتبۃ الاشرفیۃ
جامعہ اشرفیہ
فیروز پور روڈ لاہور
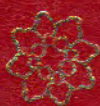
دیباچہ

اس " سلسلہ تجدیددین " کی بحمد اللہ چار کتابیں مکمل ہیں' مزید تجاویز بھی ہیں' اللہ تعالیٰ پوری فرمائیں۔

۱ ۔ پہلی کتاب " جامع المجددین " ہے۔ اس میں دین کے مختلف شعبوں' عقائد و عبادات' معاملات و معاشرات اور اخلاق ---- میں جو جو مفاسد اور امراض کوتاہیاں اور کمزوریاں ہمارے اندر گھر کر گئی ہیں ان کا اجمالی جائزہ لے کر اصلاح کی ایسی آسان اور اختیاری تدابیر کو جمع کر دیا گیا ہے جن پر عمل کرکے مسلمان از سر نو اسلامی زندگی کی دینی و دنیوی برکات و ثمرات سے مالا مال ہوسکتے ہیں۔

اس اعتبار سے یہ چاروں میں سب سے اہم و اقدم ہے۔ "تجدیددین" کی نوعیت و اہمیت پر بھی اسی میں گفتگو ہے' اور حضرت سید محترم مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ العالی کا تجدید کی تاریخ و تحقیق' اور حضرت (جامع المجددین) علیہ الرحمہ کی تجدیدی و اصلاحی جامعیت و وسعت پر مستقل مقدمہ بھی اس میں شریک ہے ------ طباعت و اشاعت بھی اسی کی مقدم ہونا تھی' انشاء اللہ زیادہ تاخیر نہ ہوگی' کتابت ہو رہی ہے۔

۲ ۔ لیکن بوجوہ دوسری یعنی پیش نظر کتاب۔ "تجدید تصوف و سلوک"۔ کی اشاعت مقدم ہوگئی' تصوف نام دراصل دین کی روح و معنی یا کیف و کمال کا ہے' مگر بدقسمتی سے دین کے تمام شعبوں سے زیادہ تر تو غلطیاں بلکہ گمراہیاں اسی میں سرایت کرگئیں' جس کی بدولت رہا سہا دین بھی معنویت سے خالی بے جان و بے کیف ہو کر رہ گیا۔

اعلیٰ حضرت حکیم الامت مجدد ملت (مرشدی و مولائی مولانا شاہ اشرف علی نوراللہ مرقدہ) کی تجدیدی خدمات و توجہات کا بڑا حصہ بھی دین کے اس کیف و کمال (تصوف) ہی کی تجدید و تحقیق کے حصے میں آیا ہے' اور الحمد للہ کہ راقم احقر

کے اس "سلسلہ تجدید" میں بھی یہ پوری کی پوری ایک کتاب (تصوف) کے حصے میں آئی۔ جو ضخامت میں چاروں کتابوں کے ایک ثلث سے بھی زیادہ ہی ہوگئی۔ پھر بھی ع

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"

بلکہ حق یہ ہے کہ نا اہل سب سے زیادہ اسی حصہ کی تحریر کا نا اہل تھا' تاہم حق تعالیٰ کی بڑی نعمت کا بڑا کفران ہوگا اگر اس بے پایاں فضل و احسان کا اقرار نہ کیا جائے کہ قلم تو بے شبہ اسی نا اہل کے ہاتھ میں تھا۔ باقی سارے دوران تحریر میں غیبی تائیدات کا علانیہ مشاہدہ رہا وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ ع

"داد حق را قابلیت شرط نیست"

اور الحمدللہ حمداً کثیراً کہ ان اوراق کے دامن میں اسی غیبی نصرت کی بدولت اسلامی تصوف و سلوک اصول و فروع اور تعلیم و تربیت سے متعلق ایسا جامع مستند ذخیرہ ہزاروں اوراق کی ورق گردانی اور اخذ و استنباط سے جمع ہوگیا ہے کہ بے تکلف عضو کیا جاسکتا ہے کہ کسی اسلامی زبان میں ایسی جامعیت و احاطت تحقیق و تنقید کا کوئی مجموعہ موجود نہیں۔ کاش کوئی سعادت مند قلم اس کی تلخیص ہی کو عربی و انگریزی کا جامعہ پہنا دیتا تو اپنے پرائے سب اسلامی تصوف کے جمال و کمال کو جان پہچان کر پھر نہ اس پر بدعت و رہبانیت کا دھوکا کھاتے نہ جوگ اور اشراقیت کا' اور خدا چاہتا تو مغربی محققین و مستشرقین کی بھی آنکھیں کھل جاتیں۔

با ایں ہمہ راقم نا اہل کا قلم چونکہ کسی نہ کسی درجہ میں شریک تو تھا ہی' اس لئے احتیاط لازم تھی سب سے زیادہ احسان و کرم اس معاملہ میں بھی حضرت سید محترم (مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ) ہی کا ہے کہ "حیات طیبہ" اور بعض دیگر ضمنی و ذیلی اجزا کے سوا باقی تصوف و سلوک کے اصل حصہ کو تمام و کمال جس طرح اور جس توجہ سے ملاحظہ فرما کر مطمئن فرمایا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ متعدد مقامات پر حرف "س" (سلیمان) کے ساتھ مختصر تشریحی افادات سے ناظرین

مستفید ہوں گے۔ اور آخر میں جب کتاب کے پروف آ رہے ہیں کرم بالائے کرم یہ فرمایا کہ "اشرف الحیات" کے نام سے حضرت علیہ الرحمہ کی جو سوانح حیات مرتب فرما رہے تھے (جس کی تکمیل فرما نہ سکے) اس کا مقدمہ بعنوان "حقیقت تصوف کا مکتشف اعظم اور فن حصول احسان و تقویٰ کا مجدد کامل" روانہ فرما دیا ہے۔ ماشاء اللہ بالکل تجدید تصوف کا مقدمہ اور "بقامت کہتر بہ قیمت بہتر" کا پورا پورا مصداق ہے، اصل کتاب گویا اس کی شرح ہے۔

اس کے علاوہ "حیات طیبہ" کا پورا جز الفرقان اور تصوف و سلوک کا معتدبہ حصہ معارف میں کتابی صورت سے پہلے شائع ہو کر مختلف طبقات خصوصا خود حضرت علیہ الرحمہ کے سلسلہ کے اکابر حضرات کی نظر سے گذرا اور گذارا جاچکا ہے۔ ان ظاہر و باطن کے جامع حضرات نے اپنی تصویب و تحسین سے مزید اطمینان بخشا۔

پھر بھی قارئین کرام سے عام طور پر اور حضرت کے متوسلین حضرات سے خاص طور پر درخواست ہے کہ جو چھوٹی بڑی غلطی و کوتاہی خصوصا حضرت علیہ الرحمہ کے مسلک و تحقیق کی فہم و تعبیر میں معلوم ہو اس پر ضرور متنبہ فرما کر ممنون فرمائیں اور عنداللہ ماجور ہوں۔ دوسری میں اشاعت انشاء اللہ استفادہ ہوسکے گا۔

طالب دعاء احقر العباد

"عبد الباری"

شبستان قدم رسولؐ ۔ ہارڈنگ روڈ ۔ لکھنؤ

۹ ر ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ مطابق ۳ ر اکتوبر ۱۹۴۹ء

فہرست

حقیقت تصوف کا مکتشف اعظم

(حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

ص ۲۱ تا ص ۹۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حقیقت تصوف کا مکتشف اعظم

اور

فن حصول احسان و تقویٰ کا مجدد کامل

پیش نظر اوراق میں ایک ایسی ہستی کا مرقع پیش کیا جا رہا ہے جو اپنے وقت میں مجموعہ کمالات اور جامع انواع فضائل تھی ۔ حافظ' قاری' مدرس' مفسر' محدث' فقیہ' واعظ' صوفی' متکلم' مناظر' ناظم' ناشر' ادیب اور خانقاہ نشین شیخ سب کچھ تھی' لیکن اس نے سب سے بڑھ کر اپنے تمام فضائل و کمالات کو فن تصوف کی اصلاح و تکمیل میں صرف فرما دیا' اور ان علوم و فنون میں سے ہر ایک پر عالمانہ اطلاع اور محققانہ عبور کے باوجود ان میں سے کسی کو اپنا تنہا اور مخصوص شغل نہیں بنایا' بلکہ اپنے تمام علوم و فنون و کمالات کو صرف اسی ایک فن شریف کی خدمت میں لگا دیا' اس لئے یہ کہنا گویا صحیح ہے کہ اس کو تمام دوسرے علمی و عملی کمالات دیئے ہی اس لئے گئے تھے کہ اس فن کی تجدید ہو جو دنیا میں کس مپرسی کی حالت میں اور ہندوستان میں بہ حالت غربت تھا' جس کی حقیقت پر تو بر تو پردے پڑ گئے تھے اور جس کی تابانی پر بدعات کی ظلمت غالب آ گئی تھی' اور جو دکاندار صوفیوں کے ہاتھوں دنیاداری اور کسب معاش کے فنون میں سے ایک فن کی حیثیت میں آ گیا تھا' اور جہاں اس کا وجود تھا بھی وہ یا محض چند فلسفیانہ خیالات کا مجموعہ ہو کر رہ گیا تھا یا اور اود وظائف کے ایک نصاب کا سلف صالح نے اس فن کے جو ابواب و مسائل منقح کر کے لکھے تھے وہ بالکل ہی فراموش ہو گئے تھے اور

خصوصیت کے ساتھ سلوک کی حقیقت اور غایت بالکل ہی چھپ گئی تھی' اور جہاں کسی قدر اس کا نام و نشان تھا وہاں علم میں وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود کی ناقابل افہام و تفہیم بلکہ ناقص تعبیر پر' اور اعمال میں صرف ذکر و فکر و مراقبہ کے چند اصول پر پوری پوری قناعت تھی' بدعات نے دین کا نام اور رسوم نے سلوک و تصوف کی جگہ حاصل کر لی تھی' طریقت اور شریعت کو دو متقابل حریف ٹھہرا کر ان میں سے ایک کو گرانے کی کوشش کی جا رہی تھی ' عام صوفیوں کی زبانوں پر چند جاہلانہ فقرے اور چند مبتدعانہ اصول و اعمال رہ گئے تھے جن کو طریقت کا نام بخشا گیا تھا۔

صوفیانہ خانوادوں کی جہالت اور موروثی گدی نشینی کی متواتر رسم نے اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اجتباء اور مقبولیت کو بھی ایک صنعت گری کا کارخانہ بنا رکھا تھا ' انقاہوں کا کام صرف اعراس و فاتحہ کا اہتمام اور سماع و رقص و قوالی کا انصرام رہ گیا تھا' مقررہ دنوں اور مہینوں میں کچھ لوگ جمع ہو کر فاتحہ خوانی کر لیں' مٹھائی کھا لیں اور ایک جگہ بیٹھ کر کسی سازندہ کے ترانے پر ہو حق کر لیں' اور زیادہ بڑھیں تو وحدۃ الوجود کی آڑ پکڑ کر شوخی و بیباکی اور رندی کے اشعار و مضامین پڑھ لیں اور سر دھن لیں۔ چند سینہ بسینہ راز تھے جن کو بے سمجھے بوجھے بار بار دہرایا جا رہا تھا۔ تصحیح عقائد' تحسین عبادت' اتباع سنت' اصلاح اعمال اور ادائے حقوق عباد جو اصل دین اور صحیح سلوک تھا وہ ہر جگہ سے مٹ چکا تھا۔ علمائے ظاہر چونکہ باطن کے منکر تھے یا باطن سے ناآشنا تھے' اس لئے ان کے پند و نصائح کی حیثیت صوفیوں میں تفقیح ناشناس سے زیادہ نہ تھی' اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ چونکہ طریقت کے اصل راز سے واقف نہیں اس لئے ان کی بات سننے کے قابل نہ تھی اور علمائے ظاہر چونکہ باطن سے منکر یا ناآشنا تھے وہ ان دکاندار صوفیوں کو دیکھ کر اصل فن سلوک کو ضلالت اور گمراہی قرار دینے لگے تھے اور اس کے اصول و مسائل کو خلاف شریعت اور مخالف کتاب و سنت سمجھتے تھے۔

یہ نہیں کہا جاتا کہ علمائے حق اور صوفیائے برحق کا مطلق وجود ہی نہ تھا' بے شبہ جا بجا صحیح و صالح بزرگوں کے سلسلے قائم تھے' کہیں کہیں ان کے فیوض و برکات بھی جاری اور ان کی تعلیم و تربیت کی برکت بھی عیاں تھی۔ لیکن یہ جو کچھ تھا خواص کے لئے تھا' اور محدود حلقوں میں تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اشخاص کی تلقین و ہدایت تو ہو رہی تھی' مگر تدوین فن' ترتیب اصول تحقیق مسائل تالیف رسائل' اصل سلوک کے مضامین کو کتاب و سنت کی اور سلف صالحین اور اولیائے کاملین کی تشریح و توضیح سے ملا کر دیکھنے کے کام کہیں نہیں ہو رہے تھے' اور نہ خطب و مواعظ اور تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کے خیالات کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی تھی' اور نہ رد شبہات دفع شکوک' رفع اوہام کے لئے کوئی سلسلہ تھا' اور نہ سالکین کی ظاہری و باطنی تربیت کی کوئی ایسی درسگاہ تھی جس میں راہ کی مشکلات کو علمی و فنی طریق سے بتایا اور سکھایا جاتا ہو' اور نہ کہیں کوئی ایسی مسند بچھی تھی جہاں شریعت و طریقت کے مسائل پہلو بہ پہلو بیان ہوتے ہوں' جہاں تفسیر و فقہ و حدیث کے ساتھ امراض قلب کے علاج کے نسخے بھی بتائے جاتے ہوں' جو کتاب و سنت میں موجود ہوں' جہاں ایک طرف قال اللہ وقال الرسول کا ترانہ بلند ہو اور دوسری طرف عبودیت و بندگی کے اسرار اور اتباع سنت کے رموز بھی سکھائے جاتے ہوں جہاں جس قلم سے احکام فقہی کے فتاوے نکل رہے ہوں' اسی قلم سے سلوک و طریق کے مسائل بھی شائع ہو رہے ہوں' اسی منبر سے ان کی روحانی حقیقت اور ان کی قلبی اداکاری کے طریق بتائے جا رہے ہوں۔ اللہ تعالٰی نے اس صدی میں اس کام کے لئے حضرت حکیم الامت مجدد ملت (مرشدی و مولائی مولانا شاہ اشرف علی) علیہ الرحمتہ کا انتخاب فرمایا' اور وہ کام ان سے لیا گیا جو چند صدیوں سے معطل پڑا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ زمانہ کا تقاضا تھا کہ اس کے مقتضیات نے جو نئی ضرورتیں پیدا کر رکھی ہیں دین کی حفاظت کے لئے ان کا بندوبست بھی کر دیا جائے' چنانچہ ایک

طرف کلام پاک کی تفسیر کی جلدیں تیار ہوئیں' دوسری طرف احادیث نبویہؐ کے نئے مجموعے ترتیب پائے' تیسری طرف فقہ و فتاویٰ کا سرمایہ جمع ہوا' چوتھی طرف علم اسرار و حقائق کی تدوین ہوئی' پانچویں گوشہ میں تصوف کے اصول جمع کئے گئے جو اب تک جمع نہیں ہوئے تھے ' ان میں ان کے ان احوال و کیفیات پر گفتگو کی گئی جن کے نہ سمجھنے سے بیسیوں قسم کی گمراہیاں راہ پاتی ہیں' ایک اور سمت میں مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ کی مثنوی کے دفتر کھولے گئے جن کے سپرد صدیوں سے حقائق و دقائق کے خزانے ہیں' عوام کی طرف توجہ کی گئی تو زندگی کی روح کا سراغ لگایا گیا ان کی شادی اور بیاہ کے مراسم کی اصلاح کی گئی' نیک و صالح بیبیوں کے لئے بہشتی زیور کا سامان کیا گیا' بچوں کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کے آداب و اصول مرتب فرمائے' مدرسین کے قواعد و ضوابط کے نقشے بنائے' داد وستد اور خرید و فروخت اور معاملات کے دینی اصول سمجھائے اور دین کی تعلیم میں شریعت کی وسعت دکھائی گئی جس میں مسلمان کی پوری زندگی ولادت سے موت تک سما گئی ' عوام مسلمان رہرووں کے لئے مواعظ کی سینکڑوں مشعلیں جا بجا روشن کی گئیں' اور بیسیوں شہروں میں پھر پھر کر ان کو غفلت کی نیند سے چونکایا گیا' علماء اور فقہاء اور محققین کے لئے بو اور ونوادر اور بدائع کے سلسلے قائم کئے گئے - مدت کی بند شدہ راہ جو ائمہ مجتہدین کی خطاؤں کے استدراک کے لئے رجوع عن الخطاء کے اعلان کی تھی وہ ترجیح الراجح کے نام سے کھولی گئی اور اپنی ہر غلطی و خطاء کا علی روس الاشہاد اعلان کیا گیا' تاکہ آئندہ مسلمانوں کے لئے ٹھوکر کا باعث نہ بنے - نو تعلیم مسلمانوں کے شکوک و شبہات کا جواب دیا گیا' باطل فرقوں کی تردید میں رسائل لکھے گئے' اخلاق و اعمال اور حقوق عباد کی وہ اہمیت ظاہر کی گئی' اور ہزاروں مسلمانوں کو ان کی وہ تعلیم دی گئی جن کو مسلمان عوام کیا خواص بھی بھلا بیٹھے تھے - اصول و ضوابط اور آداب کی وہ تربیت فرمائی گئی جو دین سے تقریباً صدیوں سے خارج کیا جا چکا تھا -

اور پھر اپنے بعد اپنی روش پر تعلیم و تربیت کے لئے ڈیڑھ سو کے قریب مجازین کو چھوڑا' جو ان کے بعد بھی ان کاموں میں مصروف ہیں - اس حلقہ فیض میں علماء بھی داخل ہوئے' تعلیم یافتہ بھی' عوام بھی' غرباء بھی' امراء بھی' بڑے بڑے عہدہ دار بھی' زمیندار بھی' تاجر اور سوداگر بھی' اور مفلس و قلاش بھی' اس سے اس دائرہ کی وسعت کا اندازہ اب بھی کیا جا سکتا ہے - مدارس پر غور کیجئے' دارالعلوم دیوبند بھی' مظاہر العلوم سہارنپور بھی' دارالعلوم ندوہ بھی' یہاں تک کہ پہلا علی گڑھ کالج اور موجودہ مسلم یونیورسٹی بھی' اور وہ سینکڑوں مدارس جو ہندوستان میں جگہ جگہ پھیلے ہیں - جغرافی حیثیت سے غور کیجئے تو سرحد سے لیکر بنگال' مدراس اور گجرات' بلکہ حجاز افریقہ اور ان تمام ملکوں تک جہاں جہاں ہندوستانی مسلمان پھیلے ہیں - ان کے اثرات بھی ساتھ پھیلے ہیں - راقم کو ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا' مگر جہاں گیا یہ معلوم ہوا کہ وہ روشنی وہاں پہلے سے پہنچی ہوئی ہے ' اور کوئی نہ کوئی اس روشنی سے بحمد اللہ ضرور منور ہے -

اس تعلیم و تربیت' تصنیف و تالیف' وعظ و تبلیغ کی بدولت عقائد حقہ کی تبلیغ ہوئی' مسائل صحیحہ کی اشاعت ہوئی' دینی تعلیم کا بندوبست ہوا' رسوم و بدعات کا قلع قمع ہوا' سنن نبویؐ کا احیاء ہوا' غافل چونکے' سوتے جاگے' بھولوں کو یاد آئی' بے تعلقوں کو اللہ تعالٰی سے تعلق پیدا ہوا' رسولؐ کی محبت سے سینے گرمائے' اور اللہ کی یاد سے دل روشن ہوئے - اور وہ فن جو جوہر سے خالی ہو چکا تھا' پھر سے شبلی رحمتہ اللہ علیہ' جنید رحمتہ اللہ علیہ اور بسطامی رحمتہ اللہ علیہ و جیلانی رحمتہ اللہ علیہ' اور سہروردی رحمتہ اللہ علیہ و سرہندی رحمتہ اللہ علیہ بزرگوں کے خزانوں سے معمور ہو گیا -

اور یہ وہ شان تجدید تھی' جو اس صدی میں مجدد وقت کے لئے اللہ تعالٰی نے مخصوص فرمائی - -

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

سلسلہ تجدید دین نمبر2

تجدید تصوف و سلوک

--- جس میں ---

تصوف کو نئی پرانی علمی و عملی تمام غلطیوں اور غلط فہمیوں سے پاک و صاف کر کے اس حقیقت کو آئینہ کر دیا گیا ہے کہ تصوف نام ہے عین اسلام بلکہ کمال اسلام کا' اور بے صوفی بنے اسلام کی دینی و دنیوی ' انفرادی و اجتماعی' قومی و سیاسی برکات و ثمرات سے کما حقہا ہمکنار ہونا عملاً ناممکن ہے -

---- از ----

احقر العباد "عبدالباری" (سابق استاد فلسفہ و دینیات عثمانیہ یونیورسٹی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصوف کی حقیقت

بظاہر کتنی عجیب بات ہے کہ تصوف ایک طرف تو کمال دین یا درجہ احسان ہے جو اسلام و ایمان کا بلند ترین مقام ہے ' اور حضرات صوفیہ یا اولیاء اللہ کی نسبت تصور یہ ہے کہ ان کو حق تعالٰی کی بارگاہ میں قرب و اقربیت حضور و معیت کا جو مقام حاصل ہوتا ہے' وہ خالی علوم ظاہری کے حاملین بڑے بڑے فقہاء و محدثین کو بھی نہیں ہوتا ۔ ان کو اپنی زندگی کے سارے اعمال و افعال' حرکات و سکنات میں ایک ایسی نسبت میسر ہوتی ہے کہ گویا وہ ہمہ وقت اللہ تعالٰی کے مشاہدہ و حضوری میں ہیں اور کسی نہ کسی نوع کے مکالمہ و مناجات سے بھی مشرف ہیں' اس طرح صوفیہ سے بلند درجہ صرف انبیاء علیہم السلام کا ہے ۔ یہ اولیاء اللہ یا بزرگان دین کے بارے میں عوام ہی کا عقیدہ نہیں' بلکہ خواص و محققین کے ہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں مسلم ہے ۔

لیکن دوسری طرف تصوف کے متعلق اور تصوف کی راہ سے جتنی غلطیاں' غلط فہمیاں' بلکہ طرح طرح کی گمراہیاں امت میں پھیلی ہیں' فرق اسلامیہ اور علوم اسلامیہ میں شاید ہی کسی فرقہ یا کسی علم و فن کی راہ سے یا اس کے متعلق پھیلی ہوں ۔ بدعات و خرافات' اباحت و الحاد' کفر و شرک تک کی کوئی شکل مشکل ہی سے بچی ہو گی' جس کو کوئی نہ کوئی داخل تصوف بلکہ عین تصوف نہ جانتا ہو ۔ اسی بنا پر بہت سے اکابر اسلام تصوف کے سرے سے منکر ہو گئے' یا اس کو سراپا ضلالت قرار دے دیا ۔

بات یہ ہے کہ کسی شے کے کمال کا تعلق ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے - ساتھ ہی جس شے میں جتنا زیادہ کیف و بطون ہوتا ہے اتنی ہی اس کی نسبت غلطیاں اور گمراہیاں زیادہ راہ پا جاتی ہیں - پھر ظاہر ہے کہ جس غلطی و گمراہی کو دین ہی نہیں کمال دین سمجھ لیا جائے، اس کی جڑ کتنی گہری ہوگی، اور اس کا استیصال کتنا دشوار ہو گا - یہی وجہ ہے کہ تصوف کی راہ سے شرک و الحاد تک کی جو گمراہیاں مسلمانوں میں جڑ پکڑ گئیں، ان کو چونکہ عین دین یقین کیا جانے لگا، اس لئے ان کا ازالہ آسان نہیں ہوتا۔

عوام اور بہت سے خواص سب کو کیسے کیسے مغالطے ہیں - کوئی کشف و کرامات اور تصرفات کو تصوف جانتا ہے، کوئی اشغال و مراقبات اور احوال و کیفیات کو تصوف یقین کرتا ہے، کوئی خاص خاص رسوم و عادات کو تصوف سمجھتا ہے، کسی کے نزدیک تصوف کا نام ہے ریاضیات و مجاہدات اور ترک تعلقات کا، کوئی فلسفی یا فلسفی مزاج تصوف سے مراد وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود کے نظریات لیتا ہے، اور کوئی اس کو اسرار و مغیبات کا مجموعہ قرار دیتا ہے، حتی کہ اہل مغرب نے اس کا نام ہی سریت (مسٹزم) رکھ دیا - خود مسلمانوں میں بھی بہتوں نے اس کو ایک سینہ بسینہ سربستہ راز ہی بنا رکھا ہے، اور سب گمراہیوں سے بڑی گمراہی میں مبتلا وہ ہیں، جنہوں نے تصوف اور طریقت و حقیقت و معرفت کو شریعت کا مقابل یا اس کی ضد گمان کر لیا ہے -

اس طرح کی تمام گوناگوں اغلاط کو ایک ایک کر کے دور فرمایا گیا ہے - لیکن یہ تجدید تصوف کا صرف سلبی پہلو ہے - اصل تجدیدی کارنامہ اس باب میں طریقت کے اس ایجابی پہلو کو واضح فرمانا ہے کہ وہ شریعت ہی کا دوسرا رخ بلکہ عین شریعت ہے - پھر اس رخ کو صرف نظری صورت سے پیش نہیں فرمایا گیا ہے، بلکہ عملی طور سے اس کی تعلیم و تربیت کا غایت تحقیق و اجتہاد کی شان سے

از سرنو احیاء فرمایا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح "انسان کامل" کے دو رخ ہیں، ظاہر و باطن یا قلب و قالب، اسی طرح "دین کامل" کے بھی دو رخ ہیں، شریعت و طریقت، اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا، اس طرح طریقت یا تصوف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ تصوف نام ہے باطن کی فقہ کا۔ جس طرح نماز و روزہ وغیرہ کے ارکان و اعمال کی ایک ظاہری صورت ہے، جس کے احکام فقہ میں بیان ہوتے ہیں، اسی طرح خشوع و خضوع، حضور قلب یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر (اقم الصلوۃ لذکری) قلب و باطن کے اعمال ہیں۔ جس طرح ترک اکل و شرب روزہ کا ظاہر ہے، اسی طرح اس کا باطن تقویٰ (لعلکم تتقون) ہے۔ پھر جس طرح مختلف اعمال شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں، اسی طرح ان سب کی صحت و سقم، قبول و عدم قبول کا مدار قلبی نیتوں (الاعمال بالنیات) اور درجات اخلاص پر ہے۔ سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد جن پر نجات اور ظاہر و جوارح کے سارے اعمال کی صحت و قبولیت کا مدار ہے، اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے نہ روزہ روزہ، وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں۔

سارے عقائد و ایمانیات کی جڑ، توحید الہ یا "لا الہ الا اللہ" ہے، یعنی الوہیت و معبودیت یا نفع و ضرر یعنی فعل و اثر کی ساری مخلوقات یا غیر اللہ اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا اثبات، ظاہر ہے کہ اللہ و معبود وہی ہوتا یا بنایا جاتا ہے، پوجا اور پرستش اس کی ہوتی اور کی جاتی ہے، جس کے ہاتھ میں ہم اپنا نفع و ضرر (۱) دیکھتے اور یقین کرتے ہیں۔ غرض لا الہ الا اللہ پر ایمان و یقین کے معنی ہی

---

(۱) کما قال اللہ تعالیٰ اتعبدون من دون اللہ مالا ینفعکم شیئا ولا یضرکم اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ کیا اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو نہ ذرہ برابر تم کو نفع پہنچا سکیں نہ ذرہ برابر نقصان۔ تف ہے تو بر اور ان پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو ۱۲

یہ ہیں، کہ ہم کو موت و زندگی، بیماری و تندرستی، ناداری و تونگری، ذلت و عزت وغیرہ کی ظاہری راہوں اور اسباب سے جو جو کچھ بھی نفع و ضرر پہنچتا ہے، سب کا فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کو جاننا اور ماننا اور کسی فعل و اثر کا خالق غیر اللہ کو نہ سمجھنا ہمارا مسلمہ عقیدہ ہے - یہ جاننا اور ماننا قلب و باطن کے فعل کے سوا کیا ہے، لیکن علوم و احکام ظاہر کے عالم و عامل کتنے ہیں جو نفع و ضرر یا فعل و اثر کا دن رات غیر اللہ کی طرف سے یقین و مشاہدہ نہیں کرتے رہتے - کیا اس یقین و مشاہدہ کی تغلیط اور اس کو مضمحل و فنا کر کے ہر فعل و اثر میں اللہ تعالیٰ ہی کو بالذات فاعل و موثر مشاہدہ کرنے لگنا، جس کو حدیث میں عبادت و بندگی کے مقام احسان سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اور جس کو اصلاح صوفیہ میں توحید افعالی سے موسوم کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندگی کے تعلق کو اس طرح قائم کرنا کہ ساری زندگی اور اس کے سارے افعال و اعمال میں اس کے مشاہدہ و رویت و حضور و معیت کا علم و اذعان حاصل ہو، کیا یہ عین دین اور کمال دین کے سوا کچھ اور ہے؟ بلکہ کیا یہ قلبی و باطنی علم و اذعان یقین و ایمان سارے ظاہری عبادات و معاملات کی روح و جان نہیں، اور کیا اس روح و جان یا ایمان و عقیدہ کی صحت و حفاظت سارے اعمال و افعال جوارح سے بڑھ کر فرض و واجب نہیں؟

تصوف نام ہے فقہ باطن کا : غرض تصوف یا علم باطن کی حقیقت اجس کو خدا جانے لوگوں نے کیا کیا، دو راز کا رضال و مضل معنی پنہا رکھے ہیں، صرف یہ ہے کہ وہ ظاہر جسم یا جوارح کے اعمال و احکام اوامر نواہی اور ان کے صلاح و فساد کی فقہ کے بجائے نام ہے قلب و باطن کے امرو نواہی اور اس کی صلاح و فساد کی فقہ کا، جس کے احکام کتاب و سنت دونوں میں اسی طرح منصوص ہیں، جس طرح فقہ ظاہر کے، اور جس کی اہمیت و اقدسیت قرآن و حدیث ہی کے اشارات و تصریحات سے ثابت ہے "کما قال اللہ تعالی یوم لاینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ

بقلب سلیم" (۱) اور حدیث میں اسی کی شرح و تفسیر یوں فرمائی گئی کہ خوب سمجھ لو کہ بدن کے اندر ایک لوتھڑا ہے' اگر وہ سنورا اور بنا تو سارا بدن بن سنور جاتا ہے' اور اگر وہ بگڑا تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے' اور خوب سمجھ لو کہ وہ قلب (۲) ہے۔ یعنی ظاہر جسم کے اعمال و افعال کا بناو بگاڑ تمامتر اسی باطن قلب کے بناؤ بگاڑ پر موقوف ہے' اور تصوف یا فقہ باطن کا موضوع بحث اسی قلب کا بناؤ سنوار اسی کی سلامتی و صحت کی حفاظت' اور اسی کے بگاڑ یا فساد و بیماری کا علاج ہے۔

نام سے چڑ ہونا: تصوف و طریقت کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اس کا دین و شریعت کے منافی و مغائر ہونا تو الگ رہا' بغیر صوفی ہوئے مسلمان مسلمان ہی کب ہو سکتا ہے۔ باقی اگر کسی خشک دماغ کو صوفی و تصوف کے نام و اصطلاح یا اس کے علیحدہ و مستقل علم و فن ہونے سے بھڑک ہے' تو پھر اس کو تفسیر و مفسر' تجوید و مجود' حدیث و محدث' فقہ و فقیہ' کلام و متکلم' وغیرہ سب ہی جداگانہ دینی علوم و فنون' اور ان کے عرفی و اصطلاحی ناموں سے بھڑکنا چاہئے اور اگر یہ نام قرآن و حدیث کے الفاظ و اشارات سے ماخوذ ہیں' تو راقم الحروف کے نزدیک صوفی کی اصل بھی صوف پوش کے بجائے اصحاب صفہ کیوں نہ ہو۔ اس پر بھی اگر نام ہی سے چڑ ہے' تو علم تصوف کے بجائے اس کا نام علم احسان یا علم قرب رکھ لو' جیسا کہ خود بہت سے اکابر صوفیہ نے رکھا بھی ہے۔

تصوف کی حقیقت کی یہ تجدید یا اس کی از سرِنو تعلیم و تفہیم جیسی کچھ ضروری تھی' اس کے دیکھتے حضرت مجدد نے مستقل و غیر مستقل رسائل و تصنیفات مواعظ و ملفوظات میں بہ کثرت اور جا بجا اجمال و تفصیل کے ساتھ مختلف عنوانات و تعبیرات سے سمجھایا اور واضح فرمایا ہے۔ حقیقت تصوف کے نام سے

---

(۱) جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے مگر جو شخص اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آیا ۱۲

(۲) الاو ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الاوھی القلب ۱۲

ایک مستقل رسالہ کی تمہید میں ارشاد ہے:۔

"شریعت کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم ہے' وہ دو قسم کے ہیں' بعض کا تعلق ظاہر بدن یا ظاہری چیزوں سے ہے' جیسے کلمہ پڑھنا' نماز روزہ حج زکوۃ' ماں باپ کی خدمت' ان کو مامورات کہتے ہیں' اور کلمات کفر کہنا' شرک کے افعال کرنا' زنا چوری' سود خواری' رشوت وغیرہ' ان کو مناہی کہتے ہیں - بعض اعمال ایسے ہیں' جن کا تعلق باطن سے ہے جیسے ایمان و تصدیق' و عقائد حقہ' صبر و شکر' توکل رضا' بلقضا تفویض و اخلاص محبت خدا و رسول وغیرہ' ان کو مامورات وفضائل کہتے ہیں' اور عقائد باطلہ' بے صبری ' ناشکری ریا و تکبر' عجب وغیرہ یہ مناہی در ذائل ہیں' جن سے شریعت نے منع کیا ہے -

"جس طرح قرآن شریف میں اقیمو الصلٰوۃ واتوا الزکٰوۃ موجود ہے' اسی طرح یاایھا الذین امنوا اصبروا (ایماندار و صبر کرو) اور واشکروا للہ (اللہ کا شکر بجا لاؤ) بھی موجود ہے' اگر ایک مقام پر کتب علیکم الصیام اور للہ علی الناس حج البیت پاؤ گے تو دوسرے مقام میں یحبھم ویحبونہ اور والذین امنوا اشد حبا للہ بھی دیکھو گے' جہاں اذا قاموا الی الصلوۃ قامو اکسالی" ہے' اس کے ساتھ ہی یرائون الناس بھی موجود ہے' اگر ایک مقام میں تارک نماز و تارک زکوۃ کی مذمت ہے' تو دوسرے مقام میں تکبر و عجب کی بھی برائی موجود ہے' اسی طرح احادیث کو دیکھو جس طرح ان میں ابواب نماز و روزہ' بیع و شرا نکاح و طلاق پاؤ گے' ابواب ریا و سمعہ و کبر وغیرہ بھی دیکھو گے -

اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں اسی طرح اعمال باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں - کیا اقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ امر کا صیغہ ہے' اور اصبرو اواشکروا امر کا صیغہ نہیں کیا کتب علیکم الصیام سے روزہ کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے' اور والذین امنو اشد حبا للہ سے محبت کا مامور ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ

ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود و موجب نجات اور اس کی کدورت موجب ہلاکت ہے -

قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا-

بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا' اور جس نے اس کو میلا کیا ناکام رہا -

یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم -

جس دن مال و اولاد کام نہ آئیں گے مگر جو شخص اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آیا -

دیکھو پہلی آیت میں تزکیہ باطن کو موجب فلاح' اور دوسری میں سلامتی قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا گیا -

"ایمان و عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے' قلب ہی کا فعل ہے اور ظاہر ہے کہ جتنے اعمال ہیں سب ایمان ہی کی تکمیل کے لئے ہیں - پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے' دل بمنزلہ بادشاہ کے ہے اور اعضاء اس کے لشکر یا غلام ہیں' اگر بادشاہ درست ہو جائے تو توابع خود بخود اس کی مطابقت کرنے لگیں **الاوان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت' فسد الجسد کلہ الا وھی القلب** کے معنی یہی ہیں کہ بدن کے اندر جو قلب ہے' اگر یہ بنا تو سب بنا' یہ بگڑا تو سب بگڑا - اور یہ امور رات دن آنکھوں کے سامنے ہیں' کہ جس چیز کا دھیان دل میں سما جاتا ہے' سارے اعضاء اس کی دھن میں لگ جاتے ہیں' آنکھ اس کو دیکھنے' کان اس کو سننے' ہاتھ اس کو پکڑنے' اور پاؤں اس کی جانب چلنے کو چاہتا ہے' خواہ وہ شے بری ہو یا بھلی' مگر دل کا خیال ان اعضاء کو اس کے کرنے پر مجبور کر دیتا ہے دنیا داروں کو دیکھو کہ کس طرح دنیا کے کاموں میں سر سے پاؤں تک مشغول رہتے ہیں' کہ ان کے کان میں اذان کی آواز تک نہیں آتی' ایسا ہی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی یاد اور دھن

میں ہیں' ہر طرف سے ان کو اللہ ہی کا خیال آتا ہے۔

بس کہ درجان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدامی شود از دو رپندارم توئی

ایک بڑا مغالطہ: بڑے بڑے لوگوں کو یہ ہے کہ قلب و باطن کی جس صفائی و تزکیہ پر تصوف میں اس قدر زور ہے کہ گویا سارا تصوف یہی ہے' وہ چونکہ غیر مسلم اشراقیہ اور خصوصاً خود ہمارے ہندوستان کے جوگیوں میں بکثرت اور بڑے بڑے خوارق کے ساتھ پایا جاتا ہے' اس لئے ان کو بھی بہتوں نے صوفی ہی سمجھ رکھا ہے اور "الصو فی لا منھب لہ" کا مشرب و مقام کسی خاص شریعت و مذہب سے اتنا وسیع اور بلند قرار دے دیا جاتا ہے کہ کفر و اسلام کی قید سے بھی آزاد ہو جاتا ہے' اس لئے متنبہ فرمایا کہ

"تزکیہ و صفائی باطن اور تصوف کا اطلاق اس صفائی پر کیا جاتا ہے' جو شریعت کے احکام کی پابندی سے حاصل ہو' کیونکہ تزکیہ سے مراد وہ تزکیہ ہے' جو موجب فلاح ہے' قد افلح من زکھا' اور ظاہر ہے کہ فلاح منحصر ہے اتباع شریعت پر' پس ہندو جوگی وغیرہ جو ریاضت کرتے ہیں' وہ سرے سے صفائی ہی نہیں' یا لغوی معنی کے اعتبار سے اس کو صفائی کہو تو ساتھ ہی غیر مقبول کہنا ہو گا' اس صورت میں صفائی کی دو قسمیں ہوں گی' ایک مقبول دوسری مردود" (۱)۔

اس کی مثال کیسی عجیب دی ہے کہ

"آئینہ پر اگر گرد و غبار بیٹھا ہو تو ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو پانی سے دھو کر صاف کر دیا جائے دوسرا یہ کہ پیشاب سے دھو کر گرد و غبار دور کیا جائے' لیکن ظاہر ہے کہ بادشاہی دربار میں جس طرح پہلے آئینہ کو پیش کرنے سے انعام و خوشنودی کا استحقاق ہو گا' دوسرے کے پیش کرنے سے عتاب و خفگی ہو گی۔

---

(۱) خاکسار نے حضرت ے ی م کے ملفوظات کی تعبیر اس شعر میں کی ہے ۔

میں ہزار ' تجلی گر کہاں

ک ہے ضرور گر طور کی نہیں " س "

"اسی طرح خلاف شریعت سے عقبیٰ میں کچھ فائدہ نصیب نہیں ہو سکتا اور اصطلاح و عرف میں تصوف اس علم کا نام ہے' جس پر عمل کرنے سے باطن کی وہ صفائی نصیب ہوتی ہے' جس سے انسان مقبول بارگاہ اور صاحب مدارج و مقام ہوتا ہے"۔

عشق و محبت جو تصوف کی جان ہے اور جس سے تصوف کا سارا دفتر بھرا پڑا ہے' اور جو قلب و باطن ہی کی ایک اعلیٰ صفت و کمال ہے' اس کی راہ بھی خود نص کتاب کی رو سے تمام تر اتباع سنت و شریعت ہے۔

"محبت خدا اور رسول جو منجملہ صفات حمیدہ قلبیہ اور اعلیٰ درجہ کی چیز ہے' اس کا تعلق بھی اتباع شریعت ہی سے ہے' بدون اتباع شریعت محبت کہاں' قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ' دیکھو اس آیت میں اتباع رسول ہی کو ذریعہ محبت بتایا گیا ہے"۔

الصوفی لامذھب لہ کا مقام بعض جاہل اور نام کے صوفیہ کے ہاں نام نہاد تزکیہ قلب کے بعد اتنا اونچا ہو جاتا ہے' کہ نماز روزہ تک نیچے پڑ جاتا ہے' بلکہ سرے سے سارے احکام شریعت ہی مرتفع ہو جاتے ہیں - حالانکہ اسلام اور تصوف اسلام میں وہی صفات قلب معتبر و مقبول ہیں' جو نماز روزہ وغیرہ کے مشروع و مامور عبادات و احکام سے نصیب ہوتے ہیں' مثلاً

"قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوتھم خاشعون - میں خشوع جو صفت قلب ہے اس کو اسی صورت میں وسیلہ نجات و فلاح فرمایا گیا ہے' جو نماز کے اندر پایا جائے' پس اگر سرے سے نماز ہی نہ پڑھی جائے تو یہ نماز والا خشوع کس طرح میسر ہو سکتا ہے' اور فلاح کا اثر کس طرح مرتب ہو سکتا ہے' ایسے ہی زکوۃ و صدقہ حج و روزہ وغیرہ اعمال صالحہ سے جو اثر قلب پر پڑتا ہے' اور اس سے جو صفائی میسر ہوتی ہے' وہی مفید آخرت ہے -

"خلاصہ یہ کہ جب تک انسان احکام شرع کی پابندی اور جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ کرے گا' جنت و رضائے مولیٰ کہ مقصود اصلی ہے' میسر نہیں آ سکتا' تو بلا پابندی شرع کے تصوف کہاں ! جس طرح کرامت کی تعریف میں خرق عادت کے ساتھ یہ قید ہے کہ عبد صالح متبع شریعت سے صادر ہو' اسی طرح تصوف میں صفائی و تزکیہ باطن کے ساتھ یہ قید ہے کہ اتباع شریعت سے حاصل ہو' صحابہ رضی اللہ عنہم باتفاق امت سارے اولیاء سے افضل ہیں' مگر ان کا طریقہ بھی پابندی شریعت' نماز روزہ حج زکوۃ' جہاد و تلاوت' امر بالمعروف نہی عن المنکر وغیرہ تھا' اسی سے ان کے قلوب ایسے مجلی و محلی تھے کہ ان کے لئے خطاب رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کیا گیا .... بہرکیف تصوف نام ہے صفائی باطن مع پابندی شرع کا"

"فلسفہ کے ایک ولایتی ڈاکٹر اور پروفیسر ہمارے دوست جو بڑے "تصوف دوست" بھی ہیں' مگر ساتھ ہی تصوف کا وہی تصور رکھتے ہیں جو شریعت کا متبع و پابند بنانے کے بجائے سرے سے ہر مذہب کی قید و بند سے آزاد کر دیتا ہے' ان کو ایک دفعہ راقم نے حضرت کے ملفوظات پڑھنے کو دیئے ۔ہیں بڑے ذہین کہنے لگے "بھائی ملائیت و صوفیت کو خوب ہی ملایا ہے " ۔ اصطلاح میں کیا جھگڑا اپنی اپنی جگہ تصوف و صوفی کو جس معنی و مراد کے لئے جو چاہے' اصطلاح بنا لے' البتہ اس کو تصوف اسلام کہنا اور سمجھنا بڑی جسارت و جہالت ہے' تصوف اسلام تو بہرحال تمام اکابر و محققین صوفیائے کرام کے نزدیک وہی ہے جو شریعت کے ساتھ جمع ہی نہیں' بلکہ عین شریعت ہے ۔

تصوف کا عرف و اصطلاح : اب رہ گیا اس زمانہ کا عرف' اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں علم تفسیر' علم حدیث علم فقہ و اصول فقہ وغیرہ جدا جدا متمیز نہ تھے' پچھلے علمائے دین کی تائید و تبلیغ کے لئے ایک ایک علم الگ کر کے اس کے قواعد مقرر کئے اسی طرح علم تصوف کو بھی مشائخ کرام نے قرآن و حدیث سے نکال کر باطن کی صفائی کے بعض اذکار

و اشغال و مراقبات خاص طریقہ سے بتائے ہیں' کہ ان پر عمل کر کے انسان کو تزکیہ باطن جلد نصیب ہو جاتا ہے۔

"جس طرح پچھلے زمانہ میں قرآن و حدیث سے استنباط کر کے بہت سے علوم نکالے گئے اور ہر ایک کا نام جداگانہ تجویز ہوا' اور ان کے واضعین کو سب نے مانا حتیٰ کہ امام شافعی ایسے لوگوں کو امام ابوحنیفہ اور انکی فقہ فی الدین کو دیکھ کر الناس فی الفقہ عیال ابی حنیفہ کہنا پڑا' امام بخاری حدیث میں ایسے امام مانے گئے کہ آج تک ان کی محدثیت کا ڈنکا پٹ رہا ہے' اسی طرح تزکیہ باطن کے بتلانے والے ایسے بزرگان دین گزرے ہیں' کہ ان کو سب نے پیشوا مانا ہے' جیسے پیران پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور خواجہ بہاؤالدین و خواجہ معین الدین چشتی و شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ تعالیٰ اور ان کے قبل جنید بغدادی حضرت شبلی وغیرہ اور جس طرح اور علوم میں پچھلوں کو اگلوں کی تقلید و پیروی سے چارہ نہیں علم تصوف میں بھی بدون اتباع طریقہ بزرگان چارہ نہیں' گو ادنی درجہ کا تزکیہ جو موجب نجات ہے' بدون اتباع مشائخ طریق بھی میسر ہو سکتا ہے' مگر وہ امر کہ مطلوب ہے اور کمال کہلاتا ہے' اس کا حصول بدون صحبت کاملین متبعین مشائخ کے ممکن نہیں۔

اور جس طرح دیگر علوم مستخرجہ و مستنبطہ کا خاص نام ہوگیا جیسے علم فقہ و علم حدیث، اسی طرح مشائخ کے اس خاص مستخرجہ طریقہ کا نام تصوف ہوگیا اگر کوئی شرح وقایہ و ہدایہ پڑھتا ہو تو یوں کہا جاتا ہے کہ فقہ پڑھتا ہے اور اگر تفسیر یا حدیث پڑھتا ہو تو یوں نہیں کہتے کہ فقہ پڑھتا ہے حالانکہ فقہ بالمعنی الاعم یعنی معرفۃ النفس مالہا و ماعلیہا میں بہت سے علوم حدیث و تفسیر حتیٰ کہ علم کلام وغیرہ بھی داخل ہیں' اسی طرح جب کوئی مشائخ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر چلتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تصوف سیکھتا ہے' یا صوفی ہے' اور نماز روزہ کرنے والے کو صوفی نہیں کہتے' حالانکہ تصوف تزکیہ باطن بالمعنی الاعم سب کو شامل ہے۔

"اور یہاں اصطلاحی تصوف کی حقیقت بیان کرنا منظور ہے' جو نام ہے باطن کو رذائل سے خالی کرنے اور فضائل سے آراستہ کرنے کا ' جس میں توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے' عام اس سے کہ وہ کسی عمل شرعی سے ہو"۔

ماحصل یہ کہ پورا دین نام ہے فلاح آخرت اور رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کا اور جیسا کہ الظاہر و الباطن کی مخلوق و مظہر ساری کائنات کا ہر ہر ذرہ ظاہر و باطن دونوں کا مظہر ہے' اور انسان اسی کا مظہراتم اسی طرح اس کو اپنے کمال مقصد تک پہنچنے کے لئے جو صراط مستقیم دکھلائی گئی ہے' اس کے بھی دو رخ ہیں' ظاہر اور باطن یا قلب و قالب۔ ظاہری علوم دین کا تعلق ظاہری اعمال و احکام یا ظاہر کی درستی و آراستگی سے ہے' اور علم باطن یا تصوف کا تعلق باطن کی درستی و آراستگی سے ہے' اور جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا کمال و حقیقت کا تعلق کم کے مقابلہ میں کیف یا ظاہر کے مقابلہ میں باطن سے زیادہ ہوتا ہے' اس لئے دین میں بھی کمال رسی اور حقیقت یابی بلا تصوف یا صوفی بنے بغیر ممکن نہیں' خواہ اس دعویٰ سے اہل قشر کتنا ہی ناخوش ہوں لیکن مغز مغز ہی ہے' البتہ بے مغز مدعیان تصوف بھی آگاہ رہیں کہ مغز قشر کے اندر ہی ملتا ہے' اور قشر یا ظاہر ہی مغز یا باطن کا محافظ ہوتا ہے۔

تجدید تصوف کا اصل کارنامہ : حضرت جامع المجددین رحمہ اللہ کی تصوف میں تجدید و اصلاح کا اصل کارنامہ ظاہر و باطن یا شریعت و طریقت کی علمی و تعلیمی جامعیت ہے' یا وہی "ملائیت و صوفیت" کو ملا کر شیر و شکر کر دینا' اور جس طرح تجدید کے ہر باب میں حضرت نے محض علم و اصول کی رہنمائی پر قناعت نہیں فرمائی بلکہ اپنی حد و استطاعت تک اس کو عمل میں لا کر دکھا دیا' اسی طرح شریعت و طریقت کی تعلیم و تدریس تالیف و تصنیف کے صدیوں سے الگ الگ علماء و مشائخ نے جو دو کیمپ قائم فرما دیئے تھے' انکو خود اپنی ساری عملی زندگی اور ساری تقریری و تحریری خدمات میں ازسر نو جسم و جان کی طرح ایسا ہم وجود بنا دیا' کہ

دونوں میں امتیاز و جدائی داستان ماضی بن کر رہ گئی' مواعظ و ملفوظات تالیفات و تصنیفات سب میں دونوں رنگ سمو کر بالکل یک جان و ہم رنگ ہو گئے ہیں - بہشتی زیور سے لیکر حیات المسلمین اور سب سے آخری تالیفی مجموعہ بوا درالنوادر سب اسی مجمع البحرین کا نظارہ پیش کرتے ہیں -

بہشتی زیور جو راقم الحروف کے نزدیک حضرت کی تجدید کا باعتبار تعمیم بنیادی پتھر ہے' اس میں صوم و صلوۃ' نکاح و طلاق' بیع و شرا کے فقہی یا ظاہری احکام کے پہلو بہ پہلو باطنی اخلاق' قلب کی صفائی' باطن کی درستی بلکہ پیری و مریدی تک کے مضامین کا پورا ایک حصہ (ساتواں) اس تمہید کے ساتھ شریک ہے کہ "اس حصے میں زیادہ مضامین اصلاح قلب کے متعلق ہیں جس کو تصوف اور درویشی کہتے ہیں' اور یہ سب شرع کے اور حکموں کی طرح ضروری ہیں' جن سے بے پروائی نہ برتنا چاہئے" -

دوسری کتاب حضرت کے اس تجدیدی سلسلہ کی تعلیم الدین ہے - اس میں تو عقائد عبادات' معاملات و معاشرات کی دینی تعلیمات کے ساتھ نصف سے زائد حصہ میں سلوک و ولایت' مجاہدہ و ریاضت' بیعت' اذکار و اشغال حقائق و معارف اور تصوف کے سارے فرعی مسائل و اصطلاحات وغیرہ پورے تصوف کا نچوڑ موجود ہے - ظاہر و باطن شریعت و طریقت کے جمع و جامعیت کے اس تجدیدی اہتمام کی انتہا یہ ہے' کہ جمعہ کے لئے سال بھر کے خطبات کا ایک مجموعہ مرتب فرمایا گیا' اس میں اصلاح باطن فقر و زہد "مراقبہ و محاسبہ" "شوق و انس" وغیرہ صوفیانہ مضامین پر مستقل خطبات موجود ہیں -

تجدید تعلیم (۱) و تبلیغ کے حصہ میں دینی و عربی مدارس کی تعلیم و تدریس کے

---

(۱) یہ حصہ حضرت علیہ الرحمتہ کی تعلیمی و تبلیغی تجدیدات پر مستقل کتاب کی صورت میں انشاء اللہ الگ شائع ہوگا - معارف و الفرقان میں بصورت مضامین شائع بھی ہو چکا ہے ۱۲

سلسلہ میں جن اصلاحات و تجدیدات کا ذکر آیا ہے ان میں بھی مدارس کو اس اصلاح کی طرف بتاکید متوجہ فرمایا گیا ہے کہ نصاب و رسیات میں باقاعدہ اخلاق و تصوف کی تدریس کو بھی شریک کیا جائے۔ خود تلخیصات عشر کے نام سے سہ سالہ مختصر نصاب جو مرتب فرمایا ہے، اس میں دیگر علوم درسیہ کے ساتھ اخلاق و تصوف کے مضامین کا ملخص بھی جزء لاینفک ہے۔ تفسیر بیان القرآن پر صوفیانہ تفسیری اعتبارات کا پورا حاشیہ چڑھایا گیا ہے۔

باقی مواعظ و ملفوظات میں تو متن و حاشیہ تصنیفی ابواب و فصول کا فصل و امتیاز بھی ظاہر و باطن شریعت و طریقت کے علوم و تعلیمات میں حاجب نہیں۔ کوئی عام و خاص خلوت و جلوت کی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی، جس میں شریعت و طریقت ظاہر و باطن کے اس سنگم کے دونوں پانی ایک ساتھ نہ بہتے ہوں۔ یہی حال مواعظ کا ہے، کہ ہر وعظ بوقت واحد شریعت کے مسائل اور حقیقت کے معارف کا گنجینہ ہے۔ عجیب لطف توافق کی بات ہے، کہ جس طرح حضرت کی خانقاہ مسجد و مدرسہ سب ہم صحن اور ایک ہی گھر کے دیوار دور معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح حضرت کی تجدید و اصلاح نے خانقاہ کے باطنی معارف و حقائق اور مسجد و مدرسہ کے ظاہری احکام و مسائل کو ایک ہی گھر کے در و دیوار بنا کر ان کی دوئی کو بالکل دور فرما دیا تھا۔ ایک وعظ میں تصوف کی مشہور حدیث احسان عبادت یعنی عبادت و بندگی کو سنوارنے یا اچھا کرنے کے سلسلہ میں اس دوئی کا حجاب اس طرح دور فرماتے ہیں، کہ

> "اس حدیث میں عبادت کو اچھا کرنے کی حقیقت بتائی ہے، اور ظاہر ہے کسی چیز کے اچھا ہونے کے کیا معنی ہوا کرتے ہیں کہ اس میں کوئی نقصان و کسر نہ رہے جیسی چاہئے ویسی ہو، مثلاً اچھی روٹی وہ ہو گی، جس کا مادہ بھی اچھا ہو صورت بھی اچھی ہو ثمرہ بھی اچھا ہو؛ اسی طرح عبادت کے اچھا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں کسی چیز کی کسر نہ رہے، لوگ عموماً غلطی کرتے ہیں، اور صرف

صورت و نقل عبادت ہی کو عبادت سمجھتے ہیں' مثلاً نماز میں قیام رکوع سجدہ قعدہ قومہ وغیرہ جو فقہا نے ضبط کر دیا ہے - اس میں شک نہیں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے ٹھیک ہے' اور جو فقہ کا موضوع تھا' اس کے موافق رکھا ہے' لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ عبادت سے متعلق تمام امور اسی میں منحصر ہیں -

شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ یعنی شرع کے معنی کا بھی اعتبار ہے' اسی معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں' تصوف کو علیحدہ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جائے' یہ علیحدگی ایسی ہی ہے' جیسے مشہور فقہ میں کتاب الزکوۃ اور کتاب الصلوۃ الگ الگ ہیں' اسی طرح کتاب التصوف بھی فقہ ہے' اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوۃ کتاب الزکوۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جائیں گی؟ اسی طرح توحید و اخلاص یا کبر و تواضع عجب وغیرہ اخلاق حمیدہ و رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں- (۱)

اور صوری فقہ کو جانے دیجئے کیا خود قرآن و حدیث میں صوری فقہ کے احکام کے ساتھ ساتھ اور اس سے بھی بڑھ کر تاکید معنوی فقہ کے اوامر و نواہی کی قدم قدم پر نہیں ملتی' لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ "علم برائے علم" خود اتنا مقصود بن گیا ہے کہ علمائے دین و مدارس دین میں بھی سارا زور معلومات اور کتابوں ہی پر ہے - امتحان ہے تو ان کا انعام ہے' تو ان پر سند ہے' تو ان کی تحقیقات ہے تو ان کی اور اب تو ماشاء اللہ ریسرچ اور ڈاکٹری کا میدان بھی علوم دین اور علمائے دین کے لئے کھل کر دنیا طلبی کا دروازہ اور وسیع ہو گیا! اس کے بعد عمل کا کیا ذکر' پھر جب صورت ہی کی پرواہ نہیں تو معنی کی کیا ہو - ارشاد ہے کہ

لوگوں کو علم کی تو فکر ہے لیکن عمل کی نہیں' بڑا اہتمام اسکا ہوتا ہے کہ

---

(۱) مواعظ اشرفیہ ص ۸ ملخصاً ۱۲

ساری کتابیں پوری کر لیں، ہدایہ بھی قدوری بھی، شمس بازغہ بھی، لیکن عمل کی ذرا پرواہ نہیں، حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا کوئی ایسا کمال نہیں، شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے، بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے، "تفسیر میں وہ ماہر، حدیث سے وہ واقف، فقہ میں وہ کامل، اور اگر یہ سب علماء سے زیادہ نہ جانتا ہو تو ان کو بہکا کیسے سکتا ہے، شیطان میں اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی اپنے علم پر عمل نہیں کرتا - حدیث شریف میں ہے کہ ایسا علم جو عمل کے لئے نہ ہو، جہنم کا ذریعہ ہے - (۱)

غرض ایک تو عمل ہی سرے سے مفقود ہے، اور جو کچھ ہے بھی وہ صورت بے معنی یا جسد بے روح، یعنی عمل کو بجائے اچھی طرح اور سنوار کر کرنے کے بیگار کی طرح بگاڑ کر کیا جاتا ہے -

"مثلاً بظاہر اٹھ بیٹھ لئے، اور نماز ادا ہو گئی، خصوصًا اہل علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے، کہ سوائے ظاہری قیام اور قعود کے اور بھی کچھ ہے، اور وہ ضروری بھی ہے، حالانکہ قرآن میں جہاں قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلوتہم ، کے ساتھ ہی خاشعون بھی لگا ہے، جب صلوتھم سے نماز کو مطلوب شرعی سمجھتے ہیں، تو کیا وجہ ہے، کہ خاشعون " سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے، حالانکہ دونوں حکم ضروری ہیں اور یہ خشوع ہی ہے، جس سے عبادت اچھی ہوتی ہے اس سے احسان حاصل ہوتا ہے، احسان کے متعلق تین چیزیں ہیں، اول اس کا ضروری ہونا، دوسرے اس کی حقیقت، تیسرے اس کے حاصل کرنے کا طریقہ ۔

اوپر اجمالاً معلوم ہو چکا کہ احسان حاصل تو خشوع سے ہوتا ہے اور خشوع کا مطلوب ہونا قد افلح المومنون الخ سے معلوم ہو چکا اب اس

---

(۱) مواعظ اشرفیہ ص ۸ ملخصاً ۱۲

کا ضروری ہونا سنیئے ارشاد ہے ۔ الم یان للذین امنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ فما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم (۱) یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے، اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آ گئیں، دیکھو اس خشوع کے نہ ہونے پر کیسی وعید ہے، یہود و نصارےٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے، کہ ایسے نہ بنو، جس سے ظاہر ہے کہ ترک خشوع کیسی بری چیز ہے، جس کے باعث آدمی کافروں سے مشابہ ہو جاتا ہے، اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا ہے، کہ فقست قلوبھم یہ قساوت قلبی ایسی بری چیز ہے، کہ قرآن شریف میں ہے کہ فویل للقاسیۃ قلوبھم من ذکر اللہ اولئک فی ضلال مبین ۔ یعنی تباہی و ہلاکت ہے ان لوگوں کے لئے، جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں، وہ لوگ کھلی کھلی گمراہی میں ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، کہ قلب قاسی خدا سے بہت دور ہے" (۲) ۔

طرح طرح سے اس تفہیم و تفصیل کا مدعا فقط یہ ہے کہ جس طرح فقہائے ظاہر نے قرآن و حدیث ہی کے ظاہر و قالب کے شرعی احکام و اعمال ضبط و مرتب فرمائے ہیں، اسی طرح فقہائے باطن یا صوفیا نے قلب و باطن کے احکام و اعمال مدون فرما دیئے ہیں، دونوں شریعت ہی کے دو رخ اور عین شریعت ہیں، اس لئے تصوف یا فقہ معنوی سے نابلد رہنا یا بھڑکنا، جہل و محرومی ہی نہیں، بلکہ اس کے

---

(۱) کیا ایمان والوں کے لئے وقت نہیں آیا ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد اور جو حق نازل ہوا ہے، اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو پہلے کتاب ملی تھی پھر جن پر دراز زمانہ گزر گیا پس ان کے دل سخت ہو گئے اور بہت سے ان میں نافرمان ہو گئے ۱۲

(۲) مواعظ اشرفیہ ملخصا ۱۲

بغیر دین کی حقیقت و معنویت یا دین کا کمال و احسان نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔

"لہٰذا جس طرح کنز و ہدایہ ضروری ہے' ویسے ہی ابوطالب مکی کی قوت القلوب اور امام غزالی کی اربعین اور شیخ شہاب الدین سہروردی کی عوارف کا پڑھنا بھی ضروری ہے' (لیکن صرف پڑھ لینا کافی نہیں یہ تو گویا طب کا صرف پڑھ لینا ہے' اور اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

کیسی ناانصافی ہے کہ جب دس برس علم ظاہر کی تحصیل میں صرف کئے' تو کم سے کم دس ماہ تو باطن کی اصلاح میں صرف کرو اور اس کا یہی طریق ہے کہ کسی کامل کی صحبت میں رہو' اس کے اخلاق و عادات وعبادات کو دیکھو کہ غصہ کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے' شہوت کے وقت کی حالت میں کیسا رہتا ہے' خوشامد کا اس پر کہاں تک اثر پڑتا ہے' اسی طرح تمام اخلاق کا حال ہے' کیونکہ پھر جب کبھی اس کو غصہ آئے گا تو سوچے گا کہ اس کامل کی غصہ کے وقت کیا حالت تھی' اسی طرح اس کے دیگر اخلاق و عادات پیش نظر رہیں گے"۔

احقر اکثر مثالاً عرض کیا کرتا ہے کہ اس کے والد طبیب تھے' گھر میں عربی فارسی اردو کی طب کی کتابوں سے الماری کی الماری بھری ہیں اور تینوں زبانوں میں ان کو پڑھ اور بڑی حد تک سمجھ بھی سکتا ہوں یہی نہیں بلکہ کسی استاد سے سبقاً سبقاً پڑھ اور سمجھ بھی لوں' لیکن باقاعدہ کسی ماہر طبیب کے مطب میں اس کی عملی مشق و تجربہ حاصل نہ کروں اور مطب کھول کر بیٹھ جاؤں تو لوگوں کے لئے ہلاکت کا دروازہ کھول دینے کے سوا کیا ہو گا۔

یہی حال آج کل کے اکثر مسلمان قومی و سیاسی اطباء یا قائدین کا ہے' کہ بہتوں نے تو سرے سے دین کا کوئی معتدبہ علم ہی نہیں حاصل کیا' اور جنھوں نے کچھ کیا ہے' ان میں سے مطب شاذ ہی کسی نے کسی طبیب حاذق کی صحبت میں کیا ہو گا۔ اس کی بدولت کتابی علم دین کے اچھے اچھے واقفین و ماہرین نے ہلاکت

فروشی کی دوکان لگا رکھی ہے' جہاں دین کے نام سے بھی عین دنیا کی دانستہ یا نادانستہ سوداگری ہو رہی ہے۔ اگر نرا کتابی علم دین ہی اصلاح اور کمال دین کے لئے کافی ہوتا' تو حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے مابعد کے قرون اور سارے طبقات امت کے مقابلہ میں ناقص و غیر صالح ہوتے' فشتان بینہما! ان کا فضل و کمال مابعد کے بڑے بڑے فقہاء و محدثین' اولیاء و اقطاب کے مقابلہ میں اسی لئے تو مسلم ہے' کہ ان کو سب سے بڑے مرد کامل کے سامنے پامال ہونے کی سعادت یا صحبت نصیب تھی' جو خود لفظ صحابہ و صحابیات کے عرف و اصطلاح کی عظمت سے ظاہر ہے۔ پھر ہمارے یہ قائدین و مصلحین رنگ رنگ کے جھنڈے لے کر اور طرح طرح کی جماعتیں اور مجالس آگے پیچھے اسلام اور اسلامی کا لفظ لگا کر مسلمانوں کو اپنے حال کی جس اصلاح و انقلاب کی دعوت دے رہے ہیں' خوب یاد رکھیں کہ وہ اس راہ سے پہلے کی طرح آئندہ بھی صدا بصحرا یا جسد بے روح ہی رہے گی' جب تک انقلاب قلب یعنی تصوف کی راہ نہ اختیار کی جائے۔ قرآن مجید کی جو آیت ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیر و اما بانفسہم ہر قائد و ہر مصلح کی مسلمانوں کی تغییر حال کے لئے زبان پر رہتی ہے' اس کا مطلب بھی صوفی بنانا ہے' یعنی اگر تم دنیاوی و سیاسی یا ظاہری ترقی بھی چاہتے ہو تو وہ بھی قانون قدرت یا سنت اللہ کی رو سے بلا باطنی یا نفسی اصلاح و تغیر کے ناممکن ہے' یہ "ما بانفس" کا تغیر باطن یا قلب کے تغیر و انقلاب کے سوا کیا ہے۔

مادہ پرست دنیا دار بھی کسی نہ کسی عنوان سے اسی اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ جنگ سے آراستہ جرار لشکر کا اگر اخلاقی باطن (موریل) بگڑ جائے' تو ظاہری ساز و سامان سب دھرا رہ جاتا ہے۔

صوفی بنے بغیر دنیا بھی نہیں بن سکتی : اور مسلمان تو خوب کان اور دل کھول کر سن اور سمجھ لیں کہ ان کو صوفی بنے بغیر جس کا ترجمہ ہے "پکا مسلمان" دین تو دین دنیا بھی کسی اور جتن سے حاصل نہیں ہو سکتی' جس کے وجوہ

و اسباب کی تفصیل حضرت مجددی کی زبانی "قومیات و سیاسیات" (۱) میں مفصلا مذکور ہے' جب مسلمان "مسلمان" تھے اور ان کو دنیاوی اعتبار سے بھی غلبہ و تفوق حاصل تھا' تو اس کا سبب بھی ظاہری سازو سامان وجمعیت کا غلبہ و تفوق نہ تھا' بلکہ قلوب کی سلامتی و جمعیت تھی' کہ دشمنوں کے قلوب ان کے مقابلہ میں باہم پھٹے ہوئے اور ان کے ملے ہوئے تھے ۔ خود قرآن پاک شہادت دیتا ہے' کہ تحسبهم جميعا و قلوبهم شتى ذلك بانهم قوم لا يعقلون یعنی ان کی لڑائی آپس ہی میں سخت ہے تم سمجھتے ہو کہ وہ اکٹھے ہیں حالانکہ ان کے قلب پھٹے ہوئے ہیں' یہ اس لئے کہ سمجھ اور عقل سے کام نہیں لیتے' یعنی عقل کی بات بھی یہی ہے' کہ کام قلب و باطن کی قوت و جمعیت سے چلتا ہے' نہ کہ محض ظاہری و نمائشی اتحاد و اتفاق سے مولانا شبیر احمد عثمانی ان آیات کے تفسیری حاشیہ میں فرماتے ہیں :۔ کہ

"مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کے ظاہری اتحاد و اتفاق سے دھوکا مت کھاؤ' ان کے دل اندر سے پھٹے ہوئے ہیں' ہر ایک اپنی غرض و خواہش کا بندہ اور خیالات میں ایک دوسرے سے جدا ہے' پھر حقیقی یک جہتی کہاں میسر آ سکتی ہے' اگر عقل ہو تو سمجھیں کہ یہ نمائشی اتحاد کس کام کا ۔ اتحاد اسے کہتے ہیں' جو مومنین میں پایا جاتا ہے' کہ تمام اغراض و خواہشات سے یک سو ہو کر سب نے اللہ کی رسی تھام رکھی ہے اور سب کا مرنا جینا خدائے واحد کے لئے ہے" ۔ (۱)

کیا دلوں کی پھوٹ کا یہ نقشہ جو کبھی ہمارے دشمنوں کا تھا' آج خود ہمارے دلوں کا آئینہ نہیں؟ غرض یہ کہ بلا اندر کے اتفاق و اتحاد یعنی قلب و باطن کی

---

(۱) جو مضامین کی صورت میں معارف (۴۶ ' ۴۷) میں ملاحظہ ہوسکتے ہیں ۔ اور کتاب کی صورت میں بھی انشاء اللہ اشاعت پیش نظر ہے

(۱) حاشیہ بر ترجمہ کلام مجید از حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمتہ اللہ علیہ ۱۲

اصلاح و انقلاب کے یا صاف لفظوں میں بلا صوفی بنے' نہ خدا مل سکتا ہے' نہ صنم' نہ دین کے حقیقی ثمرات نصیب ہو سکتے ہیں نہ دنیا کے ظاہری منافع حاصل ہو سکتے ہیں -

مسلمانوں کی اس سراسر غیر اسلامی قومیات و سیاسیات سے جس طرح دل کڑھتا رہتا ہے' احقر نے زیادہ تر اسی کے تقاضے سے تصوف کی بحث میں بھی بظاہر یہ بے جوڑ جملہ معترضہ داخل کر دیا تھا' لیکن ابھی یہ جملہ معترضہ بمشکل ختم ہی ہوا تھا' کہ خود حضرت کا تصوف ہی پر گفتگو کے سلسلہ میں بعنیہٖ اسی مضمون کا ایک ملفوظ تائید غیبی کی طرح سامنے آگیا' جس کا ماحصل وہی ہے' کہ صوفی بنے بغیر حکومت و سلطنت بھی ہاتھ نہیں آ سکتی' فرماتے ہیں کہ

"اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کے اندر اوروں سے زیادہ سلطنت کرنے کی صفات موجود ہیں' مثلاً عدل و انصاف' ترحم وغیرہ' بس یہ کمی ہے کہ ان میں نظم نہیں' اور نظم نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ اتفاق و اتحاد نہیں' اور اتفاق و اتحاد کی جڑ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب نے عجیب فرمائی' جس کی تمام عقلا کو بھی خبر نہیں' فرماتے تھے کہ اتفاق کی جڑ تواضع ہے اگر ہر شخص دوسرے کو اپنے سے افضل سمجھنے لگے' (جو تصوف کی تعلیم و تربیت کا لازمہ ہے) تو پھر نااتفاقی کی نوبت ہی نہ آئے' کیونکہ نااتفاقی اسی سے تو پیدا ہوتی ہے' کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے افضل سمجھتا' اور اس سے بڑھنا چاہتا ہے' سبحان اللہ کیا حقیقت ظاہر فرمائی .... اب تو یہ ہے کہ کسی کو اپنا بڑا تسلیم کر لینے میں عار آتی ہے اور جب تک کسی کو بڑا تسلیم نہ کیا جائے مرکزیت جو نظم کے لئے ضروری ہے' قائم نہیں ہو سکتی" -

ابھی کچھ دن پہلے ایک مشہور خالص دینی مدرسہ میں اسی عار کا بڑا عبرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ ایک نہایت متقی جوان صالح' خود حضرت تھانوی علیہ الرحمتہ کے

تربیت یافتہ و مجاز، جو ایک غیر مشہور دینی مدرسہ کو حقیقی معنی میں دینی تربیت کے ساتھ کئی سال سے چلا رہے ہیں، اور جن کی دینی تربیت کی مہارت کا خود اس مشہور مدرسہ کے سب سے بڑے ذمہ دار بزرگ کو جب چشم دید تجربہ و مشاہدہ ہوا تو اپنے صاحبزادہ کو مشہور مدرسہ سے نکال کر اسی غیر مشہور مدرسہ کے حوالہ فرما دینا چاہا تھا، مگر مشہور مدرسہ کے مہتمم صاحب اس کو اپنے مدرسہ کے لئے عار جان کر مانع ہوئے۔ انا للہ!

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمارے دینی مدارس پر بھی آج کل دنیوی مدارس کے رنگ و اثر کا غلبہ اتنا ہو گیا ہے کہ سارا زور کتابوں کی تعلیم اور امتحانات پر دیا جاتا ہے۔ عملی تربیت کی طرف دوسرے درجہ کی توجہ بھی مشکل سے فرمائی جاتی ہے، خصوصاً اخلاقی و باطنی تربیت کا اہتمام تو کہنا چاہئے کہ ان کے اساتذہ و اکابر ہی میں مفقود ہے تو طلبہ و اصاغر کا کیا ذکر۔ مذکورہ بالا مشہور مدرسہ میں بھی سب سے بڑی کمی دین کی ظاہری اور اس سے بڑھ کر باطنی تربیت کی اساتذہ و طلبہ سب ہی میں ہے، اس کے ایک بے جاہ و مرتبت خیر خواہ نے عملی تربیت کے ان نقائص کی اصلاح کے لئے موصوف الصدر جوان صالح کے مشورہ و تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک تجویز پیش کر دی، جس کو سب سے بڑے ذمہ دار بزرگ نے پہلی گفتگو میں قبول بھی فرما لیا، لیکن جب مہتمم صاحب کو (جو ماشاء اللہ اپنے بڑوں کے بڑے مطیع ہیں) اس پر آمادہ فرمانا چاہا، تو وہی احساس عار کا جواب ملا کہ آخر مجھ پر کتنوں کو نگران بنایا جائے گا، حالانکہ اگر ان کے اوپر، ان کے بقول کئی نگران تھے (گو واقعہ میں کوئی نہیں) تو ایک اور کا اضافہ سہی۔ بلکہ خود اپنی جماعت کے اس مجوز ہی کے مشورہ و نگرانی کو قبول فرمانے پر راضی تھے، مگر خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ ایک جوان صالح سے استفادہ میں ان کی جوانی، عدم شہرت، غیر مشہور مدرسہ یا غیر جماعت سے تعلق کی کون سی عار اتنی سنگین دیوار بن کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی کہ آخر اصل ذمہ دار بزرگ کو بھی باوجود اپنی ذمہ داری کے کماحقہ ادا نہ فرما-

سکنے کی معذوری کے اس سنگین دیوار سے ٹکرا کر پسپا ہونا پڑا۔

یہ صرف ایک مثال برائے مثال ہے' ورنہ کیا عرض کیا جائے کہ اس راقم احقر نے تو جب سے تھانہ بھون کے تجدید یافتہ اسلامی تصوف کو کچھ دیکھا اور سنا ہے' تب سے خود اپنے اندر اور باہر انفرادی و اجتماعی' قومی و سیاسی' کسی معاملہ میں جہاں اور جو فساد نظر آتا ہے' اس کا بڑا سبب بداہتہً اسی اسلامی تصوف یااخلاقی و باطنی تربیت کی صلاح و اصلاح کی کمی و خامی دکھائی دیتی ہے' جس کی نسبت اسی ملفوظ میں آگے ارشاد ہے کہ

بلاتصوف کام نہیں چل سکتا: خلاصہ یہ کہ تصوف کے بغیر کام نہیں چل سکتا کیونکہ سب سے اول چیز تصوف میں تواضع ہی کی تعلیم ہے جس کو اصطلاح میں فنا کہتے ہیں' عموماً تو تصوف میں یہ سب سے آخر مقام سمجھا جاتا ہے' لیکن درحقیقت سب سے اول مقام بھی فناہی ہے' اور سب سے آخر مقام بھی فنا ہی ہے' کیونکہ فنا کے درجات ہیں' باقی بدون فنا کے تو اس طریق میں کوئی ایک قدم بھی نہیں چل سکتا' خواہ لاکھ درود وظیفے پڑھے' لاکھ تسبیحیں پھیرے'

لوگ کہتے ہیں کہ حجروں میں بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوتا' میدان میں آنا چاہئے' میں کہتا ہوں کہ حجروں ہی میں بیٹھنے سے میدان کی قابلیت پیدا ہوتی ہے' جیسے ریڈیو' حجرہ ہی میں رکھا جاتا ہے' اور پھر اسی سے تقریریں نشر ہو کر تمام عالم میں مل چل پڑ جاتی ہے' اس پر یاد آیا کہ سعد بن وقاص ایک معرکہ میں امیر لشکر تھے' اور بوجہ دنبل نکل آنے کی نقل و حرکت سے معذور تھے' پھر بھی اپنے خیمے میں بیٹھے بیٹھے ہی فوج کی کمان کر رہے تھے۔ (۱)

جب حضرات انبیاء علیہم السلام بلکہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی بدر سے پہلے حرا تھا' تو بدیگران چہ رسد' عارف اللہ آبادی نے خوب ہی فرمایا کہ۔

---

(۱) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۷۸۔ ۱۲

(۲) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۷۸۔ ۱۲

خدا کے کام دیکھوں بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے

آگے اسی مقام فنا کا ایک میدانی کارنامہ (۴) نقل فرمایا ہے' کہ

"حضرت ابو محجن ثقفی اس جرم میں کہ انہوں نے شراب کی تعریف میں اشعار لکھے تھے' عین کارزار میں زنجیر سے باندھ دیئے گئے تھے' کفار میں ایک شخص رستم نامی تھا' جس نے کئی مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا حضرت ابو محجن کو یہ دیکھ کر جوش اٹھا کہ میں جا کر اس کا مقابلہ کروں' مگر مجبور تھے' زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے' بالآخر رہا نہ گیا' اور امیر لشکر کی بیوی سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا' کہ مجھ کو اس وقت چھوڑ دیا جائے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر سلامت واپس آگیا' تو پھر اپنے کو اسی زنجیر سے بندھوادوں گا' اور اگر شہید ہو گیا تب بھی امیر لشکر کا کچھ حرج نہ ہو گا' کیونکہ مجھ سے ناراض ہیں ہی' چھٹکارا مل جائے گا' (غرض کسی طرح) رستم کے مقابلہ کے لئے جا پہنچے' لیکن اس ڈر سے کہ امیر لشکر کا سامنا نہ ہو جائے' منہ چھپا لیا تھا' رستم کے پاس پہنچتے ہی اس کو قتل کر دیا' اور خود واپس آ کر حسب وعدہ پھر اپنے کو مقید کر دیا' اور امیر لشکر نے بھی حکم شریعت کے جاری کرنے میں عین موقع کارزار میں پس و پیش نہ کیا' اور ایسے کار آمد شخص کو بھی قید کر دیا بات یہ ہے کہ وہاں اصل مقصود اتباع احکام اور تحصیل رضائے الہی تھا (اسی میں امیر لشکر اور لشکری سب فنا تھے) اس کے مقابلہ میں اور کسی مصلحت کی پرواہ نہ تھی۔

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرہ یارے گیرند (۱)

عجیب مجددانہ نکتہ : اسی سلسلہ میں ایک عام غلط فہمی کے متعلق عجیب مجددانہ نکتہ بیان فرمایا کہ

۱- فات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۷۹ - ۱۲

"شہادت کے متعلق عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جہاد میں مقتول ہو کر شہید ہو جانا ہی اصل مقصود ہے' حالانکہ یہ غلط ہے' مقتول ہونا اصل مقصود نہیں' بلکہ قاتل ہونا اصل مقصود ہے' اور مقتول ہونا قاتل ہونے کی حد تک ہے' یعنی حکم یہ ہے کہ مقتول ہونے کی حد تک بھی قاتل بنے رہو' اور قاتل ہونے میں مقتول ہونے کی بھی نوبت آ جائے تب بھی پروا نہ کرو - (۱)

جملہ معترضہ ذرا طویل ہو گیا' لیکن "حجرہ کے تصوف" کی تحقیر جس جہل و نادانی پر مبنی ہے' اس کے دور کرنے اور نام کے سیاسی میدانیوں پر پوری طرح واضح کرنے کے لئے کہ کام میدان میں بھی "تصوف کے بغیر چل نہیں سکتا" دراصل اسلامی تصوف ہی کے بارے میں یہ ایک بڑے تجدیدی نکتہ کی ضروری تفصیل تھی -

تصوف سے توحش کی وجہ : اسلامی تصوف کی اس حقیقت و اہمیت کے باوصف کہ وہ عین دین اور کمال اسلام کے سوا کچھ نہیں' جس سے دور ہو کر مسلمان بحیثیت مسلمان خستہ دنیا سے بھی دور سے دور تر ہوتے جا رہے ہیں' پھر بھی اہل دنیا ہی نہیں' بلکہ ان سے بڑھ کر بعض اکابر دین تک کو تصوف کے غیر دین یا طریقت کے خلاف شریعت ہونے' اور اس کی بدولت اس سے انکار و توحش کا بہت بڑا منشا یہ ہوتا ہے' کہ حضرات صوفیہ کے بہت سے حقائق و معارف' افکار و اشغال' مجاہدات و مراقبات' احوال و کیفیات' توجہ و تصرفات' کشف و کرامات' ترک لذت و تعلقات' بیعت و نسبت اور رسوم وعادات وغیرہ کی خاص خاص صورتوں کا ان حضرات کو کتاب و سنت کی عام و منصوص تعلیمات میں بظاہر نام و نشان نہیں ملتا - اور مغالطہ یہ ہو گیا ہے کہ تصوف و طریقت کی اصل و حقیقت یہی "بدعات" ہیں -

---

(۱) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۳۸۰ - ۱۳

سو تصوف کی اصل حقیقت کی نسبت حضرت مجدد کی تجدید کامل نے تمام و کمال واضح فرما دیا کہ وہ انسان کے ظاہر و قالب کی طرح قلب و باطن کی صلاح و اصلاح کے انہی احکام کا عرفی و اصطلاحی نام ہے' جو ظاہر کے فقہی احکام کی طرح خود قرآن و حدیث میں منصوص ہیں' اور اس طرح تصوف "ملاّ پن" کے سوا کچھ نہیں - کسی موقع پر اس عرف و اصطلاح کے جھگڑے سے بیزار ہو کر فرما دیا کہ

"ہم نہیں جانتے درویشی کیا چیز ہے' یہاں تو ملاّنا پن ہے - طالب علم ہیں' صاحب علم بھی نہیں' بس قرآن و حدیث پر عمل بتاتے ہیں' پھر اسی میں جو کچھ کسی کو ملنا ہوتا ہے مل جاتا ہے' اور ایسا ملتا ہے کہ مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من امثالنا یعنی جو ہم جیسوں میں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا' نہ کسی قلب میں اس کا خطرہ تک گزرا' مگر ظاہر میں کچھ نہیں' نہ ہو حق' نہ حال و قال' نہ وجد و کیف' نہ کشف و کرامت' پھیکا پھاکا طرز ہے' جیسے سمندر کی مچھلی کہ نمک خود اس کے اندر ہوتا ہے' اوپر سے ڈالنے کی ضرورت نہیں' لیکن کھلتا پکنے کے بعد ہے' بس یہاں بھی اوپر کا نمک نہیں اندر کا ہے جو پکنے کے بعد کھلتا ہے"- (۱)

---

(۱) اشرف السوانح حصہ دوم ص ۳۳۷ - ۱۲

ازکار و اشغال و مجاہدات

رہے ازکار و اشغال' مجاہدات و مراقبات وغیرہ کے ایسے صوفیانہ طریقے جو بظاہر قرآن و حدیث میں مذکور یاان سے ماخوذ نہیں معلوم ہوتے تو اس بارے میں حضرت مجدد کی تجدید و تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کے دوست و دشمن' معتقد و منکر دونوں ایک مشترک غلطی میں پڑ گئے' کہ ان چیزوں کو تصوف کے مقاصد و غایات سمجھ لیا۔ حالانکہ ان کی اصل حیثیت تدابیر و مقدمات یا آثار و ثمرات کی ہے' مقاصد تصوف یہ چیزیں قطعاً نہیں' اس لئے ان کو بدعات کہنا سرے سے بے معنی ہے - بدعت نام ہے " احداث فی الدین " کا' یعنی دین میں دین کا مقصد جان کر کسی نئی چیز کا اضافہ کرنا 'نہ کہ احداث للدین یعنی مقاصد دین کے حصول کے لئے تجربہ کی بناء پر کسی نئی تدبیر و ادویہ کا تجربہ اور اضافہ ہوتا رہتا ہے - یا خود دین میں علوم دین کی حفاظت و اشاعت کے لئے مدرسے کھولنا' کتب خانے قائم کرنا' لیتھو اور ٹائپ میں کتابیں چھاپنا' درس و تدریس کے لئے نصاب تعلیم کی نئی نئی صورتیں تجویز کرنا امتحانی سند دینا ظاہر ہے' کہ یہ سب باتیں نئی یااحداث ہیں' لیکن چونکہ احداث للدین ہیں' اس لئے نہ بدعات ہیں' نہ ان کو کتاب و سنت میں ڈھونڈنے کی ضرورت ہے -

مثلاً نماز میں خشوع (وھم فی صلوتھم خاشعون)اور حضور قلب(لا صلوۃ الابحضور القلب) مقصود و مامور ہے' اور تجربہ سے ذکر و شغل یا مراقبہ وغیرہ کی کوئی خاص صورت و ہیئت اس مقصود کے حصول میں معین معلوم ہوئی' جس میں کوئی شرعی ممانعت یا قباحت بھی نہیں تو اس کا خود ایجاد و اختیار کر لینا' یا غیر مسلموں اور دین کے دشمنوں تک سے اخذ و قبول کر لینا ایسا ہی ہے' جیسے جہاد کے لئے تیر و تفنگ کے بجائے بندوق اور مشین گن کا ان سے سیکھ بلکہ چھین لینا -

صوفیہ میں ایک خاص شغل پاس انفاس کا ہے' جو بہت عام ہے' اس کی نسبت

کسی طالب کے سوال کے جواب میں فرمایا' کہ

"یہ اشغال میں سے ہے' اس سے یکسوئی ہوتی ہے' اور خطرات دفع ہوتے ہیں' اسی طرح ذکر کے مختلف طریق ہیں' جس میں جس کو جمعیت ہو اختیار کرنا چاہئے' کیونکہ جمعیت گو خود مقصود نہیں' لیکن مقدمہ ہے حصول ۔ مقصود کا' اور مقدمات کا مقصود میں بہت دخل ہوتا ہے' اس لئے مشائخ نے مقاصد کے لئے کچھ مقدمات تجویز کئے ہیں' اور ان کو عملاً ایسی ہی اہمیت دی ہے' جیسی مقاصد کو" (۱) -

لیکن ان مقاصد کے اصل ہونے کے بجائے مقدمات ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے' کہ مقاصد کی طرح ان مقدمات میں سے کسی خاص مقدمہ کو اختیار کرنا ہی لازم و واجب نہیں' اس لئے ارشاد ہے کہ

رہا یہ سوال کہ مختلف مقدمات میں سے کس کو اختیار کیا جائے' اس کا خود ہی فیصلہ کر لے' یعنی جس میں جمعیت و دلچسپی زیادہ ہو وہی زیادہ نافع ہو گا اور یہ مسئلہ کہ جمعیت مطلوب و نافع ہے' قواعد فن نیز تجربہ سے تو معلوم تھا ہی' لیکن جی چاہتا تھا' کہ اس باب میں کوئی نص بھی مل جائے اللہ کا شکر ہے کہ آج ہی کل میں اس کی دلیل شرعی بھی ذہن میں آ گئی' حدیث میں ہے کہ اگر کھانا تیار ہو' اور نماز بھی تیار ہو' یعنی جب بھوک کا تقاضا ہو تو پہلے کھانا کھا لے' پھر نماز پڑھے' سو اس کی علت صرف یہ ہے کہ اگر پہلے نماز پڑھی تو طبیعت مشوش رہے گی' نماز میں جمعیت حاصل نہ ہو گی' اور اس کے عکس میں نماز تو جمعیت کے ساتھ ہو گی' اور کھانا تشویش کی حالت میں (کیونکہ نماز میں جی لگا رہے گا) حضرت امام ابوحنیفہ نے یہی وجہ عجیب عنوان سے بیان فرمائی ہے کہ لان یکون اکلی

---

(۱) افاضات الیومیہ حصہ ۷ ہفتم ص ۳۴۶ - ۱۲

کلہ صلوۃ خیر من ان یکون صلوتی کلھا اکلا ' (ا) یعنی میرا کھانا اگر نماز بن جائے تو یہ بہتر ہے اس سے کہ میری نماز کھانا بن جائے' ہمارے حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ اس اصل پر ایک تفریع فرمایا کرتے تھے' اگر کوئی ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں قیام کرنا چاہتا' اور حضرت کو فراست سے اس کا یہ مذاق معلوم ہو جاتا کہ اس کو مکہ معظمہ میں ویسی جمعیت نہ ہو گی' جیسی ہندوستان میں ہے' تو اس کو ہجرت کی اجازت نہیں دیتے تھے ' اور فرماتے تھے' کہ اگر ہندوستان میں جسم ہو اور مکہ میں قلب تو یہ اس سے اچھا ہے کہ مکہ میں جسم ہو اور ہندوستان میں قلب (1) -

سبحان اللہ ! واقعی جو محقق صوفی ہیں' ان کی نگاہ قرآن و حدیث کے مغز و تہہ تک جاتی ہے -

"غرض جتنے اشغال ہیں' وہ جمع خواطر ہی کے لئے ہیں' مقصود بالذات نہیں' اور اس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے' کہ بعض اشغال جوگیوں تک سے لئے ہیں - مثلاً حبس دم جو جوگیوں کے ہاں کا شغل ہے' مگر چوں کہ یہ ان کا مذہبی یا قومی شعار نہیں' اور خطرات کے دفع کے لئے نافع ہے- اس لئے اس کو بھی اپنے ہاں لے لیا ہے' اور اس میں کچھ حرج نہیں نہ اس میں تشبہ ممنوع ہے' کیونکہ جو چیز کسی دوسرے فرقہ کا نہ قومی شعار ہو' نہ مذہبی' محض تدبیر کے درجہ میں اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کے لئے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے' چونکہ حبس دم میں دفع خواطر کی محض ایک طبی تدبیر ہے اس لئے اس کا استعمال جائز ہے' کیونکہ یہ اخذ محض تدبیر میں ہے نہ کہ کسی

(ا) مرا کھانا سارا کا سارا نماز بن جائے یہ اس سے بہتر ہے کہ میری نماز ساری کی ساری کھانا بن جائے

(۲) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۳۴۷ - ۱۲

مذہبی یا قومی شعار میں۔

"اور اس کے جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کو چاروں طرف سے محدود و محفوظ فرمانا چاہتے تھے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، کہ ہمارے ہاں فارس میں شہر کے گرد خندق کھودتے ہیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ خندق کھو دی جائے اور خود بھی بہ نفس نفیس کھودنے میں شریک ہوئے، تو یہ انتظام و تدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا، محض ایک تدبیر تھی، اس لئے حضورؐ نے اس کی اجازت دے دی"۔ (ا)

کثرت ذکر: باقی نفس ذکر جس کی کثرت و دوام پر تصوف میں اتنا زور ہے، کہ خود حضرت علیہ الرحمہ قصد السبیل میں تصوف کے دو مرتبے ٹھہرا کر دوسرے یا اعلیٰ مرتبہ کا (ظاہر کی مندوب و مستحب طاعات کے ساتھ) دوسرا جزء باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا ہی قرار دیا ہے۔ ذکر کی یہ کثرت و دوام خود قرآن و حدیث میں منصوص و متواتر ہے، اذکرو اللہ ذکرا کثیرا وغیرہ کے علاوہ الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا او علی جنوبھم کی مشہور آیت ہی سے نہ صرف کثرت بلکہ دوام بھی ثابت ہے، اس لئے کہ آدمی کی کل تین حالتیں ہو سکتی ہیں، یا کھڑا رہے گا، یا بیٹھا یا لیٹا، اور ان تینوں حالتوں میں ذاکر رہنے کے معنی سوتے جاگتے ہمہ وقت اور ہر حال میں ذاکر رہنے ہی کے ہو سکتے ہیں۔ محاورہ میں بھی کسی بات کا دھیان اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، رہنے کے معنی کثرت و دوام ہی کے ہوتے ہیں۔

نیز اسی آیت سے ذکر قلب کا بھی استنباط فرمایا ہے، اس لئے کہ کھڑے بیٹھے لیٹے آدمی بہت سے دوسرے کاموں یا باتوں میں لگا رہتا ہے جن کے ساتھ لسانی کے بجائے قلبی ہی ذکر ممکن ہے، خصوصًا لیٹنے میں جب کہ اس میں سونے کی حالت

(ا) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۳۴۸ – ۱۲

بھی داخل ہو - پھر لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ نے ذکر قلب کی منصوصیت کو اور بھی واضح فرما دیا ہے، اس لئے کہ تجارت اور کاروبار کی مصروفیت کے اوقات میں بھی ذکر سے غافل نہ ہونا، قلبی ذکر ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

راقم احقر کی فہم احقر میں تو جو ذکر قرآن و حدیث میں مامور و منصوص ہے، وہ دراصل ذکر قلب ہی ہے، جس کے بغیر ذکر کی لغوی و معنوی حقیقت متحقق ہی نہیں ہو سکتی - ذکر کے لفظی و لغوی معنی یاد یا یادداشت کے ہیں، اور کسی شے کو جب یاد کیا جاتا ہے، یا خود یاد آ جاتی ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے، کہ ذہن کو اس کی جانب متوجہ کیا گیا یا ازخود متوجہ ہو گیا، جب آدمی کسی بھولی ہوئی بات کو یاد کرنا چاہتا ہے تو اس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہوتی یا ہو سکتی ہے کہ اس کی جانب ذہنی یا قلبی توجہ و التفات سے کام لے رہا ہے، بلکہ زبان سے اس کا نام لینا سرے سے ضروری نہیں ہوتا - لہٰذا یاد یا ذکر دراصل نام ہے، مذکور کو دل سے یاد کرنے یا اس کی طرف قلبی توجہ کا نہ کہ محض لسانی تلفظ - البتہ زبان سے نام لینا یا لسانی تلفظ قلبی توجہ کا عام و آسان ذریعہ ہے، اسی لئے کسی بھولے بسرے یا مرے ہوئے دوست و عزیز کا نام ہمارے سامنے لیا جائے تو اس کی اور اس کے تعلقات کی یاد دل میں تازہ ہو جاتی ہے، یعنی قلب ان بھولی ہوئی باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، احادیث میں اٹھنے، بیٹھنے، سونے، جاگنے، کھانے، پینے، ملنے، جلنے، رنج و راحت، بیماری و صحت، عیادت و تعزیت دعوت و رخصت و سواری و سفر وغیرہ غرض زندگی کے تمام چھوٹے بڑے احوال و مواقع پر اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت نعمت و مشیت وغیرہ کی یاددہانی کے لئے جو اذکار مامور و ماثور ہیں، ان کا منشاء یہی ہے، کہ دن رات ہر حال اور ہر موقع کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے خاص تعلق کی یاد دل میں تازہ ہوتی رہے - مثلاً کھانے کے بعد یہ دعا کہ الحمد للہ الذی اطعمنا و سقانا وجعلنا من المسلمین اور پہنتے وقت یہ دعا کی الحمد للہ الذی کسانی ما اُوَارِیْ بہ سوئتی واتجمل بہ فی حیاتی کا مدعا اس کے سوا اور کیا ہے، کہ ہم دل سے یہ

سمجھیں کہ کھلانے پلانے پہنانے اوڑھانے والا روزی و رزق عطا فرمانے والا حقیقتہً اللہ ہی ہے اور ظاہری اسباب و وسائل محض ظاہری ہیں۔

ایک طالب نے متعارف ذکر و شغل سے اپنی نامناسبت کے ساتھ عرض کیا' کہ "البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و احسان ہے کہ زندگی کے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں اس کے فعل و قدرت' حکمت و مشیت وغیرہ کا کسی نہ کسی طرح ادراک و استحضار رہتا ہے' اور اگر اس کی رویت کا بھی کچھ استحضار رہتا ہے' تو اس سے قلب و جوارح سب کے اعمال میں بہت نفع محسوس ہوتا ہے"۔ جواب میں تحریر فرمایا۔

"کیا یہ تھوڑا انعام ہے' یہی تو مقصود اعظم ہے' اذکار و اشغال متعارفہ اسی کا تو مقدمہ ہیں' اس کے ہوتے ہوئے مقدمات کی کاوش کی مثال بعینہ ایسی ہے' کہ کسی کو پکی پکائی روٹی مل گئی' اور وہ پھر بھی تمنا کرتا ہے کہ خود پکاؤں"۔

(تربیت السالک النور صفر ۶۴ھ)

نیز قصد السبیل میں باطن کو دوام ذکر میں مشغول رکھنا تصوف کے اعلیٰ مرتبہ کا لازم جزء ٹھہرایا ہے اس سے مراد بھی دل ہی کی یادداشت اور توجہ ہے۔ یعنی حق تعالیٰ کی یاد دل میں اس طرح بس جائے کہ زندگی کی ہر حرکت وسکون میں اس کی رضا و ناراضی' اس کی محبت و عظمت' اس کی سزا و جزاء' عذاب و ثواب پیش نظر ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ بجز بشری سہو و خطا یا غفلت کے دیدہ و دانستہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی یا چھوٹے بڑے معاصی کے قریب جانا اس کے لئے عملاً ناممکن ہو گا۔ اکبر الاعمال نام ایک وعظ میں ذکر کو سب سے بڑا عمل قرار دے کر ذکر کی اسی حقیقت و علامت کو واضح فرمایا گیا ہے' کہ ذکر حقیقی سارے معاصی سے بچنے اور تمام اوامر کے بجا لانے کو مستلزم ہے۔

"لوگ سوا لاکھ مرتبہ اللہ اللہ کہنے کو ذکر اللہ سمجھتے ہیں' مگر یہ بھی حقیقت

ذکر نہیں، صورت ذکر ہے، اور ذکر کے آثار سے ہے، ورنہ اگر اس کو حقیقت ذکر حاصل ہوتی، تو یہ شخص دوسرے اعمال کا تارک نہ ہو سکتا، حالانکہ بعضے سوا لاکھ دفعہ اللہ اللہ کرنے والے بھی دوسرے اعمال سے معرا ہیں "۔

تصوف کی نسبت یہ علمی و عملی ایسی عام غلطی ہے کہ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا، خود عام و غیر محقق صوفیہ تک اس میں مبتلا ہیں، کہ کثرت و دوام ذکر محض اسی لفظی و لسانی یا زیادہ سے زیادہ اصطلاحی قلبی ذکر کو سمجھ لیا ہے، جس کو قلب کا جاری ہونا کہتے ہیں، اس لئے ذکر کی اصل حقیقت ذرا اور توجہ و تفصیل سے سن لینا ضرو ہے، اسی وعظ میں فرماتے ہیں کہ

ذکر کی حقیقت : بتلاتا ہوں، اس کو ایک مقدمہ سے سمجھے وہ یہ کہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض مرتبہ شریف آدمی کے دل میں بعض جرائم کا تقاضا ہوتا ہے، جیسے چوری وغیرہ، چنانچہ بعضے شریف آدمی بھی چوری کرنے لگتے ہیں، محض اسی وجہ سے کہ طبیعت کا تقاضا ہے اور یہ تقاضا اس وجہ سے نہیں کہ ان کا پیشہ چوری کرنا ہے، بلکہ محض احتیاج کیوجہ سے کیونکہ احتیاج بری بلا ہے، یہ انسان کو بری سے بری جگہ لے جاتی ہے، ایک تو یہ منظر ہے اس کو سامنے رکھیئے۔

"اب اس کے مقابل دوسری جماعت کو دیکھئے، کہ باوجود تقاضا و افلاس کے چوری نہیں کرتے، چوری تو کیا کرتے، سرکاری مالگزاری کو بھی نہیں ٹالتے، بلکہ اپنی زمین اور جانور بیچ کر مالگزاری ادا کرتے ہیں، گو گھر میں فاقہ ہو جائے، اس میں غور کیجئے کہ پہلی جماعت چوری پر کیوں اقدام کرتی ہے، اور دوسری جماعت مالگزاری تک کیوں ادا کرتی ہے، حالانکہ احتیاج و افلاس میں دونوں برابر ہیں۔

وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ان کو ایک چیز یاد آئی جو پہلی جماعت کو یاد نہیں آئی، یعنی سزا و قید وغیرہ کی رسوائی، اور بس، اب سمجھو کہ ذکر کی حقیقت بھی یہی ہے، اور یاد بھی اسی کو کہتے ہیں، محض علم کا نام یاد نہیں، کیونکہ چوری

پر سزائے قید و سزائے تازیانہ ہونا پہلی جماعت کو بھی معلوم تھا' مگر یہ سزا و قید اس کے پیش نظر و مستحضر نہ تھی اس لئے وہ جرائم سے نہ رک سکی'اور دوسری جماعت کے پیش نظراور پوری طرح مستحضر تھی' اس لئے وہ اقدام نہ کر سکی "۔

بہت بڑی غلطی : ایک اور بہت بڑی غلطی کا ازالہ فرمایا گیا ہے'کہ جنت و جہنم کی یاد کو حقیقی ذکر سمجھنا تو الگ رہا حقیقی تصوف کے درجہ سے اس کو فرو تر خیال کیا جاتا ہے'کہ اللہ تعالٰی کی ذات کے سوا جنت و جہنم پر نظر ہو حالانکہ یہ عین عبدیت ہے' اور انبیاء علیہم السلام تک اس کی یاد اور رغبت و رہبت سے بے نیاز نہ تھے' البتہ غلبۂ حال سے معذوری ہے۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے ارشاد ہوا کہ

"اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اسکا حاصل تو یہ ہوا کہ جنت و دوزخ کی یاد ذکر اللہ ہے' حالانکہ یہ تو ذکر جنت و نارکا ہوا ' اللہ کی یاد نہ ہوئی جواب یہ ہے کہ ثواب کی یاد اللہ ہی کی یاد ہے' جیسے کہا جاتا ہے'کہ قانون کو یاد کرو' اس کا یہی مطلب ہے'کہ قانون کا یاد کرنا ہی ہتھکڑی اور جیل کا یاد کرنا ہے"۔

ذکر اللہ کے مراتب ہیں : ہاں یہ ضرور ہے کہ ذکر اللہ کے مراتب ہیں' بعض کو محض ذات حاکم کی یاد کافی ہوتی ہے' اور جرائم سے بچنے کے لئے سزائے جیل وغیرہ کی یاد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی' بلکہ بعض کو یہ بھی کہہ دینا کہ تم جو چاہے کرو تم کو سزا نہ ہو گی' پھر بھی اس کو حاکم سے ایسا خاص تعلق ہوتا ہے کہ مخالفت نہیں کر سکتا 'پھر بعض تو ایسے وقت میں ناراضی کے اندیشے سے مخالفت نہیں کرتے ' اور بعض کو یہ اندیشہ بھی نہیں ہوتا بلکہ حیا و شرم مانع ہوتی ہے' اور بعض کو یہ مانع بھی نہیں ہوتا' یعنی حیا و شرم پر بھی التفات نہیں ہوتا اس تعلق کا نام کچھ نہیں ۔

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیا رشیوہ ہاست بتان راکہ نام نیست

یا اس کا نام اگر کچھ ہے، تو تعلق ذات' بہرحال مراتب ذکر میں تدریج ضرور ہے' اب ہم کو دیکھنا چاہئے کہ ہم کو کس قسم کا تعلق ہے' جیسا تعلق ہو اسی کے مناسب ذکر میں مشغول ہونا چاہئے"۔

فرق مراتب پر قرآن سے استشهاد: آگے ذکر کے اس فرق مراتب پر قرآن سے استشهاد ہے جس سے ایک تفسیری مشکل بھی کیسی حل ہو جاتی ہے ' فرماتے ہیں کہ

"اور یہ فرق مراتب ہی تو ہے جس کی وجہ سے حق تعالیٰ نے ذکر کی تاکید فرماتے ہوئے کہیں تو ذکر اپنی ذات سے متعلق کیا ہے' جیسے ولذکر اللہ اکبر اور کہیں اسمائے حسنیٰ سے متعلق فرمایا ہے واذکر اسم ربک فتبتل الیہ تبتیلا' یہاں مفسرین نے لفظ اسم کو مقسم کہا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ زائد کہنے کی ضرورت نہیں' بلکہ یہ تغیر عنوان مراتب ذاکرین کے اعتبار سے ہے"۔

مولانا ذکر کے اس فرق مراتب پر تنبیہہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مست ولا یعقل نہ ازجام ہو
اے زہو قانع شدہ برنام ہو

"اس میں تنبیہہ ہے کہ ذکر کا ایک درجہ وہ ہے جو ذکر اسمی سے ارفع و اعلیٰ ہے' مگر دوسری جگہ بتلاتے ہیں کہ ذکر اسمی بھی بے کار نہیں' بلکہ نافع و مفید ہے' جس کو پہلا درجہ حاصل نہ ہو اسی کو غنیمت سمجھئے - (1)

از صفت و زنام چہ زاید خیال وآن خیالش ہست دلال و صال

"یہاں سے سمجھ میں آ جائے گا کہ ذکر لسانی بھی بیکار نہیں' گو دل متوجہ نہ ہو' اور یہ جو کسی نے کہا کہ۔

برزبان تسبیح و دردل گاؤ خر این چنین تسبیح کے وارد اثر

یہ غلط ہے میں نے اس کے رد میں کہا کہ این چنین تسبیح ہم دارد اثر

(۱) اور کمال جامعیت یہ ہے کہ اپنے اپنے موقع اور عمل کے اعتبار سے تمام مراتب حاصل ہوں' جیسے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام یا ان کے اقرب واکمل غیر مغلوب الحال متبعین کو ۱۲

صاحبو! غضب یہ ہے کہ کھٹائی مٹھائی کا نام لینے سے تو اثر ہو کہ نام لینے سے منہ میں پانی بھر آئے اور خدا کے نام میں اثر نہ ہو! (ص ۲۴ ' ۲۳)

صوفیہ کا اصطلاحی ذکر قلبی: پھر آگے صوفیہ کے اصطلاحی ذکر قلبی کا ذکر ہے کہ

"ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ متاخرین صوفیہ نے محض ذکر قلبی جو تجویز کیا ہے وہ بہت اچھی چیز ہے' مگر زیادہ دیر تک باقی نہیں رہتا دل ادھر ادھر چلا جاتا ہے' اور ذاکر سمجھتا ہے کہ میں ذکرمیں مشغول ہوں اس لئے میں تجویزکرتا ہوں کہ ذکر لسانی کرنا چاہئے' اگر کچھ دیر ذکر قلبی نہ رہے گا' تو لسانی تو باقی رہے گا' اور وقت ضائع نہ ہو گا'

"خصوصًا میری اس تحقیق کے بعد کہ جو عمل خاص نیت سے شروع ہو' اس کی برکت و انوار مستمر رہتے ہیں' گویا وہ نیت مستحضر نہ رہے' اور گو توجہ باقی نہ رہے' اب جو ہم لوگوں کے ذکر میں انوار نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو توجہ اور حصول نور کا قصد بھی نہیں' اگر قصد ہو تو انوار ضرور حاصل ہوں' پس اب یہ بھی کہنا صحیح ہے کہ این چنین تسبیح ہم دارد اثر - یعنی جب حصول اثر کا قصد ہو (ص ۲۶)

ذکر کے درجات: خلاصہ یہ کہ ذکر کا ایک درجہ یہ ہے کہ اللہ کے نام کو یاد کرو' دوسرا درجہ یہ ہے کہ بواسطہ نام کے ذات کو یاد کرو' تیسرا درجہ یہ ہے کہ نام کا واسطہ بھی نہ رہے' محض ذات کے ذکر پر قادر ہو جائے' اسی طرح تعلق کا ایک درجہ یہ ہے کہ اگر اس سے یوں بھی کہہ دیا جائے کہ تم کو کسی گناہ پر سزا نہ ہو گی' جو چاہے کرو جب بھی احکام کی مخالفت نہ کرے' نیز اگر یوں کہہ دیا کہ تیرا خاتمہ کفر پر ہو گا' جب بھی اعمال میں کوتاہی نہ کرے' ایک بزرگ کو ذکر میں آواز آئی کہ جو چاہے کر تو کافر ہو کر مرے گا' وہ پریشان ہو گئے' مگر ذکر اور نماز وغیرہ نہیں چھوڑی' بلکہ شیخ سے جا کر عرض کیا' شیخ نے کہا

کام میں لگے رہو' اس آواز سے پریشان نہ ہو' یہ دشنام محبت ہے۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی

جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

محبت کا ایک رنگ: یہ بھی محبت کا رنگ ہے - کہ۔

ماپر وریم دشمن و مامی کشیم دوست

کس رارسد نہ چوں چرا درقضائے ما

میرے والد صاحب بچوں کو کم لیتے تھے جب زیادہ محبت کا جوش اٹھتا' بچوں کے گلے پکڑ کر دبا دیتے' جس سے بچے رو پڑتے' مستورات کہتیں یہ تمہاری محبت- عجیب محبت ہے کہ بچوں کو گود میں لینا' کھلانا تو نہیں آتا' بس رولانا آتا ہے' مگر ان کو اسی میں لطف آتا تھا' مجھ کو بھی بچوں سے مزاح کا شوق ہے' جس میں بعض دفعہ ان کو غصہ بھی آتا ہے ان کی یہ ادائیں پسند آتی ہیں' ایسے ہی بلا تشبیہ یوں سمجھئے کہ بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ محبت کی وجہ سے طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں' ان کا رونا چلانا ان کو پسند ہے' کسی کا ہنسنا پسند ہے' اس کو ہنساتے ہیں کسی کا روناپسند ہے اس کو رلاتے ہیں -

ذوقہا دارم بہ یار یہائے تو خوش نماید گریہ شبہائے تو

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است بعندلیب چہ فرمودہ کہ نالان است

اس تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا' کہ جنت و دوزخ' عذاب و ثواب کو یاد کرنا بھی اللہ ہی کی یاد ہے' کیونکہ ذکر کے مراتب مختلف ہیں' پس ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ جیسے بعض لوگ باوجود تقاضا کے چوری نہیں کرتے' مالگزاری ادا کرنے میں سستی نہیں کرتے' کیونکہ ان کو ایک چیز یاد آتی ہے' یعنی سزا و قید وغیرہ' اسی طرح ایسی چیز کو یاد رکھنا جو معاصی (اللہ کی نافرمانی) سے روک دے

اور طاعات (فرمانبرداری) پر کمر ہمت چست کر دے' ذکر اللہ (یا اللہ کی یاد) ہے اب اگر کسی کو جنت و دوزخ کی یاد معاصی سے روکے اس کے لیے یہی ذکر اللہ ہے اور کسی کو اللہ اللہ کرنا معاصی سے روکے اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے اور جس کو مراقبہ ذات معاصی سے روکے' اس کے واسطے یہی ذکر اللہ ہے' اور جس کو یہ چیزیں معاصی سے نہ روکیں' اس کے لئے یہ حقیقی ذکر اللہ نہ ہوں گی' بلکہ ذکر کی صورت ہوں گی' اس کو اپنے مناسب حال حقیقی ذکر کسی محقق سے تجویز کرنا چاہئے مثلاً بعضوں کے لئے نفس پر مالی جرمانہ معاصی سے مانع ہوتا ہے' ان کے واسطے یہی ذکر ہے یہ حقیقت ہے ذکر کی اور یہی جڑ ہے تمام طریق کی' بلکہ تمام شریعت کی۔

ذکرِ ہی جڑ ہے تمام شریعت و طریقت کی: اس کے ثبوت میں مثلاً چند آیات مذکور ہیں۔

"چنانچہ حق تعالی فرماتے ہیں' اقم الصلوٰة لذکری اس سے معلوم ہوا کہ صلوۃ سے مقصود ذکر ہے' حج کے بارے میں ارشاد ہے فاذکروالله عند المشعر الحرام و اذکرو الله فی ایام معدودات اور فاذکروا اسم الله علیها صواف اور اگر غور کیا جائے تو تمام اعمال میں ذکر موجود ملے گا' یہ تو اعمال ظاہرہ کی چند مثالیں تھیں اب اعمال باطنہ میں غور کیجئے' تو وہاں بھی ذکر موجود ہے' چنانچہ ارشاد ہے۔ اذا ذکر الله وجلت قلوبهم واذا تلیت علیهم ایاته زادتهم ایمانا ۔ جس سے معلوم ہوا کہ خوف و خشیت وہی معتبر ہے جس کا منشا ذکر اللہ ہو' یہ مقامات کا بیان تھا' کیونکہ اعمال ہی کو مقامات کہا جاتا ہے' اب احوال میں غور کیا جائے' تو ان میں بھی ذکر کو دخل ہے' چنانچہ ارشاد ہے' الا بذکر الله تطمئن القلوب (ا) کہ اللہ کے ذکر ہی سے قلب کو اطمینان ہوتا ہے' اطمینان کے دو

(ا) اس وعظ کے ضمیموں میں ذکر سے متعلق اور بھی بہت سی آیات نقل فرما دی گئی ہے ۱۲

درجے ہیں ایک تو مقام ہے، جو تصدیق و اذعان کا درجہ ہے اور ایک حال ہے، جس کو سکون و انس سے تعبیر کیا جاتا ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق اطمینان کے لئے ذکر اللہ کو سبب بتلایا ہے، اس لئے اس کے عموم میں مقام و حال دونوں داخل ہیں، اگر عموم سے استدلال نہ ہو تو مشاہدہ خود اس کی دلیل ہے، کیونکہ واقعی دل کو راحت اور چین ذکر اللہ ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

گر گریزی برامیدے راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے درد بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

خلوت گاہ حق سے مراد اللہ کے ساتھ تعلق ہے، جو ذکر کی اعلیٰ فرد ہے"۔

ذکر کی حقیقت و صورت میں فرق و تمیز کے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی تجدید و تحقیق کی یہ تفصیل باوجود کسی قدر تطویل کے ضروری واہم تھی اس لئے کہ غیر محقق درویشوں نے اسمی اذکار یا محض صورت ذکر پر اتنا زور دے دیا ہے، کہ ذکر کی حقیقت گم ہو کر رہ گئی۔ ماحصل حضرت کی اس مجددانہ تحقیق کا یہ نکلا کہ حقیقی ذکر وہ ہے جس میں بلاواسطہ (یا بواسطہ عذاب و ثواب جنت و دوزخ وغیرہ) مذکور کا استحضار ہو۔ احقر نے اسی کو ابتداء میں یوں عرض کیا تھا، کہ ذکر و یاد کے معنی یہ ہیں، کہ مذکور (یعنی جس کی یاد آئے، یا جس کو یاد کیا جائے) قلب یا ذہن اس کی طرف متوجہ ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کی اس حقیقی یاد و ذکر یا مذکور کی طرف توجہ اور اس کے استحضار کی علامت بلکہ لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ دیدہ و دانستہ نافرمانی یا معصیت کا ارتکاب یا فرمانبرداری و طاعت میں کوتاہی عملاً ناممکن ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، رضا وناراضی یا عذاب و ثواب ہمارے پیش نظر ہو، اور پھر ہم اس کی پروا نہ کریں۔ اس حقیقی یاد یا ذکر ہی کا نام حدیث میں احسان ہے جو محققین کے اسلامی تصوف کا منصوص نام ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح بجا لاؤ، کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم کو اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو

وہ تو دیکھ ہی رہا ہے ظاہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی یاد نصیب ہو جائے کہ گویا یہ ہمہ وقت اس کے سامنے اور حضوری میں ہے' یا کم از کم اس کی رضا و ناراضی' عذاب و ثواب ہی کا استحضار رہے' تو بشری بھول چوک کے علاوہ کسی چھوٹی بڑی نافرمانی کی جرات کیسے ہو سکتی ہے۔

ذکر اللہ کے حصول کا طریقہ : اسی آیت میں جس پر اکبر الاعمال کا یہ وعظ ہے ولذکر اللہ اکبر کے بعد ہی دوسرا ٹکڑا واللہ یعلم ما تصنعون ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی چیز ہے' اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد حقیقی معنی میں ہو' تو کم از کم اتنا تو پیش نظر رہنا ہی چاہئے کہ ہمارا ہر فعل و عمل اللہ کے علم میں ہے' اور وہ جان اور دیکھ رہا ہے' (فانہ یراک) نیز ذکر اللہ کی حقیقت کو حاصل کرنے کا سہل طریقہ یہی ہے کہ اس کے حاضر و ناظر یا عالم ورائی ہونے کا مراقبہ رہے۔ اسی وعظ کے آخری ضمیمہ میں ہے کہ

"اس جملہ میں ذکر اللہ کی تحصیل کا طریقہ بتلایا گیا ہے' کہ اس مضمون کو پیش نظر رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو میرے ہر عمل کا علم ہے' اس مراقبہ سے ذکر اللہ کی بسہولت حاصل ہو جائے گا' اور تمام اعمال کی تکمیل ہو جائے گی' کیونکہ ہمارے اعمال کی کوتاہی کا سبب یہی ہے' کہ ہم اعمال کو بدون سوچے سمجھے ادا کرتے ہیں' اگر یہ سوچ کر عمل کریں کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے عمل کا علم ہو رہا ہے' کہ ہم کیسے ادا کر رہے ہیں' تو عمل اچھی طرح ہو' اور اگر یہ مراقبہ راسخ ہو جائے' تو معاصی سے اجتناب آسان ہو جائے' یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی حقیقت محض زبانی ذکر نہیں' بلکہ وہ دوسری چیز ہے' جو مراقبہ علم سے مثلاً حاصل ہوتی ہے' پھر خواہ مراقبہ علم اس طرح ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر عمل کو جانتے ہیں' اگر کوتاہی ہو گی' تو عذاب ہو گا' یا اس طرح ہو کہ محبوب کو میری عبادت کا علم ہے' وہ مجھ سے اس حالت میں ناراض ہو گا' وغیرہ وغیرہ" (ص ۳۶)

غرض اگر حقیقی تصوف کا حقیقی ذکر میسر ہو تو مومن و مسلم کی زندگی ہر حرکت' ہر سکون اور ساری زندگی ذکر ہی ذکر اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہی یاد ہے - خواہ یہ یاد کسی درجہ اور کسی پیرایہ میں ہو' خواہ اس کے ثواب و عقاب کی یاد ہو خواہ اس کی رضا و ناراضی کی یاد ہو' خواہ اس کی ذات کی یاد ہو -

باقی حضرات صوفیہ کے ہاں ذکر لسانی کا جو اتنا اہتمام ہے' اس کا بڑا مقصد بھی یہی ہے کہ اس ذریعہ سے قلب میں مذکور کی یاد رچ اور بس جائے - یہ نہ بھی ہو تو ادھر ادھر کی لغو و فضول باتوں اور گپ زنیوں کے بجائے نفس زبان ہی کا ذاکر رہنا کیا کم ہے - اس کے علاوہ اگر لسانی ذکر کے ساتھ قلب مسلسل نہ بھی متوجہ رہے' تو بھی اگر صوفیانہ طریقوں سے قلبی توجہ کے ساتھ ذکر لسانی کی مشق کی گئی ہے' تو دنیا کے دھندوں میں انہماک کے باوجود زبان کی یاد کے ساتھ وقتاً فوقتاً قلب بھی ضرور کچھ نہ کچھ متوجہ ہوتا رہتا ہے' یوں بھی اگر کسی کا نام زبان ہی سے ہر وقت اٹھتے بیٹھتے لیتے رہو تو دوسری مصروفیتوں کے باوجود درمیان درمیان دل میں اس کا خیال آتا ہی رہے گا - اسی بناء پر حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمہ صوفیا کے متعارف ذکر قلبی کے مقابلہ میں (جس میں قلب کے ذہول یا عدم توجہ کا اندیشہ رہتا ہے) ذکر لسانی کی ترجیح و فضیلت کے قائل تھے -

ذکر قلبی افضل ہے یا لسانی : ایک مولوی صاحب نے بعینہ یہی سوال پیش کیا' کہ ذکر قلب افضل ہے یا لسانی؟

"فرمایا کہ ذکر کے متعلق مختلف احکام ہیں' بعض لفظ کے ساتھ متعلق ہیں' ان میں ذکر لسانی افضل ہے' باقی جو ذکر زبان سے نہ کیا جائے اجراس پر بھی ہے' یہ ذکر قلبی ہے جس سے ہر وقت قلب میں یاد رہے' مگر اس میں قوی اندیشہ رہتا ہے' قلب سے ذہول کا' اور ذکر لسانی میں یہ اندیشہ نہیں' اس اعتبار سے قلبی سے لسانی افضل ہے' دوسری بات یہ ہے کہ اگر صرف قلب سے ذکر کرے گا' تو زبان خالی رہے گی' اور اگر زبان سے ذکر کرے گا تو اس کے ساتھ قلب

بھی اونیٰ توجہ کے ساتھ متوجہ رہے گا" - (۱)

یہاں ذکر قلبی سے مراد صوفیہ کا وہی متعارف و اصطلاحی ذکر ہے' جس کو قلب کا جاری ہونا کہا جاتا ہے' اور جو اس طرح مشق سے ہو جاتا ہے کہ قلب کی طرف متوجہ ہو کر مثلاً یہ تصور کیا جائے کہ اس کی حرکات کے ساتھ اللہ اللہ یا لا الا اللہ نکل رہا ہے' تو کچھ عرصہ کی مشق کے بعد قلب کی طرف توجہ سے ایسا ہی سنائی دینے لگتا ہے - لیکن یہ اکثر خصوصًا دماغی مصروفیت کی حالت میں نہیں رہ سکتا 'چنانچہ کسی طالب نے لکھا تھا کہ

"ذکر قلبی اکثر اوقات بآسانی جاری رہتا ہے' مشغولی کار کے ساتھ بھی جاری رہتا ہے' لیکن اکثر دماغی مصروفیت کے وقت بند ہو جاتا ہے کوشش کرتا ہوں کہ ایسے وقت بھی بے تکلف جاری رہ سکے " -

جواب میں تحریر فرمایا کہ

"نہیں رہ سکتا' کیونکہ ایک آن میں دو طرف توجہ نہیں ہو سکتی ' لیکن اس جاری نہ رہنے سے کچھ ضرر نہیں' باقی ذکر قلبی سو اگر اس وقت ذکر لسانی دشوار ہو تو اس پر اکتفا کا مضائقہ نہیں' ورنہ محض قلبی پر اکتفا نہ کیا جائے' لسانی بھی اس کے ساتھ ضرور ہے' خواہ قلبی میں اس سے کچھ کمی ہو جائے - (۲)

یہ وہی اصطلاحی ذکر قلبی ہے' کہ چونکہ اس کا دارومدار تصور پر ہے' کہ قلب کی حرکت یا دھڑکن سے فلاں آواز نکل رہی ہے' اس لئے جب دماغ دوسرے تصورات میں مصروف رہتا ہے' تو یہ جاری نہیں رہ سکتا بخلاف لسانی کے کہ وہ اس صورت میں بھی جاری رہ سکتا ہے -

"ایک شخص شاہ ولی اللہ صاحب کے پاس آیا' اور عرض کیا کہ حضرت میرا قلب جاری ہو گیا' آپ نے فرمایا کہ دل دھڑکنے کو قلب کا جاری ہونا نہیں کہتے'

---

(۱) الافاضات الیومیہ ص ۵۹ حصہ ہفتم ۱۲

(۲) اشرف السوانح حصہ سوم ص ۱۵۴ - ۱۲

قلب کا جاری ہونا یہ ہے کہ ہر وقت خداوند تعالیٰ کی یاد دل پر حاضر رہے - اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں بزرگ کی بوٹیاں تھرکتی ہیں' یہ بہت کامل ہیں' اور جن لوگوں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں' ان کی نسبت کہتے ہیں کہ نیک بخت ہیں' ان میں کمالات باطنی نہیں' حالانکہ کمالات باطنی بالکل مخفی ہیں' ان کو بوٹیوں کے تھرکنے سے کچھ تعلق نہیں "- (۱)

ذکر کے باب میں ایک بڑی خطرناک غلطی: جس میں بعضوں کو ابتلا یہ ہے کہ نفس ذکر ہی تمام اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے کافی جانتے ہیں' اور استدلال اس ابتلا سے بھی عجیب تر ہے' کہ "انا جلیس من ذکرنی" سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اللہ سے قریب رہ کر اللہ کی نافرمانی یا معاصی میں کیسے مبتلا ہو گا' لہٰذا اور تدابیر کی ضرورت نہیں -

"حالانکہ یہ بالکل غلط ہے' کیونکہ ذکرنی میں خود تدابیر اصلاح بھی داخل ہیں' تو بدون معالجہ امراض کے ذکر ہی متحقق نہ ہو گا' دیکھو حصن حصین میں ہے' بل کل مطیع اللہ فھو ذاکر - (۱) سنئے ذکر کے معنیٰ ہیں یاد تو یاد تو سب طریقہ سے ہوتی ہے' نہ کہ محض زبان ہی سے نام لے لے' کیا یہ یاد ہے کہ جس کی یاد کا دعوے ہو' نہ اس سے بات کرے نہ اس کے خط کا جواب دے' نہ اس سے ملے' نہ اس کا کہنا مانے' یہ ہرگز یاد نہیں تو جو ذکر بدون اصلاح کے ہو' وہ ایسی ہی یاد ہے "- (۲)

یہ غلطی اچھے اچھے مشائخ میں اتنی عام ہے کہ مرید کر کے بس کچھ اذکار کی تعلیم فرما کر فارغ ہو جاتے ہیں - اعمال و اخلاق کی کوتاہیوں یا امراض پر نہ کوئی

---

(۱) الرفیق فی سواء الطریق ص ۴۷

(۱) بلکہ اللہ کا ہر فرماں بردار (اپنی فرمانبرداری اور اطاعت کے تمام حرکات و سکنات میں) دراصل اللہ تعالیٰ کی یاد ہی میں ہوتا ہے (خواہ زبان سے ذاکر نہ ہو) ۱۲

(۲) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۱۹۵ - ۱۳

روک ٹوک' نہ علاج و تدبیر' بلکہ طالب اگر کسی مرض کو بیان کرے تو اس کے لئے بھی اکثر کوئی ذکر یا وظیفہ ہی اور تجویز فرما دیا جاتا ہے' حضرت مجدد علیہ الرحمہ کی رائج الوقت عامیانہ تصوف میں درحقیقت یہ بڑی اہم تجدید و اصلاح تھی' کہ اعمال و اخلاق کے مواخذہ و معالجہ کے مقابلہ میں مروجہ اذکار و اشغال اور اوراد وظائف کی حیثیت بالکل دوسرے اور تیسرے درجے کی تھی' ان کا ذکر مجلس میں شاذو نادر ہی آتا' لیکن اعمال و اخلاق پر روک ٹوک دن رات رہتی۔

"ایک طالب نے اپنے خط میں کوئی آسان وظیفہ یا طریقہ پوچھا جس سے طاعات میں ترقی اور معاصی سے اجتناب میسر ہو' جواب میں تحریر فرمایا کہ طاعات و معاصی دونوں امور اختیاریہ ہیں' جن میں وظیفہ کو کچھ دخل نہیں ' رہا طریقہ سو امور اختیاریہ کا طریقہ استعمال اختیار کے سوا اور کچھ نہیں"۔

کسی اور موقع پر فرمایا کہ

"نرا وظیفہ اصلاح کے لئے ہرگز کافی نہیں' نرے وظیفے والے پیروں سے واللہ ثم واللہ جو کبھی اصلاح ہو' اصلاح تو ہوتی ہے' اصلاح کے طریقہ سے"۔

غرض ذکر کی جو اصل حقیقت ہے' یعنی مذکور کی دل سے یاد اور اس سے غافل نہ ہونا' یہ تو شریعت کا عین مقصود' بلکہ عبادت و اطاعت کا اعلیٰ ترین مقام احسان ہے' کہ وہ مذکور کے اس طرح استحضار کے ساتھ ادا ہو' کہ گویا ہم اس کے سامنے حاضر ہیں' اس کو دیکھ رہے ہیں' یا وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ مسلمان کی ساری زندگی بندگی ہے' اسلام کے معنی ہی بالکلیہ اطاعت یا سرا فگندگی و سپردگی کے ہیں' اور حضرت مجدد کی تجدید تصوف کا خلاصہ بھی یہی دو باتیں ہیں' طاعت کا اہتمام' اور دوام ذکر یا معصیت و غفلت سے اجتناب تام۔ اور تصوف یعنی خدا کی اس کمال بندگی یا عبدیت خالصہ کی راہ کے قصد یا "قصد السبیل الی المولیٰ الجلیل" کے نام سے جو دستور العمل مرتب فرمایا گیا ہے' اس میں تفصیلی تفہیم کے بعد ارشاد ہے کہ

خلاصہ طریق طاعت و ذکر: میزان کل اور خلاصہ طریق الی اللہ کا کل دو چیزیں ہیں طاعت اور ذکر' معصیت سے طاعت فوت ہو جاتی ہے' اور غفلت سے ذکر مخل ہو جاتا ہے' اس لئے اپنا اصلی کام طاعت و ذکر پر دوام رکھنے اور معصیت و غفلت سے بچنے کو سمجھے" - (۱)

سالکین کے چار طبقات: باقی اشغال و مراقبات' احوال و کیفیات' کشف و کرامات' بیعت و نسبت وغیرہ کی جو حیثیت و حقیقت تصوف کے اس متن متین دستورالعمل (قصد السبیل) میں واضح فرمائی گئی ہے' اس کا اندازہ صرف اس سے فرمایاجا سکتا ہے' کہ اس راہ کے قصد کرنے والوں کو چار طبقات عامی مشغول' عامی فارغ' عالم مشغول' عالم فارغ میں تقسیم فرما کر عامی مشغول و فارغ دونوں کے لئے اشغال کی سرے سے ممانعت فرمائی ہے - کہ

"اس میں طرح طرح کے خطرات ہیں جن کا تحمل عامی سے نہیں ہو سکتاعالم مشغول تک کے دستور العمل میں یہ قید ہے کہ

"شیخ سے دور رہ کر شغل نہ کریں' البتہ چندے شیخ کے حضور میں اگر یہ کام کیا ہو اور وہ اب بھی اس کو تجویز کرے' تو مضائقہ نہیں - (۲)

ورنہ تصوف کے اس تجدیدی دستور العمل کی رو سے متعارف صوفی بننے کی اجازت صرف "عالم فارغ" یعنی ایسے علماء ہی کو ہے' جو ایک طرف دین و شریعت کا پورا علم رکھتے ہیں' اور دوسری طرف فکر معاش سے فارغ ہیں تاکہ نہ جاہل صوفیوں کے خلاف شرع رسوم و بدعات کا شکار ہو سکیں' اور نہ اشغال و مراقبات یا ان کے ثمرات و کیفیات وغیرہ کے عدم تحمل کی وجہ سے حدود سے تجاوز کر سکیں - چنانچہ عالم فارغ کے دستور العمل میں ان چیزوں کی حسب ضرورت اجازت کے

---

(۱) قصد السبیل الی مولی الجلیل ص ۱۷ - ۱۲

(۲) قصد السبیل الی مولی الجلیل ص ۱۰ - ۱۲

باوجود ان کی حدود حیثیت پر پوری طرح متنبہ فرما دیا گیا ہے مثلاً ذکر میں جہر و ضرب کی نسبت ارشاد ہے ۔ کہ

" جہر مقصود بالذات اور قربت فی نفسہا نہیں، ایسا اعتقاد کرنا بدعت ہے اور حدیث میں جو وارد ہے کہ اربعو اعلی انفسکم انکم لا تدعون اصم ولا غائبا میرے نزدیک اسی اعتقاد کی نہی پر محمول ہے، اور بعض نے اس کو جہر مفرط پر محمول کیا ہے، جس سے دوسرے متاذی ہوں مثلا سونے والوں کو تشویش ہو، اور امام ابوحنیفہ کے منع فرمانے کی بھی یہی توجیہات ہیں، ورنہ جہر فی نفسہ جائز ہے، جیسا کہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے رفع الصوت بالتکبیر کا علامت انصراف عن الصلوۃ ہونا عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اور سنن میں وتر کے بعد سبحان الملک القدوس مروی ہے " ۔

"اور حکمت جہر میں یہ سمجھی گئی ہے، کہ اس میں وساوس و خطرات کم آتے ہیں، کیونکہ اپنی آواز جو کان میں آتی رہتی ہے، قلب آسانی سے ادھر متوجہ رہ سکتا ہے، سو یہ فائدہ خفیف جہر سے بھی حاصل ہے ۔

"اسی طرح ضرب میں بھی قربت نہیں، اس میں بھی ایسی ہی طبی حکمت ہے، وہ یہ کہ حرکت عنیفہ سے حرارت پیدا ہوتی ہے، اور حرارت سے رقت اور رقت سے تاثر اور تاثر معین ہوتا ہے اطاعت اور محبت میں، جو مقاصد ہیں، بس ضرب ذریعہ مقصود ہونے کی بناء پر مقصود بالغیر ہے، لیکن زیادہ ضرب سے قلب میں خفقان پیدا ہونے کا ڈر ہے لہٰذا اعتدال سے تجاوز نہ کرے ۔

"یہ تو اس کے متعلق تحقیق علمی تھی، ایک اور عمل اس میں قابل تنبیہ ہے، کہ اکثر کتب فن میں اس ذکر کے ساتھ گردن کو داہنے بائیں لے جانے کو لکھا ہے، سو جان لینا چاہئے کہ پہلے لوگوں کے مزاج و دماغ قوی تھے، اس کے متحمل ہوتے تھے، بلکہ بوجہ قوت مزاج بدون اس کے متاثر نہ ہوتے تھے، اس لئے ان کو اس کی ضرورت تھی، اب خود ہی ضعف غالب ہے، تھوڑے مشاغل

سے قلب متاثر ہو سکتا ہے' اس لئے ایسا نہ کیا جائے' ورنہ دماغ کے ماؤف ہونے کا اندیشہ ہے - (۱)

عالم فارغ کے لئے اس دستور العمل میں جو مراقبہ تجویز فرمایا گیا ہے' وہ مراقبہ موت ہے' یعنی موت کے بعد سے حساب و کتاب وغیرہ کے واقعات کا اس طرح تصور کرنا کہ گویا وہ ہم کو پیش آ رہے ہیں - اس کی بھی حکمت و غایت یہ ہے کہ کثرت ذکر سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس مراقبہ سے دنیا سے نفرت پیدا ہو گی' یہی حب و بغض اس کا کام بنا دینے کے لئے انشاء اللہ کافی ہوں گے -

"بس تقوی کا التزام اور یہ ذکر اور یہ مراقبہ کافی ہے' عمر بھر اس پر مداومت رکھئے' تو آخرت میں تو ثمرہ یقینی ہے' اور اصل وعدہ عطائے ثمرات کا آخرت ہی میں ہے لیکن دنیا میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو گا تو اس کے قلب پر علوم عجیبہ و معارف جن کے باب میں مولانا کا ارشاد ہے۔

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

اور وہ واردات غریبہ و مواجید مثل ذوق و شوق' محبت و انس ہیبت و انکشاف اسرار احکام و حسن و معاملہ فیما بینہ وبین اللہ وغیرہ فائض ہوں گے' جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد ہے' اور یہ امور حالات کہلاتے ہیں' یہی علوم کشف الٰہی کہلاتے ہیں کشف کونی نہ لذت میں اس کی گرد کو پہنچتا ہے' نہ قرب میں اس کو اس کا سا دخل ہے" -

اصل میں تو تقوی و طاعت کے اہتمام کے ساتھ منصوص و مامور کثرت و دوام ذکر ہی کافی قرار دیا گیا ہے' لیکن بعضوں کو مدت تک ذکر کرنے کے باوجود حضور قلب و یکسوئی میسر نہیں ہوتی' ان کے لئے کسی مناسب شغل میں مضائقہ نہیں' مثلاً ایک سہل شغل الحد ہے' جس میں کچھ لذیذ آوازیں سنائی دیتی ہیں -

---

(۱) قصد السبیل الی مولی الجلیل ص ۱۱' ۱۰ - ۱۲

"بلکہ بعض اوقات نہایت دلربا و دلفریب آوازیں پیدا ہوتی ہیں، جو شاغل کو محو کر دیتی ہیں، اور محسوس و لذیذ چیز کی طرف متوجہ ہونے سے طبعًا دوسرے خطرات کم ہو جاتے ہیں، تو اس سے ذہن کو ایک طرف پوری توجہ کرنے کی عادت ہو جاتی ہے"۔

لیکن چونکہ شغل خود مقصود نہیں ہوتا، اس لئے جب یہ عادت ہو جاتی ہے، تو اس کو چھڑا کر توجہ کی عادت کو حقیقی مقصود کی طرف پھیر دیتے ہیں، جس کی طرف اولاً بوجہ اس کے غائب عن الحواس ہونے کے متوجہ ہونا مشکل ہوتا تھا۔ ساتھ ہی اس سلسلہ میں ایک بڑے خطرناک دھوکے پر متنبہ فرمایا گیا ہے، کہ اس شغل میں جو آواز سنائی دیتی ہے، وہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی کوئی صفت نہیں ہے، جیسا کہ بعضوں کو دھوکا ہو گیا ہے، بلکہ عالم غیب میں سے کسی مخلوق کی بھی کوئی صفت نہیں، صرف اس کے دماغ میں ہوا بند ہو کر متموج ہونے لگتی ہے۔ اشغال وغیرہ کے اس قسم کے آثار کو جو محض اپنے دماغ ہی کے آفریدہ تخیلات ہوتے ہیں، جاہل صوفیہ یا اشراقیہ خدا جانے کیا کیا سمجھنے لگتے ہیں، کہ عالم غیب کے اسرار ان پر کھل گئے ہیں، اور انہیں کو مقصود بلکہ معبود بنا لیتے ہیں۔

"حالانکہ جس طرح اس آواز کا محل دماغ ہے، اسی طرح کبھی دوسرے اشغال یا اذکار میں بھی مختلف الوان کے انوار جو نظر آنے لگتے ہیں، وہ اکثر اپنے ہی دماغ کی صورتیں ہوتیں ہیں۔ چنانچہ غیر شاغل بھی اگر اسی طرح آنکھیں بند کر کے دیکھے تو بعض اوقات اس کو بھی مختلف رنگ نظر آیا کرتے ہیں اس سے کبھی دھوکا نہ کھائے نہ ان چیزوں کی طرف التفات کرے بلکہ اگر واقعی عالم غیب کی چیزوں کا کشف ہونے لگے جیسا کہ کبھی کبھی یکسوئی میں ہو بھی جاتا ہے، تب بھی ہرگز ادھر متوجہ نہ ہو نہ اس سے لذت حاصل کرے، خواہ وہ مکشوفات ناسوت کے ہوں یا ملکوت کے، لیکن ہیں سب غیر مطلوب حتیٰ کہ حسب ارشاد حضرت مرشد (حاجی امداد اللہ) علیہ الرحمتہ حجاب ظلمانی سے حجاب نورانی اشد ہے،

طالب کو اس کی نفی کرنا اور اس مضمون پر نظر رکھنا چاہئے۔

عشق آن شعلہ است چون بر فروخت　　ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

تیغ لادر قتل غیر حق براند　　درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند

ماند الا اللہ و باقی جملہ سوخت　　مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت (ص ۱۴)

یہی نہیں کہ اشغال و مراقبات تصوف کے مقاصد نہیں' بلکہ چونکہ محض تدابیر ہیں' اس لئے جن اشغال و مراقبات میں مضرت کااحتمال ہے' ان کو سرے سے عوام کیا خواص کے لئے ممنوع و متروک قرار دیا ہے' مثلاً اشغال میں شغل رابطہ و تصور شیخ اور مراقبات میں مراقبہ وحدت الوجود بوجہ اس کے کہ اکثر خواص کو بھی مضر ہوتا ہے' متروک ہے' كما قال الله تعالى فى الخمر والميسر اذ كانا حلالين "اثمهما اكبر من نفعهما" (ص ۱۵)

تجدید تصوف کے دو اصل اصول : بانی حضرت کے تجدیدی و اصلاحی تصوف کی اصل الاصول دو ہی باتیں ہیں' جن سے بچنے کا ہر وقت اہتمام ضروری ہے' ایک غفلت جس کا علاج ذکر ہے' جس کا اوپر بیان ہوا' دوسرے معصیت۔ البتہ معاصی میں چونکہ عام دیندار اور علمائے ظاہر زیادہ تر کبائر اور وہ بھی جوارح کے معاصی ہی کو معاصی خیال کرتے ہیں' صغائر اور قلب یا باطن کے معاصی کی بالکل یا چنداں پرواہ نہیں کرتے اور صوفی کا خاص مقام احسان و حضور ہے' وہ صغائر و کبائر ظاہر و باطن ہر حال میں اور ہر جگہ حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر رائی و مرئی مشاہدہ کرتا ہے' اس لئے معصیت صغیرہ ہو یا کبیرہ' قلب سے ہو یا زبان سے یا ہاتھ پاؤں آنکھ کان سے سب سے بچنے کی کوشش کرتا ہے' کیونکہ

"غفلت سے قلب کی نورانیت برباد ہو جاتی ہے' اور معصیت سے علاوہ نور قلب فوت ہونے کے مقبولیت عند اللہ بھی زائل ہو جاتی ہے اور یہ بڑا خسارہ ہے"۔

لہٰذا اس کے اہتمام کی بہت زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے کہ

"اگر احیاناً غفلت سے یا نفس کی شرارت سے کوئی قولی یا فعلی معصیت سرزد ہو جائے، فوراً نہایت ندامت و عاجزی سے استغفار و توبہ کرے، بالخصوص بعض معاصی خصوصیت سے زیادہ مضر ہیں، ان سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام رکھے، ایک ریا دوسرے کبر، اور اسی سے گاہے تفاخر پیدا ہوتا ہے، خواہ کمال دنیوی پر ہو یا کمال دینی پر، تیسرے زبان سے کسی کی غیبت و شکایت یا کسی پر طعن و اعتراض، بلکہ اکثر فضول کلام بھی نورانیت قلب کو مضر ہوتا ہے، اس لئے طالب حق کو لوگوں سے زیادہ میل جول نہ کرنا چاہئے، مگر بضرورت چوتھے محل نامشروع میں رغبت و شہوت سے کسی کی طرف توجہ کرناخواہ آنکھ سے یا دل کے خیال سے، پانچویں بے جا یا اعتدال سے زیادہ غصہ کرنا یا بدخلقی و سختی کے ساتھ پیش آنا"۔
(قصد السبیل ص ۲۵)

خالی اشغال و مراقبات کو تصوف اور مقصود تصوف سمجھنے والے صوفیہ اور محض ظاہری بڑے بڑے گناہوں کو گناہ سمجھنے والے دیندار علماء دونوں کا حال پیش نظر رکھ کر پھر ایک مرتبہ اوپر کی سطریں پڑھو تو معلوم ہو گا، کہ تصوف کے معتقد و منکر دونوں نے نہ طریقت کو سمجھا نہ شریعت کو۔

نسبت باطن: جس کو اس کے دعویداروں نے ایسا چھپایا کہ خود ان سے بھی چھپ گئی، اس کی حقیقت و علامت بھی سن لیجئے، کہ یہ ذکر و طاعت کے کمال کے سوا کچھ نہیں۔

"نسبت باطن کے حصول کی علامت دو امر ہیں ایک یہ کہ ذکر اور یادداشت کا ملکہ ایسا ہو جائے کہ کسی وقت غفلت و ذہول نہ ہو، اور اس میں زیادہ تکلف نہ کرنا پڑے، دوسرے یہ کہ اطاعت حق یعنی اتباع احکام شرعیہ کی عبادات و معاملات، اقوال و افعال اور اخلاق میں ایسی رغبت اور منہیات سے ایسی نفرت ہو جائے جیسی کہ مرغوبات و مکروہات طبعیہ کی ہوتی ہے، اور دنیا کی حرص قلب سے

نکل جائے کان خلقہ القرآن اس کی شان بن جائے البتہ عارضی کسل یا وسوسہ جس کے مقتضیٰ پر عمل نہ ہو اس رغبت و نفرت کے منافی نہیں

لیکن خالی ملکہ یادداشت بھی نسبت کا اصل جزو نہیں یہ ملکہ تو معصیت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے اس لئے اصل چیز حق تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رضا ہے رضا بھی وہ معتبر ہے جو جانبین سے ہو یعنی صرف ہم ہی خدا سے راضی نہ ہوں بلکہ خدا بھی ہم سے راضی ہو جس کا ذریعہ ظاہر ہے کہ اطاعت و فرمانبرداری ہی ہو سکتا ہے ارشاد ہے

آج کل لوگ ملکہ یادداشت کو نسبت سمجھتے ہیں جو صرف ذاکر کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے اور جو معصیت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتی ہے حالانکہ نسبت مطلوبہ نام ہے اس لگاؤ اور تعلق کا جو جانبین سے ہو یعنی عبد کی طرف سے حق تعالیٰ کے ساتھ اطاعت و ذکر کا تعلق اور حق تعالیٰ کی طرف سے بندہ کے ساتھ رضا کا تعلق یہ ہے نسبت مطلوبہ [1]

کسی طالب کے استفسار پر نسبت کی حقیقت یہ تحریر فرمائی۔ کہ

نسبت کے لغوی معنیٰ ہیں لگاؤ اور تعلق کے اور اصطلاحی معنیٰ ہیں بندہ کا حق تعالیٰ سے خاص قسم کا تعلق یعنی اطاعت اور ذکر غالب کا، اور حق تعالیٰ کا بندہ سے خاص قسم کا تعلق یعنی قبول و رضا، جیسا کہ عاشق مطیع اور وفادار معشوق میں ہوتا ہے جب نسبت کے یہ معنیٰ معلوم ہو گئے تو ظاہر ہو گیا کہ فاسق و کافر صاحب نسبت نہیں ہو سکتا بعضے لوگ غلطی سے نسبت کے معنیٰ خاص کیفیات کو سمجھتے ہیں جو ریاضت و مجاہدہ کا ثمرہ ہوتی ہیں مگر یہ اصطلاح جہلاء کی ہے [2]

ایک بے معنیٰ بات یہ مشہور ہو گئی ہے کہ نسبت سلب کر لی جا سکتی ہے اس

---

(۱) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۴۵ - ۱۲ (۲) اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۵۲ - ۱۲

کے متعلق ایک ملفوظ میں ہے کہ

"ایک کام کی بات یاد آئی' یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں بزرگ کی نسبت سلب کر لی' حضرت مولانا رشید احمد صاحب (گنگوہی) نے فرمایا کہ نسبت قرب الٰہی کا نام ہے' اس کو کوئی سلب نہیں کر سکتا' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو چیز حق تعالٰی بندہ کو عطا فرمائیں' دوسرا کون ہے جو اس کو سلب کرے' حقیقت اس سلب کی صرف یہ ہے کہ کسی تصرف سے کسی کیفیت نفسانیہ کو مضمحل کر دے' جس سے نشاط کی جگہ عبادت ہو جائے' مگر اس کا وہ مقابلہ کر سکتا ہے' لیکن اگر مقابلہ نہ کیا تو عمل میں خلل پڑنے سے اس کا اثر نسبت تک پہنچ سکتا ہے" - (۱)

خالق کے ساتھ نسبت و تعلق درست کئے بغیر خدمت خلق درست نہیں : اسی نسبت کی بحث و تحقیق کے سلسلہ میں صوفی بننے بنانے کے دستور العمل بنام قصدا السبیل میں ایک اور ایسی ہدایت فرمائی ہے جس کو دینوی "قومیات و سیاسیات حاضرہ" کے اکھاڑے والے عوام و خواص لیڈر و ایڈیٹر تو کیا معنیٰ' خالص دینی مدارس واداارات والے علمائے دین تک قبول کرنا کیا سننا بھی مشکل سے گوارا فرمائیں گے! خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالٰی کے ساتھ یہ نسبت و تعلق کچھ پختہ و مستحکم نہ ہو جائے اس وقت تک قومی و سیاسی اکھاڑے میں کودنا تو الگ رہا' درس و تدریس' وعظ و ارشاد' تالیف و تصنیف کی دینی خدمات کی بھی فارغ البال و مستند عالم تک کو اجازت نہیں -فرمایا کہ

"منجملہ اس دستورالعمل کے ایک امر یہ بھی ہے کہ جب تک ایسے شخص کوجس میں کلام ہو رہا ہے کسی قدر رسوخ و استحکام کے ساتھ نسبت باطنی نصیب

---

(۱) الافاضات ۲۹ شعبان ۱۳۰۰ھ ۱۲

نہ ہو جائے' جب تک نہ تو افادہ ظاہری میں مشغول ہو' نہ افادہ باطنی پر اقدام کرے' یعنی نہ طلبہ کو پڑھائے' نہ عوام میں وعظ کہے' نہ مطب کرے' نہ تعویذ گنڈے کرنے لگے' بالکل زاویہ خمول میں پڑا رہے' الا ان یضطرالی شی من ذالک .... البتہ بعد حصول نسبت کے درس و وعظ یا تصنیف و تالیف کا مضائقہ نہیں' بلکہ یہ خدمت علم دین افضل عبادات ہے' اور اگر شیخ تعلیم و تلقین و بیعت کی بھی اجازت دیدے تو بندگان خدا سے اس افادہ میں بھی دریغ نہ کرے' اور اگر وہ اجازت نہ دے تو ہرگز ایسی جرات نہ کرے (ص ۱۶)

باقی جن "قومیات و سیاسیات" کا نام آج کل خدمت خلق رکھا گیا ہے ان میں پڑنے کا اندازہ تو اس سے فرمایئے کہ

"حضرت والا کے ایک صاحب اجازت کو لوگوں نے زبردستی میونسپلٹی کا ممبر تجویز کر دیا' انہیں سخت وحشت ہوئی' بالآخر یہ طے ہوا کہ اپنے پیر و مرشد سے پوچھ لو' .... حضرت نے تجویز فرمایا کہ جب تک نسبت مع الخالق راسخ نہ ہو تعلق مع الخلق بلا ضرورت سراسر مضرت ہے' اور جو منفعت سوچی جاتی ہے کہ ادائے حق خلق ہے' وہ حق خلق بھی جب ہی ادا ہوتا ہے' کہ نسبت مع الخالق راسخ ہو جائے ' ورنہ خالق کا حق ادا ہوتا ہے ' نہ خلق کا ' یہ تجربہ ہے اور ایک کا نہیں' بلکہ ہزاروں اہل بصیرت کا' ہم سے اور آپ سے زیادہ اہل تمکین نے ایسے تعلقات کو چھوڑ دیا ہے' حضرت ابراہیم بن ادہم بلخی و حضرت شاہ شجاع کرمانی کے واقعات معلوم ہیں' اور حضرات خلفائے راشدین پر اپنے کو قیاس نہ کیا جائے

کارپاکان راقیاس از خود مگیر" (۱)

ان حضرات کی نسبت مع الخالق کے رسوخ کے گرد کو بھی کون پا سکتا ہے"

---

(۱) اشرف السوانح حصہ دوئم' ص ۱۲۸ - ۱۳

مگر ہمارے اس زمانہ میں خصوصًا "لادینی قومیات و سیاسیات" والوں کی نقالی میں یہ فتنہ و ابتلا کچھ ایسا عام و عالمگیر ہو گیا ہے' کہ خود اپنی اور اہل و عیال کی صلاح و اصلاح سے پہلے ساری خلق و خدائی کی اصلاح و خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' دوسروں کا تو ذکر ہی کیا' خود حضرت علیہ الرحمتہ کے بعض صاحب علم اچھے اچھے مجازین و معتقدین تک کو ایسا معلوم ہوتا ہے' کہ اس ہدایت کی صحت ہی میں کلام ہے' یا سرے سے اس کو ناقابل عمل تصور فرمایا جاتا ہے۔ کئی کئی دینی و علمی ادارات سے راعی و رعایا کی مسئولیت کا تعلق ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت سی ایسی رائج الوقت خدمات کا بوجھ اپنے دوش پر قبول فرما رکھا ہے' کہ جن کے حقوق کا پورا کرنا کیسا ان کے معاملات سے ضروری آگاہی کی بھی فرصت نہیں۔

اس قسم کے تلخ تجربوں کی تلخ نوائی محض یہ واضح کرنے کے لئے ہے کہ ہمارے جماعتی کاموں میں جو ہر جگہ فساد ہی فساد نظر آتا ہے' اس کا سبب سب سے بڑا یہی ہے' کہ خلق کا یہ حق جب ہی ادا ہو سکتا ہے' جب خالق کے ساتھ نسبت و تعلق کچھ درست و راسخ ہو' اور عند اللہ مسئولیت کا خوف و خیال دل پر غالب ہو' اور عہدوں اور ذمہ داریوں کو آج کل کی طرح زیادہ تر جاہی و مالی منافع کے لئے نہ قبول کیا جائے۔

مجاہدہ: ذکر اس کا تھا کہ اشغال و مراقبات وغیرہ تصوف کے مقاصد نہیں' تدابیر ہیں' یہی حال مجاہدات اور ترک تعلقات کا بھی ہے' کہ وہ مقصود و مامور اعمال و طاعات یا قرب و رضا کی راہ کی جدوجہد سعی و تدابیر کا نام ہیں' خود مقصود نہیں، مجاہدہ کی حقیقت نفس کی مخالفت کی مشق و عادت ہے کہ حق کی رضا و طاعت کے مقابلہ میں نفس کی جانی و مالی و جاہی خواہشات اور مرغوبات کو مغلوب رکھا جا سکے جس کی قرآن نے جامع تعبیر جہاد بالنفس والاموال سے فرمائی ہے اور اسی مجاہدہ پر ہدایت کا قطعی وعدہ ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم

سبلنا - اور حضرت جامع المجددین کے جامع الفاظ میں اس مجاہدہ کی تجدید و تحقیق یہ ہے - کہ

"نفس کے مطالبات دو قسم کے ہیں، حقوق اور حظوظ، حقوق وہ جن سے قوام بدن اور بقائے حیات ہے، اور حظوظ وہ جو ان سے زائد ہوں پس مجاہدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق کو باقی رکھے، اور حظوظ کو فانی کرے" -

اس میں جس طرح ایک افراط کی بے اعتدالی یہ ہے کہ ساری زندگی حظ نفس کی نذر کر دی جاتی ہے، اسی طرح تفریط کی بے احتیاطی یہ ہے کہ بہتوں نے مجاہدہ کا مطلب جوگیوں اشراقیوں کی طرح یہ سمجھ رکھا ہے کہ حقوق نفس کو بھی فنا کر دیا جائے، بلکہ روحانی نجات نام اسی کا رکھ لیا ہے کہ اس مادی و جسمانی زندگی ہی میں مادی و جسمانی حاجات سے نجات حاصل کر لی جائے -

"آج کل صوفی بھی اس میں مبتلا ہیں، کہ جس قدر نفس کی مخالفت ہو گی، خدا زیادہ راضی ہوں گے، اگرچہ وہ مخالفت نفس شریعت کے خلاف بھی ہو، چنانچہ بعضوں کو خبط ہو گیا ہے کہ اپنے اوپر گوشت حرام کر لیتے ہیں، اسی طرح بعضے سرد پانی نہیں پیتے، بعضے چارپائی پر نہیں سوتے، اور بعضے جن کو دولت اسلام نصیب نہیں یہاں تک بڑھ گئے کہ اپنے اعضاء تک سکھلا دیتے ہیں، میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ گرمی کے ایام میں چاروں طرف سے آگ جلا رکھی ہے اور بیچ میں خود بیٹھا ہے، یہ سب جہل کی باتیں ہیں -

لیکن اس سے ان لوگوں پر شبہ نہ کیا جائے، جنہوں نے نفس کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے مجاہدے کئے ہیں، اول تو وہ حضرات حد اباحت سے تجاوز نہ کرتے تھے، پھر وہ بھی بطور علاج کرتے تھے، عبادت و ذریعہ قرب نہیں سمجھتے تھے، جیسے کوئی شخص کسی مرض کی وجہ سے چند کھانے برائے چندے چھوڑ دے، کہ وہ اس کو عبادت نہیں سمجھتا، بلکہ ذریعہ حصول صحت سمجھتا ہے، اور اگر کوئی اس کو ثواب سمجھ کر کرے، تو وہ یقیناً گنہگار ہو گا، کہ اس نے قانون شریعت میں ایک

دفعہ کا اضافہ کیا' اور بدعت کے قبح کا یہی راز ہے' لیکن ان حضرات نے صرف بطور علاج کے ترک کیا' بخلاف جہلا کے کہ اس کو دین و عبادت اور ذریعہ قرب سمجھ کر کرتے ہیں -

بہرحال نفس کو راحت پہنچانا اور اس کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے' اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر چیز کی حد مقرر کر دی ہے' حضرت ابودرداءؓ صحابی رات کو بہت جاگتے تھے' حضرت سلمانؓ نے ان کو روکا' آخر مقدمہ جناب نبوی میں گیا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلمان سچ کہتے ہیں اور یہ ارشاد فرمایا ' ان لنفسک علیک حقا الخ -

(الرفیق فی سواء الطریق ص ۲۴ ' ۲۳)

"افسوس تصوف کا ناس کر دیا ' ان جاہل صوفیوں نے اور فقیری کو ہاؤ بنا رکھا ہے' کہتے ہیں' چلے کھینچو' بیوی کو طلاق دے دو' اولاد کو عاق کر دو' دروازہ کو تیغا کر دو' چالیس چنے رکھ لو' اور ایک چنا روز کھاؤ' بدون اس کے اصل فقیری ملتی نہیں' میں کہتا ہوں واللہ دو شالوں میں گدے تکیوں میں' سلطنت میں' مرغن غذاؤں میں فقیری ملتی ہے' مگر گھر میں نہیں شیخ کامل کی خدمت میں " - (اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۶۱)

"اور فرمایا کہ درویش کے لئے کمبل اور گدڑی کی ضرورت نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ دے تو دو شالہ اور شاہی میں بھی درویشی حاصل ہو سکتی ہے' بشرطیکہ طریقہ سے حاصل کی جائے" - (۱)

واقعی کسی حقیقت شناس نے خوب کہا ہے کہ حضرت کا سلوک تو شاہی سلوک ہے' نہ ریاضات کراتے ہیں' نہ مجاہدات' نہ ترک تعلقات کراتے ہیں' نہ ترک لذات و مباحات' بلکہ فرماتے ہیں' خوب راحت و آرام سے رہو تاکہ اللہ تعالیٰ کی

---

(۱) سوانح ص ۲۳ و ص ۳۳۱ - ۱۲

محبت قلب میں پیدا ہو' اور طبیعت میں نشاط رہے' جو معین عبادت ہو ۔ البتہ معصیت کے پاس نہ پھٹکو اور نفس کی ہر وقت نگرانی رکھو' نہ کم کھانے کی ضرورت' نہ کم سونے کی' یہ دونوں مجاہدے آج کل متروک ہیں' کیونکہ طبائع میں پہلے ہی سے ضعف غالب ہے' ہاں کم بولنا اور کم ملنا جلنا ضروری ہے' لیکن نہ اتنا کہ جس سے قلب میں انقباض پیدا ہو جائے" یہی نہیں' بلکہ یہ شاہی سلوک شاہی سڑک بھی ہے' جس پر ہر خاص و عام بے کھٹکے چل سکتا ہے' کیا عالم کیا عامی' کیا فارغ کیا مشغول' کیا تندرست کیا بیمار' کیا قوی کیا ضعیف' کیاامیر' کیا غریب' اور یہی اصل معنی ہیں دین کے یسر کے' اس لئے کہ اس میں انفرادی و سعت و استطاعت سے ایک ذرہ زائد کی تکلیف نہیں' نہ ملکی آزادی پر منحصر نہ حکومت الہیہ پر ۔

بلاضرورت مشقت کا نام مجاہدہ نہیں : غرض مجاہدہ کے معنی نفس کو اس کے حقوق تک سے محروم کر کے خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالنے کے بالکل نہیں' بلکہ جہاں تک ہو سکے بلا ضرورت نفس کو مشقت میں ڈالنے کے بجائے سہولت و راحت کا راستہ اختیار کرنا چاہئے' فرمایا

> "طریق میں مقصود حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں' ایک مشکل' ایک سہل' تو سہل کو کیوں نہ اختیار کیا جائے' ایک صاحب نے عرض کیا کہ کچھ مجاہدہ بھی تو درکار ہے' فرمایا مجاہدہ سے مراد یہ تھوڑا ہی ہے' کہ مشقت یا سختی میں پڑو' ایک کنواں یہاں مدرسہ میں ہے' ایک جلال آباد میں' جو دو ڈھائی میل ہے ۔ تو کیا آپ اس کو افضل سمجھیں گے' کہ مثلاً وضو کے لئے پانی وہاں سے لایا کریں' مجاہدات وریاضات مقصود بالذات تھوڑا ہی ہیں' مقصود کے معین ہیں' اصل چیز تو مقصود تک پہنچ جانا ہے" ۔ (۱)

جس کے لئے ترک لذات بھی نہیں' صرف تقلیل لذات کافی ہے ۔

---

(۱) الافاضات الیومیہ یکم رمضان ۱۳۵۰ھ ۔ ۱۲

زہد کی حقیقت: "ایک اہل علم نے سوال کیا کہ زہد کی بڑی فضیلت ہے' فرمایا زہد ترک لذات کا نام نہیں' محض تقلیل لذات کافی ہے' یعنی لذات میں انہماک نہ ہو' کہ رات دن اسی فکر میں رہے' کہ یہ چیز پکنی چاہئے' وہ چیز منگانی چاہئے' کہیں کے چاول اچھے ہیں تو وہاں سے چاول آ رہے ہیں' کہیں کی بالائی مشہور ہے تو کہہ رہے ہیں کہ بھائی وہاں سے بالائی لیتے آنا' نفیس نفیس کھانوں' اور کپڑوں ہی کی فکر میں لگے رہنا' یہ البتہ زہد کے منافی ہے' ورنہ اگر بلا تکلف اور بلا اہتمام خاص کے لذات میسر آ جائیں' تو یہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے' شکر کرنا چاہئے۔

خاص مشہور مجاہدات اربعہ یہ ہیں' قلت طعام' قلت منام' قلت کلام' قلت خلط مع الانام' ان میں بھی اول تو مقصود تقلیل ہی ہے' وہ بھی بشرط ضرورت اور بقدرت ضرورت' ورنہ

بہت کم کھانا بھی زہد نہیں' نہ یہ مقصود ہے' کیونکہ ہمارے کم کھانے سے نعوذ باللہ کوئی خدا تعالیٰ کے خزانہ میں توفیر تھوڑا ہی ہو جائے گی ہاں اتنا بھی نہ کھائے کہ پیٹ میں درد ہو جائے' ہمارے حاجی (امداد اللہ) صاحب کا مذاق تو یہ تھا' کہ نفس کو خوب آرام سے رکھے' لیکن اس سے کام بھی خوب لے' میرا تو خیال ہے کہ مزدور خوش کندکار بیش ' جس دن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اچھی چیز پکی ہے' اس دن کام کرتے وقت یہ خوشی رہتی ہے کہ فارغ ہو کر اچھی چیز کھانے کو ملے گی' نفس کے واسطے کوئی ابھارنے والی چیز ضرور ہونی چاہئے' حضرت حاجی صاحب نے ایک روز فرمایا کہ میاں اشرف علی پانی ہمیشہ ٹھنڈا پینا چاہئے' کہ ہر بن منہ سے الحمد للہ نکلے' ورنہ گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی' دل شریک نہ ہو گا" (ا)

(ا) اشرف السوانح ص ۱۱۸۔ ۱۲

تقلیل سے بھی مراد حضرت کے ہاں شیخ کامل کی تعلیم کے موافق ان چار چیزوں میں محض توسط و اعتدال ہے کہ "نہ اس قدر کثرت کرے جس سے غفلت و قساوت و کاہلی پیدا ہو' نہ اس قدر قلت جس سے صحت و قوت زائل ہو جائے (2) بڑی دولت اس طریق میں قلب کی جمعیت و یکسوئی ہے' اس لئے قلب کو تشویش و پریشانی سے بچانا بہت ضروری ہے' جس کا ایک بڑا سبب خود اپنی بے عنوانیوں سے صحت کو خراب کر لینا بھی ہے۔

"اس لئے صحت کی بہت حفاظت کرے' دماغ اور قلب کی تفریح و تقویت ہمیشہ غذاءً و دواءً کرتا رہے' غذا میں نہ اتنی کمی کرے' کہ ضعف و یبوست ہو جائے' نہ اس قدر افراط کی ہضم میں فتور ہو جائے' .... جب تک صادق رغبت نہ ہو کھانا نہ کھائے' اور ایک آدھ لقمہ کی اشتہاء باقی رہنے پر چھوڑ دے' .... اسی طرح سونے میں اعتدال رکھے' نہ بہت زیادہ سوئے کہ کسل ہو' نہ بہت کمی کرے کہ یبوست ہو جائے"۔

اور خلط مع الانام میں' جس طرح لوگوں سے زیادہ ملنا جلنا اور دوستی بڑھانا مضر ہے' اسی طرح خواہ مخواہ دشمنی خریدنا بھی برا ہے کہ

"دوست تو اس پر ہجوم کر کے اس کے وقت کو مشوش کریں گے' اور دشمن ایذائیں پہنچا کر پریشانی میں ڈالیں گے .... البتہ اگر کوئی تشویش بلا اس کے اکتساب و ارتکاب کے پیش آ جائے یا اس نے کسی شرعی ضرورت سے کام کیا' اس میں تشویش پیش آگئی' مثلاً سود خوار سے ہدیہ لینے سے انکار کیا' اور وہ دشمن ہو گیا' تو یہ مضر نہیں' نہ اس میں مضطر ہو' حق تعالیٰ پر نظر و توکل رکھے' وہ مدد فرمائیں گے' اور اگر کچھ تکلیف ہی پہنچے' تو حکمت آلہیہ سمجھ کر راضی رہے' وہ اس کے لئے زیادہ موجب قرب ہے' (تعلیم الدین ص ۱۹)

---

(۲) تعلیم الدین ص ۴۷ - ۱۲

اسی سلسلہ میں ایک بات اور بھی یاد رکھنے کی ہے کہ

"مال کی حرص اور اس کے جمع کرنے کی فکر یا موجودہ ذخیرہ کو اسراف کر کے اڑا ڈالنا' دونوں کا انجام تشویش قلب ہے' حریص تو ہر وقت اسی دھن میں لگا رہے گا' اور مسرف ذخیرہ ختم ہونے کے بعد آخر پریشانی میں مبتلا ہو گا ' یا پرائے مال پر نگاہ ڈالے گا'

(تعلیم الدین ص ۱۸)

غیر اختیاری مجاہدہ: مجاہدہ کے باب میں ایک بڑے فائدہ کی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ مجاہدہ صرف اس مخالفت نفس کا نام نہیں' جو قصد و اختیار سے یا صوفیانہ مروج طریقوں سے کی جائے' بلکہ دنیا میں بلا ہمارے قصد و اختیار کے ہمارے خلاف جو دن رات واقعات پیش آتے رہتے ہیں' اور ان سے ہم کو جو رنج و غم و اضطراب طبعًا لاحق ہوتا رہتا ہے' وہ سب سے بڑا مجاہدہ ہے۔

"سالکان طریق نے حزن غم کو اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ قرار دیا ہے' کہ اس سے نفس کو پستی و شکستگی حاصل ہوتی ہے' جو کہ آثار عبودیت سے ہے۔

اے دل اندر بندز لفش ازپریشانی منال مرغ زیرک چون بدام افتد تحمل بایدش

" ابو علی دقاق رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں' صاحب الحزن یقطع من طریق اللہ تعالی مالا یقطع من فقد حزنہ سنینا یعنی حزن و غم والا اللہ تعالیٰ کی وہ راہ طے کر جاتا ہے جو اس سے محروم سالہا سال میں نہیں طے کر پاتا ۔ (1)

---

(۱) قصد السبیل ص ۱۸۔ ۱۲

مجاہدہ سے استیصال رذائل نہیں ہوتا: اسی طرح مجاہدہ و ریاضت کے متعلق یہ بھی بڑے پتہ کی بات ہے' کہ اس سے یہ نہ امید رکھنا چاہئے' کہ نفس کی مخالفت کر کے رذائل نفس کی جڑ ہی کٹ جائے گی' یا ان کا بالکلیہ ازالہ ہو جائے گا۔ محض ان کا رخ بدل جاتا ہے۔

"ریاضت سے اخلاق ذمیمہ کے اصول کا ازالہ نہیں ہوتا' بلکہ ان کی تہذیب ہو جاتی ہے' جس کا حاصل یہ ہے کہ ان اصول کے آثار کا امالہ ہو جاتا' یعنی ان اخلاق کا مصرف بدل جاتا ہے' مثلاً کسی میں بخل و غضب موجود ہے تو ریاضت سے اس کی جڑ نہیں جاتی۔ کہ سرے سے غضب اور بخل ہی نہ رہے' بلکہ تہذیب اس طرح ہو جاتی ہے' کہ پہلے مواقع خیر میں بخل' اور نیک لوگوں پر غصہ کرتا تھا' اب نامشروع جگہ بخل کرے گا' اور مبغوضان الہی اور اپنے نفس پر غصہ کرے گا' اس طرح جو بعد کے اسباب تھے' وہ قرب کا سبب بن گئے' اور اس سے اس اختلاف کا بھی فیصلہ ہو گیا' کہ ریاضت سے تبدیل اخلاق ہو سکتی ہے یا نہیں' معلوم ہو گیا کہ تبدیل اصول تو نہیں ہو سکتی' جیسا کہ حدیث میں ہے' اذا سمعتم برجل زال عن جبلتہ فلاتصد قوہ ' البتہ تبدیل آثار و مصارف ہو سکتی ہے' اس لئے مجاہدہ و ریاضت کا حکم ہے"۔

نفس میلان و خواہش کے ازالہ کی خواہش ایسی ہی ہے' جیسے کوئی اکل حرام سے بچنے کے لئے یہ خواہش کرے کہ اس کو سرے سے بھوک ہی نہ لگا کرے۔

"کسی نے خواہش نفسانی سے نجات پانے کا علاج پوچھا' تحریر فرمایا کہ کل کو حرام غذا سے توبہ کر کے یہ دعا کرتا کہ بھوک ہی سے نجات ہو جائے "(سوانح حصہ دوم ص ۱۳۱)

ایک اور ضروری تنبیہ: یہ فرمائی گئی کہ مجاہدہ و ریاضت کے اس حکم کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالٰی اس کے پابند ہیں' بغیر اس کے کبھی کچھ عطا نہیں فرماتے' بلکہ یہ قید یا پابندی صرف بندہ کے لئے ہے۔

"بے شک ریاضت و مجاہدہ کی بدولت روحانی حیات حاصل ہوتی ہے' اور اس کی قید بندہ کے لئے ہے جس کو اس کی کوشش کرنا چاہئے لیکن حق تعالی اس کے مقید نہیں' وہ قادر ہیں' کبھی ایسا بھی کر دیتے ہیں' کہ بدون مجاہدہ و ریاضت کے محض اپنے فضل سے دولت باطنی و حیات روحانی عطا فرما دیتے ہیں' وہ بے چوں وچگوں ہیں' ان کے کاموں کی کیفیت و طریقہ کون متعین کر سکتا ہے' کہ اس طرح ہوتا ہے۔

"اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہئے' کہ کبھی پہلے ریاضت ہوتی ہے' پھر وصول الی اللہ میسر ہوتا ہے' اس کو طریق سلوک کہتے ہیں' اور کبھی وصول الی اللہ پہلے ہو جاتا ہے' پھر عبادت و ریاضت کا شوق ہو جاتا ہے' اسی کو طریق جذب کہتے ہیں' کہ اول کسی کامل کی صحبت یا کسی بزرگ کی حکایت سننے سے یا بلا کسی ظاہری وجہ کے قلب میں ایک قسم کی کشش و کیفیت حق تعالی کے ساتھ پیدا ہو گئی' پھر بتدریج سلوک کی تکمیل کرتا رہا"۔

تفصیل سلوک و ریاضت: کا مطلب یہ ہے توبہ' صبر و شکر' خوف و رجاء' زہد و توکل' توحید' محبت و شوق' اخلاص و صدق وغیرہ کے مقامات کو ایک ایک کر کے مختلف ریاضات و مجاہدات سے حاصل کیا جائے اور شہوت و غضب حقد و حسد' بخل و حرص' عجب وریا' کبر و غرور' حب دنیا' حب جاہ' آفات لسانی وغیرہ مختلف رذائل کو مختلف مجاہدات و معالجات سے دور کیا جائے' ظاہر ہے کہ یہ کتنا دور دراز اور وقت طلب راستہ ہے' خصوصًا اس کم ہمتی و کم فرصتی کے زمانہ میں تو حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کی یہ بڑی ہی اہم تجدید ہے' کہ

"اس تفصیلی علاج میں ہر وقت تین سوہان روح تیار ہیں' ماضی کی حسرت حال کے شبہات اور مستقبل کا خوف' جب محققین مجددین و مجتہدین (ومنهم اكملهم مرشدى رحمته الله عليه) نے دیکھا' بلکہ حق تعالی نے الہامًا ان کو دکھایا' کہ اس طریق سے بعض اوقات۔ ع۔

تا تو من می رسی من بخدامی رسم

کا معاملہ ہو جاتا ہے' پھر اہل زمانہ کی قوتیں ضعیف' ہمتیں قاصر' تو ان سب امور پر نظر کر کے ایک دوسرا طریق ترتیب اختیار فرمایا' کہ ماضی و مستقبل سب حجاب عن الحق ہیں' اور حق تعالیٰ نے اپنے مشاہدہ کے لئے پیدا کیا ہے' نہ کہ ماضی و مستقبل کے مطالعہ کے لئے ولنعم ما قال الرومی ماضی و مستقبلت پردہ خداست البتہ توبہ کی ضرورت سے ماضی پر اور عزم کی ضرورت سے مستقبل پر نظر ضروری تھی ' لیکن ضروری کے لیے بقدر ضرورت اتنا کافی ہے' کہ گزشتہ گناہوں سے موافق شرائط خوب توبہ کر کے پھر بار بار دل میں ان کا سبق نہ دہراتا رہے' اور مستقبل کے لئے اللہ پر بھروسہ کر کے اس کا قصد کرے کہ انشاء اللہ پھر یہ گناہ نہ کروں گا' اس کے بعد ہر وقت اس قصہ میں نہ لگا رہے -

"اس سے زیادہ دوسرا کام ہے' جس کو حدیث میں ان لفظوں میں تعبیر فرمایا گیا ہے' راقب اللہ تجدہ تجاھک (اللہ کا دھیان رکھو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے) بس اس کام میں لگ جانا چاہئے' یعنی ذکر و فکر اور عمل کے وقت عمل میں کہ وہ بھی ذکر میں داخل ہے' خلاصہ یہ کہ قرب کو مقصود سمجھے اور جو طریق اس کے لئے مقرر ہے' یعنی عقائد کی تصحیح کے بعد اعمال اختیاریہ کہ جس وقت کا جو عمل ہو' خواہ ظاہری مثل صلوٰۃ و زکوٰۃ ' خواہ باطنی جیسے خوف و رجا' شکر و صبر وغیرہ' بس اس میں مشغول رہے' اور جو بعد کے اسباب ہیں' یعنی ظاہری و باطنی معصیت اس سے مجتنب رہے' نہ اس کی ضرورت ہے' کہ اسباب قرب میں ملکہ پیدا کرنے کی فکر کرے' نہ اس کی حاجت کہ اسباب بعد کے مادہ کو منقطع کرے -

"بس امور اختیاریہ میں جس میں کوتاہی ہو جائے' اس کو مضر و مہتم بالشان سمجھے' اور اس کی اصلاح کرے' اور امور غیر اختیاریہ کے وجود و عدم پر التفات بھی نہ کرے' اور اصلاح میں بھی زیادہ کاوش نہ کرے' مثلاً اگر کسی ضروری عمل میں خلل ہو گیا' اس کی قضا یا تلافی کرے' اگر کوئی امر منکر صادر ہو گیا' اس

سے استغفار کرے' اور پھر اپنے کام میں لگ جائے' اسی ایک بات کے پیچھے نہ پڑ جائے' کہ ہائے یہ کام مجھ سے کیوں ہوا' یا یہ کام کیوں نہیں ہوا' یہ غلو و مبالغہ ہے' جس سے کتاب و سنت میں منع فرمایا ہے' لاتغلوا فی دینکم من شاق شاق اللہ علیہ سددوا وقاربوا و استقیموا ' حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں - ع

بخت می گیرد جہاں بر مردمان سخت گیر

اور اسی غلو و مبالغہ کا اثر خصوصًا اسوقت کے قوی اور ہمتوں پر یہ ہوتا ہے' کہ بہت جلد مایوسی اپنا رنگ لاتی' اور سالک کو معطل کر دیتی ہے اور کبھی جان پر کبھی ایمان پر اس کا اثر پہنچتا ہے' جان پر تو یہ کہ صحت خراب ہو جاتی ہے' اور ایمان پر یہ کہ باوجود عمل و علاج میں اتنی شدید کوشش کے جب وہ کامیابی میسر نہیں ہوتی' جس کو ہم نے کامیابی فرض کر لیا ہے' یعنی شفائے مطلق یا اس میں تاخیر ہوتی ہے تو حق تعالٰی سے تنگی و شکایت پیدا ہو کر کراہیت و ناراضی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' کہ ہم کو اتنے دن مجاہدہ میں سر مارتے ہو گئے' مگر والذین جاھدوا کے وعدے خدا جانے کہاں گئے -

"ایک اور مرض لگ جاتا ہے کہ اپنے عمل کو بالغ' اور اپنی سعی کو بالغ سمجھ کر ہر وقت ثمرات کا منتظر رہتا ہے' پس اپنے عمل کا پلہ حق تعالٰی کی عطا سے بڑھا ہوا سمجھتا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی اپنے کو کامیاب نہیں سمجھتا' اس لئے ناشکری میں مبتلا رہتا ہے' اور اگر بزعم خود کامیاب بھی ہو گیا' اور پھر وہ کامیابی زائل ہو گئی' کیونکہ ایسے انقلابات عمر بھر رہتے ہیں' تو پھر وہی تنگی و پریشانی شروع ہو جاتی ہے' اس طرح یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا' اور خود اس کا نفس یا اس کو دیکھ کر دوسروں کا نفس کہتا ہے کہ اس راہ خدا سے خدا کی پناہ جس میں بجز مصیبت کے راحت کا نام نہیں - (۱)

---

(۱) اصول الوصول ص ۷ ۳' بحوالہ تسہیل الریاضت منقول عن الابتلا لاہل الصفاء ص ۲۹ تا ص ۳۳ ' ۴۱

ان مفاسد و خطرات کی بناء پر نہایت تاکید کے ساتھ جا بجا ہدایت فرمائی گئی ہے' کہ اس غلو و مبالغہ اور ان تدقیقات و تعمقات میں ہرگز ہرگز نہ پڑے حتیٰ کہ

"اگر کوئی محمود وارد آئے' تو نہ اس کو کمال سمجھے' نہ اس کے بقا کی تمنا کرے' نہ اس کے فوت پر حسرت' اسی طرح اگر کوئی وسوسہ پیدا ہو' اس کے دفعہ میں بھی تن دہی نہ کرے' بس ذکر کی طرف وہ بھی سرسری طور پر متوجہ ہو جائے' کہ نہ دفع ہو نہ سہی' یعنی ذکر قرب کے قصد سے کرے' نہ کہ وسوسہ دفع کرنے کے قصد سے' خلاصہ یہ کہ حق کی رضا کا طالب اور ناراضی سے ہارب رہے' یہ رضا و ناراضی منحصر ہے اوامر کے عمل' اور نواہی کے اجتناب پر' عمل اگر فوت ہو' تو قضا کرے' اور نہی کا ارتکاب ہو تو استغفار کرے' نہ اپنے کو خواص میں سمجھے' کہ عامیوں کی سی اپنی حالت سے گھبرائے' اور نہ دنیا میں ثمرات کا' اور نہ آخرت میں مراتب عالیہ کا طالب رہے' بس اس کی دعا کرتا رہے' کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اعمال کی توفیق اور آخرت میں جنت عطا فرمائیں اور دوزخ سے نجات بخشیں' بس ہو گیا مسنون سلوک "۔ (۱)

"ایک شبہ : اب اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر محض وسوسہ یا معصیت کا محض میلان مضر نہیں' ان پر عمل مضر ہے تو اس کے لئے مجاہدہ کی کیا ضرورت ۔

"جواب یہ ہے کہ واقعی اس کے لئے مجاہدہ فرض و واجب نہیں' صرف یہ نفع ہے کہ معصیت کے میلان کا مقابلہ کرنے میں زیادہ تعب و تکلیف نہیں ہوتی' آسانی سے آدمی نفس پر غالب آ جاتا ہے' اور غیر مجاہد دشواری سے' بس یہ فائدہ ہے مجاہدہ میں' یہ نہیں کہ سرے سے میلان جاتا رہتا ہو' اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں' کہ گھوڑا شائستہ ہو کر بھی کبھی کبھی شرارت و شوخی کرتا ہے' مگر بوجہ شائستگی کے جلد رام ہو جاتا ہے' بخلاف غیر شائستہ کے کہ اس کے رام کرنے

---

(۱) اصول الوصول بحوالہ تسہیل الریاضت منقول عن الابتاء لاہل الصفاء ۲۹ تا ص ۳۳ ۔ ۱۲

میں بہت مشکل لاحق ہوتی ہے" (ا)

تفصیلات بالا سے ان مجاہدات و ریاضات کی حقیقت و ضرورت' ان کے مفاسد و خطرات سب پوری طرح واضح ہو گئے' جن کو بہت سے مسلمان نافہم صوفیہ نے بھی اشراقیوں اور جوگیوں کی طرح ان کے زیر اثر اسلامی تصوف کا بھی اصل مقصود بنا رکھا ہے -

مجاہدہ کا اصل ثمرہ کیفیات نہیں -: اب ذرا ان واردات و کیفیات' توجہ و تصرفات' کشف نہ کرامات' مواجید و لذات کی حیثیت و حقیقت غور سے سن لیں' جن کو ان مجاہدات و ریاضات کے اصلی ثمرات قرار دے لیا گیا ہے - خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح مجاہدات بذات خود مقصود نہیں' اسی طرح ان کے یہ ثمرات بھی نہ مقصود بالذات ہیں' اور نہ ان کا مجاہدات پر مرتب ہونا لازم ہے' اور جس طرح مجاہدہ و ریاضت کی حیثیت تدبیر و علاج کی تھی' اسی طرح ان ثمرات کی حیثیت صحت کی ہے' کہ صحت سے بھی اصل مقصود و مقاصد زندگی کی تکمیل یا نشاط و سہولت کے ساتھ تکمیل ہے' جیسے مرچ کہ وہ غذا نہیں' مگر غذا میں اس سے لذت پیدا ہو جاتی ہے -

"فرمایا آج کل لوگ کیفیات کے پیچھے پڑے ہیں' جو کہ غیر مقصود ہیں گو یہ کیفیات غیر مقصودہ لذیذ ہوتی ہیں' جیسے مرچ کہ تغذیہ میں غیر مقصود ہے' مگر لذیذ ہے' اور اب تو لوگ ان کیفیات ہی کو مقصود سمجھ کر گویا نری مرچوں کا ہی سالن کھاتے ہیں' بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر روپیہ کا سکہ خوبصورت نہ ہو' پھر بھی چونسٹھ ہی پیسے ملیں گے' اور سیسہ یا رانگہ کا ٹکڑا گو بہت چمکدار اور خوبصورت ہو' مگر بازار میں نہ چلے گا' اسی طرح بازار آخرت میں کیفیات یا لذات جو حقیقت کے اعتبار سے سیسے یا رانگے کے ٹکڑے ہیں وہاں نہ چلیں (ا) گے" -

---

(ا) اصول الوصول بحوالہ تسہیل الریاضت منقول عن الابتلاء لاہل الصفاء ص ۲۹ تا ص ۳۲ - ۱۲

"واردات غیبیہ یا ذوق و شوق اصل ثمرہ نہیں' تربیت کا محض ایک ذریعہ ہے' وہ بھی بعض کے لئے غیبی طور پر' اور دوسرا ذریعہ تربیت کا بلا مواجید کے صرف ہمت سے کام لینا ہے - (۲)

تصوف کی حقیقت دو جملوں میں: یہ واردات و کیفیات دراصل انفعالات ہیں اور طریق میں افعال مقصود ہیں' انفعالات نہیں' حضرت علیہ الرحمہ نے ایک "مولوی صاحب" کو انہی دو جملوں میں تصوف کی حقیقت بتلا دی تھی' مگر انہوں نے قدر نہ کی' آخر مولوی صاحب تھے - جن لوگوں میں تاثر و انفعال زیادہ ہوتا ہے قدرةً ان میں کیفیات بھی زیادہ ہوتی ہیں' یہاں تک کہ بعضوں میں یہ تاثر و انفعال محویت و استغراق تک پہنچ جاتا ہے اور لوگ -

"استغراق کو بڑی چیز سمجھتے ہیں' کہ جب تک ہم بے عقل و مدہوش نہ ہوئے تو کمال ہی کیا ہے' صاحبو! اللہ تعالیٰ کا نام ہوش بڑھانے کے لئے لیا جاتا ہے' نہ کہ کھونے کے لئے .... خواجہ عبیداللہ احرار فرماتے ہیں کہ استغراق میں قرب نہیں بڑھتا' کیونکہ اس میں عمل نہیں ہوتا' جو مدار قرب ہے" - (۳)

پھر ان کیفیات پر دھوکا ہو جاتا ہے روحانی کیفیات کا' حالانکہ اکثر صورتوں میں وہ محض نفسانی کیفیات ہوتی ہیں' اور ان میں تمیز کاملین ہی کا کام ہے' بلکہ

"حقیقت میں جو ذی استعداد کامل ہیں' ان پر نفسانی کیفیات طاری نہیں ہوتیں' ہاں روحانی جن کا اثر روح پر ہوتا ہے' کاملین پر طاری ہوتی ہیں' جن کا عوام کو پتہ بھی نہیں' اور ان دونوں میں فرق جیسے گڑ اور فیرینی کی شیرینی میں ہوتا ہے - چمار کسی کی بے گار میں گئے' اس نے فیرینی کھلائی' تو ناک مار کر کھا تو لی'

---

(۱) الافاضات الیومیہ حصہ اول ص ۴۰ - ۱۲

(۲) اصول الوصول ص ۳۰ - ۱۲

(۳) وعظ دواء الضیق ۱۲

مگر چوہدری کہتا ہے یہ تھوک سی کیا ہے' اس کو مٹھائی معلوم ہی نہیں ہوئی' اس نے کبھی فیرینی کی بو بھی نہیں سونگھی تھی' اس کے نزدیک تو مٹھائی بس گڑ تھا' تو واقعی جو سالکین کیفیات کے متمنی ہیں' وہ دیہاتی گڑ خوار ہیں' میں تو کہتا ہوں کام میں لگو' کیفیات کی ہوس چھوڑ دو' پھر دیکھئے کہ ایک دن وہ کیفیات نظر آئیں گی' کہ لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشر..... غرض کیفیات روحانیہ تو ضرور ہوتی ہیں' مگر کیفیات نفسانیہ ضرور نہیں' کسی کو ہوتی ہیں' کسی کو نہیں" - (۱)

اصل میں یہ کیفیات بھی راستہ کی دلچسپیاں ہیں' جن کا نفع فقط اتنا ہے کہ سفر ذرا دلچسپی سے قطع ہوتا ہے' لیکن ساتھ ہی بڑا خطرہ بھی ہے' کہ اکثر کم حوصلہ راستہ کی ان دلچسپیوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں' اور سبب اس غلطی کا یہ ہے' کہ لوگ کیفیات کو مطلوب سمجھتے ہیں' کہ اگر ہم خدا کے مقبول نہ ہوتے' تو ہم پر یہ کیفیات کیوں طاری ہوتیں' حالانکہ یہ تو کفار پر بھی طاری ہوتی ہیں" -

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ جو مجتہد فن اور مجدد وقت تھے' فرمایا کرتے تھے کہ انوار و کیفیات حجاب نورانی ہیں' اور حجاب نورانی حجاب ظلماتی سے اشد ہے سالک کو یہ سب حجابات پس پشت ڈالنا چاہئے' ان کی طرف ہرگز التفات نہ کرے جس شخص کو بادشاہ سے ملنا ہے' وہ نہ بھنگیوں کے مکان پر ٹھہرتا ہے' نہ عطاروں کی دوکان پر' سیدھا تخت شاہی پر پہنچنا چاہتا ہے' حجاب ظلمانی بھنگیوں کے مکانات ہیں' اور حجاب نورانی عطاروں کی دوکانات' سالک کو کسی پر نہ ٹھہرنا چاہئے' آگے چلتا رہنا چاہئے' مقصود وراء الورا ہے -

---

(۱) وعظ دواء الضیق ۱۲

اے برادر بے نہایت در گہیست
انچہ بروئے می رسی بردے مایست (1)

کشف و کرامات کی حقیقت: احوال و کیفیات کے اس حال و حقیقت کے بعد کشف و کرامت و تصرف و توجہ کی بھی حقیقت معلوم کر لیجئے۔

"فرمایا کہ لوگ کشف کو بڑا کمال سمجھتے ہیں' حالانکہ اس کو قرب میں کچھ دخل نہیں' بعضوں کو کشف سے فطری مناسبت ہوتی ہے' بعضوں کو نہیں جیسے بعضوں کی نظر پیدائشی طور پر دوربین ہوتی ہیں' بعضوں کی نزدیک بیں ' مسجد کے سقاوہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ فرض کیجئے ایک شخص کی نظر صرف سقاوہ ہی تک پہنچتی ہے' اور ایک کی باہر سڑک تک ' تو کیا جس کی نظر سڑک تک پہنچتی ہے ' وہ اللہ تعالٰی کے نزدیک زیادہ مقرب ہو گا' یہ تو محض نظر کی ایک قسم ہے' اس کو قرب سے کیا علاقہ بعضوں کو کشف سے فطرۃً مناسبت نہیں ہوتی' لاکھ مجاہدہ و ریاضت کریں' عمر بھر کشف نہیں ہوتا' اصل چیز تو عبدیت ہے' واللہ اگر کسی کو لاکھ کشف ہوں' اور پھر وہ اپنے وجدان کی طرف رجوع کرے' تو محسوس کرے گا کہ ذرہ برابر ترقی نہیں ہوئی' بر خلاف اس کے اگر وہ دو چار مرتبہ بھی سبحان اللہ سبحان اللہ پڑھ کر اپنے وجدان کو دیکھے' تو صاف محسوس ہو گا کہ کچھ نہ کچھ اللہ تعالٰی کے ساتھ قرب بڑھ گیا' اہل ذوق جب چاہئیں اس کا تجربہ کر لیں - (۱)

کشف قرب و ولایت کی دلیل کیا ہوتا' اس کے لئے تو مومن ہونا بھی شرط

---

(۱) وعظ تقلیل الکلام ص ۱۴ - ۱۲

(۱) سوانح جلد دوم ص ۸۷ - ۱۲

نہیں، مومن و کافر ملحد، ودہری سب ہی کو ہو سکتا ہے، جس طرح کچھ جسمانی غیر معمولی قوتیں مشق و ورزش سے پیدا ہو جاتی، یا بڑھ جاتی ہیں، اسی طرح مجاہدہ و ریاضت سے نفس میں کچھ خاص قوتیں پیدا ہو جاتی ' یا بڑھ جاتی ہیں ' جس سے آج کل کے علمائے نفسیات، یا عمل تنویم (ہپنا ٹزم) وغیرہ کے عامل خوب واقف ہیں۔

"غرض کشف کوئی بڑا کمال نہیں، اگر کافر بھی مجاہدہ و ریاضت کرے، تو اس کو بھی ہونے لگتا ہے، نیز مجانین کو بھی کشف ہوتا ہے، صاحب شرح اسباب نے لکھا ہے کہ مجنون کو کشف ہوتا ہے میں نے خود دیکھا کہ ایک مجنونانہ کو اس قدر کشف ہوتا تھا، کہ بزرگوں کو بھی نہیں ہوتا، لیکن اس کا مسہل ہوا تو مادہ کے ساتھ ہی کشف بھی نکل گیا" - (۱)

اس لئے شریعت میں کشفی علوم کوئی حجت نہیں - "اگر کوئی کشف قواعد شرعیہ کے موافق ہے تو قابل عمل ہو گا، ورنہ واجب الترک (۲) ہے " - کشف ہی کی طرح اور بھی کسی خارق یا خلاف عادت و امر کا کسی میں پایا جانا قرب و ولایت کی دلیل یا لازمہ نہیں -

"خوارق کا ہونا ولاویت کے لئے ضروری نہیں، بعض صحابہ سے عمر بھر ایک خرق عادت بھی واقع نہیں ہوا، خوارق اکثر جوگیوں سے واقع ہوتے ہیں، یہ ثمرہ ریاضت کا ہے، خرق عادت کا مرتبہ ذکر قلبی سے بھی کم ہے صاحب عوارف نے غیر اہل خوارق کو اہل خوارق سے افضل لکھا ہے. عارفین کی بڑی کرامت یہ ہے، کہ شریعت پر مستقیم ہوں اور بڑا کشف یہ ہے، کہ طالبان حق کی استعداد معلوم کر کے اس کے موافق ان کی تربیت کریں شیخ اکبر نے لکھا ہے کہ بعض اہل کرامت نے مرنے کے وقت تمنا کی کہ کاش ہم سے کرامتیں ظاہر نہ ہوتیں - (تعلیم الدین ص ۱۰۸)

---

(۱) سوانح جلد دوم ص ۸۷ - ۱۲

"بعض صاف گو حضرات کا فیصلہ ہے کہ الکرامات حیض الرجال یعنی جیسے عورت حیض سے شرماتی ہے اور اس کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے' اسی طرح اہل اللہ اپنی کرامتوں سے شرماتے ہیں' بہت سے اہل کرامت بزرگوں نے تمنا کی کہ کاش ہم سے کرامت کا صدور نہ ہوتا' وجہ یہ کہ انہوں نے بقدر اپنی کرامت کے اپنے درجات آخرت میں کمی محسوس کی' کیونکہ غیر اہل کرامت کو آخرت میں کرامت کا حصہ بھی عطا ہو گا' البتہ ماذون حضرات مستثنیٰ ہیں" - (۱)

کرامت کے متعلق رسالہ کرامات امدادیہ میں مستقل بحث فرمائی ہے' جس میں ارشاد ہے کہ

"کرامت اس امر کو کہتے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی متبع کامل سے صادر ہوا اور قانون عادت سے خارج ہو' اگر وہ امر خلاف عادت نہیں' تو کرامت نہیں' اور جس سے وہ امر صادر ہوا ہے' اگر وہ کسی نبی کا اپنے کو متبع نہیں کہتا وہ بھی کرامت نہیں' جیسے جوگیوں ساحروں وغیرہ سے ایسے امور سر زد ہو جاتے ہیں' اور اگر اتباع کا مدعی تو ہے' مگر واقع میں متبع نہیں' خواہ اصول میں خلاف کرتا ہو' جیسے اہل بدعت یا فروع میں جیسے فاسق و فاجر' اس سے بھی اگر ایسا امر صادر ہو وہ بھی کرامت نہیں استدراج ہے -

"بس کرامت وہ کہلائے گی' جب ایسے فعل کا صدور متبع کامل التقوے سے ہو' اب ہمارے زمانہ میں جس شخص سے کوئی عجیب فعل سر زد ہو جاتا ہے' اس کو غوث قطب قرار دے دیتے ہیں' خواہ اس کے عقائد و اعمال کیسے ہی ہوں ' بزرگوں نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کسی کو ہوا میں اڑتا دیکھو یا پانی پر چلتا' مگر شریعت کا پابند نہ ہو تو اس کو بالکل ہیچ سمجھو-

---

(۲) تعلیم الدین ص ۱۰۷ - ۱۲

(۱) الرفیق فی سوء الطریق ص ۳۱ - ۱۲

"اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اپنی کرامت کا اخفا واجب ہے' مگر جہاں ضرورت ہو' یا غیب سے اذن ہو یا حالت اس قدر غالب ہو' کہ قصد و اختیار باقی نہ رہے' یا کسی طالب حق و مرید کے یقین کو قوی کرنا مقصود ہو' وہاں جائز ہے"

توجہ و تصرف: بھی نہ کوئی مقصود ومامور امر ہے' نہ فی نفسہ کوئی کمال و قرب اور نہ ولایت و مقبولیت کی کوئی علامت' بلکہ نفس و خیال کی ایک قوت ہے' جو خیال و توجہ میں یکسوئی کی مشق سے مقبول کیا مردود سے مردود شخص حاصل کر لے سکتا ہے - پرانے زمانہ میں سحر یا جادوگری اور آج کل کے مسمریزم اور عمل تنویم (ہپناٹزم) کا بڑا مدار یہی ہے - اسی نفس یا باطن کی قوت سے کسی پر کوئی اثر ڈالنے کا نام صوفیوں کی اصطلاح میں توجہ و تصرف یا ہمت ہے - حضرت علیہ الرحمتہ نے مستقل ایک چھوٹا سا رسالہ عربی میں بنام رسالتہ التعرف فی تحقیق التصرف تحریر فرما دیا ہے' جس کا خلاصہ **ایدناہ بروح القدس** کی آیت سے استدلال فرما کر ایک قسم کی تائید قرار دیا ہے -

"اور ایک حقیقت اس تائید کی یہ ہے کہ خاص محمود و پسندیدہ کیفیات کو کسی دوسرے پر فائض یا طاری کیا جائے' جس سے اس میں خاص آثار پیدا ہو جائیں' یہ آثار مقاصد و اغراض کے اختلاف کی بناء پر مختلف قسم و رنگ کے ہوتے ہیں' اور اس تائید کو اہل تصوف کی اصطلاح میں تصرف' توجہ' ہمت اور جمع خواطر کہتے ہیں-

"اور یہ قوت تصرف مشائخ میں اکثر مجاہدات و ریاضات نفسانیہ سے پیدا ہوتی ہے' جیسے کشتی لڑنے کی قوت جسمانی ریاضت یا ورزش سے پیدا ہوتی ہے' بعضوں میں فطرۃً بھی یہ قوت ہوتی ہے' مگر یہ صورت بہت کم ہوتی ہے -

"اس قوت کا استعمال اگر کسی محمود یا اچھی غرض کے لئے ہو' جیسا کہ مشائخ کا معمول ہے تو اس غرض کے تحت اس تصرف کو بھی محمود سمجھا جائے گا' اور

اگر مقصود مذموم و برا ہے' تو یہ تصرف بھی مذموم ہو گا -

لیکن یہ قوت کوئی دینی کمال بہرحال نہیں' نہ مقبول و مقرب ہونے کی علامت ہے ہر فاسق و فاجر بھی مشق سے اپنے اندر یہ قوت پیدا کر لے سکتا ہے' بس جیسے ہاتھ پاؤں وغیرہ دوسری بدنی قوتوں کے استعمال کا حکم و حال ہے' وہی اس کا بھی ہے " - (۱)

نیز اس کے استعمال میں بعض دینی و دنیوی مضرتیں بھی ہیں' خصوصًا اس زمانہ میں حضرت مجدد علیہ الرحمہ کا مشورہ اس کے ترک ہی کا ہے -

"دنیوی مضرت تو اس میں یہ ہے کہ اس کے استعمال کی کثرت سے عامل کے دماغی و قلبی قویٰ ضعیف و مضمحل ہو جاتے ہیں' جس کی وجہ سے بہت سے امراض پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے اور دینی مضرت یہ ہے کہ عوام اس کو ولایت و بزرگی کی علامت سمجھتے ہیں - جو اعتقادی ضرر ہے' اور مریدوں کا ضرر یہ ہے کہ وہ اکثر اسی پر قناعت کر بیٹھتے ہیں' اور اصلاح کا اہتمام چھوڑ دیتے ہیں' جو عملی ضرر ہے -

"ان ہی مضرتوں کی وجہ سے محققین نے اس کا استعمال چھوڑ دیا ہے' سلف کے زمانہ میں یہ مضرتیں قویٰ کی مضبوطی' فطرت کی سلامتی اور خوش فہمی کے سبب موجود نہ تھیں (۱) (یا بہت کم تھیں)

اس کے علاوہ جو لوگ محض شیخ کی توجہ و تصرف پر قناعت کر لیتے ہیں' تو اس تصرف سے جو کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں' نہ تو ان کا کچھ نفع ہوتا ہے' اور نہ ان کو بقا نصیب ہوتا ہے' اصلی نفع و بقا اپنی ہی محنت و مشقت کی چیزوں میں ہے -

"یاد رکھو کہ پیر صرف رستہ بتلانے کے لئے ہیں' کام کرنے کے لئے نہیں'

---

(۱) بوادر النوادر ص ۳۲۴ - ۱۲

(۱) بوادر النوادر ص ۳۲۴ - ۱۲

کام تم کو خود کرنا چاہئے' کوئی شخص طبیب کے پاس جا کر اپنے امراض بیان کرے' اور جب وہ نسخہ تجویز کرے تو اس سے کہے کہ حکیم صاحب میری طرف سے آپ ہی پی لیں' تو ظاہر ہے اس شخص کو ساری دنیا احمق کہے گی' بس یہی حالت طالبین توجہ کی ہے' کہ مریض تو یہ مگر توجہ کریں بزرگ" -

بزرگوں سے جو لوگ خالی دعا و توجہ چاہا کرتے ہیں' اس سلسلہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ کی حضرت نے ایک بڑی ہی دلچسپ سبق آموز اور عارفانہ حکایت نقل فرمائی ہے' کہ

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ جب بمبئی تشریف لے گئے تو ایک سوداگر نے عرض کیا' کہ حضور دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کرے' فرمایا کہ ایک شرط سے دعا کروں گا کہ جس دن جہاز چلے اس دن مجھے اپنے اوپر پورا اختیار دے دو' کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں بٹھلا دوں گا' اور وہ تم کو لے کر روانہ ہو جائے' جب تک یہ نہ ہو صرف میری دعا سے کیا کام چل سکتا ہے -

"خیال کیجئے ابوطالب جو کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں - اور بہت بڑے آپ کے محب کہ جب تمام قریش نے مخالفت کی اور دشمن ہو گئے' اس موقع پر بھی ابو طالب نے ساتھ دیا' ساتھ ہی خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے بہت محبت تھی ' اور آپ نے بے حد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی لیکن محض اس وجہ سے کہ انہوں نے خود ارادہ (۱) نہیں کیا' حضورؐ کی کوشش و محبت کچھ بھی ان کے کام نہ آئی - (۲)

ایک اور دقیق و نافع بات -

---

(۱) ارادہ کی یہ اور آگے مثالوں سے جو تحقیق و توضیح فرمائی گئی ہے ' یہ وہی ہے جس پر کسی ملانے نہیں عہد حاضر کے بہت بڑے نامور عالم نفسیات ولیم جیمس نے ارادہ ایمان کے نام سے ایک پوری کتاب لکھ ڈالی ہے ۱۲

(۲) الرفیق فی سواء الطریق ص ۵۳ - ۱۲

"اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ارادہ تو ہے' مگر یہ بالکل غلط ہے' تمنا دوسری چیز ہے' اور ارادہ دوسری چیز - ایک مرتبہ دو شخص حج کو جانے کا تذکرہ کر رہے تھے' ایک نے کہا بھائی ارادہ تو ہر مسلمان کا ہے' میں نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے' اگر ارادہ ہر مسلمان کا ہوتا' تو ضرور سب کے سب حج کر آتے' ہاں یوں کہیئے کہ تمنا ہر مسلمان کی ہے ' سو نری تمنا سے کام نہیں چلتا ارادہ کہتے ہیں سامان کے مہیا کرنے کو مثلاً ایک شخص زراعت تو کرنا چاہتا ہے مگر اس کا سامان مہیا نہیں کرتا - اور ایک شخص سامان بھی جمع کر رہا ہے' تو پہلے کو متمنی' دوسرے کو مرید کہیں گے' اس طرح دو شخص جامع مسجد میں پہنچنا چاہتے ہیں' مگر ایک اپنی جگہ بیٹھا تمنا ظاہر کئے جائے اور دوسرا چلنا شروع کر دے' تو دوسرے کو مرید کہیں گے' اور پہلے کو متمنی' جب ارادہ ہوتا ہے' کام بھی ضرور پورا ہو جاتا ہے' اگر کسی وجہ سے خود قدرت نہیں ہوتی' تو کوئی رہبر مل جاتا ہے جو معین ہو کر کام پورا کر دیتا ہے' اسی لئے کہتے ہیں - السعی منی ولا تمام من اللہ

"بعض مرتبہ مرشد کی توجہ سے طالب کے قلب میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' جو خود محنت کرنے سے نہیں پیدا ہوتی' مگر صرف اس کیفیت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ' بلکہ اگر خود کچھ نہ کیا جائے' تو یہ کیفیت باقی نہیں رہتی' اس کی مثال ایسی ہے' جیسے آگ کے سامنے بیٹھنے سے بدن گرم ہو جاتا ہے' لیکن گرمی باقی نہیں رہتی' جہاں سامنے سے ہٹ کر ہوا لگی' کہ بدن میں ٹھنڈک پیدا ہو گئی' اسی طرح اس کیفیت میں بھی پیر سے جدا ہوتے ہی (یا توجہ کا اثر کم ہوتے ہی) کورے کے کورے رہ جاتے ہیں -

"اس کے علاوہ اپنی کمائی کی قدر بھی خوب ہوتی ہے' اور مفت کی چیز کی قدر نہیں ہوتی' مشہور ہے کہ ایک شخص ادھوڑی کا جوتا دو شالے سے جھاڑ رہا تھا' لوگوں نے پوچھا یہ کیا! تو کہا دو شالہ میرے والد کی کمائی کا ہے اور جوتا میری کمائی کا -

ہر کہ او ارزان خرد ارزان دہد
گو ہرے طفلے بقرص نان دہد

"اور جو لوگ اپنے بوتے پر کام کرتے ہیں' ان کی حالت ساری عمر یکساں رہتی ہے' البتہ ان میں شوروغل اوچھل کود نہیں ہوتی' اور نہ یہ مطلوب ہے - (۱)

"چنانچہ بزرگی کا معیار لوگوں نے یہ تصرف بھی تراش رکھا ہے کہ جو شخص آنکھیں چار ہوتے ہی مدہوش کر دے' اٹھا کر زمین پر پٹک دے وہ بڑا بزرگ ہے' حالانکہ یہ بالکل لغو ہے' اگر یہ بزرگی ہے تو حضور صل اللہ علیہ وسلم کو تو ضرور اس کو برتنا چاہئے تھا - پھر کیا وجہ ہے کہ جب کفار نے آپ کو قتل کرنا چاہا تو آپ اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ غافل ہو جائیں' تو میں نکل جاؤں' کیوں نہ آپ نے ایک ہی نگاہ میں سب کو مدہوش کر دیا " -

بلکہ حضورؐ نے ایسے اوقات میں بھی جو کچھ کیا' وہ اللہ تعالٰی سے عاجزانہ شان عبدیت کی دعا تھی' نہ کوئی توجہ و تصرف جیسا کہ سراقہ کے مشہور واقعہ میں جو آپ کی تلاش و تعاقب میں چلا رہا تھا -

"آپ نے اس وقت بھی خدائے تعالٰی سے دعا فرمائی' اللھم اکفنا شرہ ' چنانچہ اس کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا' سراقہ نے کہا کہ غالباً آپ نے میرے لئے بددعا کی' درخواست کرتا ہوں کہ آپ خدائے تعالٰی سے دعا کریں' کہ مجھے اس مصیبت سے نجات دے' اور وعدہ کرتا ہوں کہ قریش کو آپ کا پتہ نہ دوں گا' چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور اس کا گھوڑا زمین سے نکل آیا -

صاحبو! بزرگی کا معیار یہ ہے کہ جتنی درویشی میں ترقی ہوتی جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت بڑھتی جائے کیونکہ ولایت مستفاد عن النبوت ہے'

---

(۱) الرفیق فی سوء الطریق ص ۵۴ - ۱۲

افسوس کہ یہ لوگ علماء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے' اس لئے بہت سی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں - (۱)

بیعت و ارادت

پیری و مریدی یا بیعت و ارادت کی حقیقت و ضرورت میں بھی بہت افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے - ایک طرف اس کو سرے سے بعضوں نے بدعت سمجھ رکھا ہے اور دوسری طرف صرف ایک رسم بنا رکھا ہے کہ بس دست بوسی و پابوسی کر لی' باقی خود کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں' حالانکہ:-

"نری پیری و مریدی میں کچھ نہیں رکھا اصل کام خود چلنا ہے اور کسی رہبر کا ہاتھ پکڑنا' اگرچہ (رسمی) مرید کسی سے بھی نہ ہو' یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ میں داخل ہونے سے برکات کچھ نہیں' لیکن اس کو اصل الاصول سمجھنا بڑی غلطی ہے' آج کل پیری و مریدی کے متعلق وہ جہل پھیلا ہوا ہے کہ الامان و الحفیظ" - (۱)

بیعت کی اصلی حقیقت خود لفظ بیعت و ارادت اور مرید کی اصطلاح بلکہ لفظی معنی ہی سے واضح ہو جاتی ہے - جیسا کہ اوپر ارادہ کی ماہیت میں حضرت نے واضح فرما دیا کہ ارادہ محض آرزو و تمنا کا نام نہیں' بلکہ مراد کو پورا کرنے کے لئے ضروری اسباب و وسائل کی بہم آوری میں لگ جانا' یا منزل مقصود کی طرف چل پڑنا ہے' بس مرید بھی اصطلاحًا وہ ہے جو اپنی دینی خصوصًا باطنی و قلبی اصلاح و

---

(۱) الرفیق فی سوء الطریق - ۱۲

(۱) الرفیق فی سوء الطریق ص ۶۰ - ۱۲

درستی کو مراد و منزل بنا کر اس کے ضروری وسائل اختیار کرتا اور اس کی طرف چل پڑتا ہے' اور بیعت کے معنی ہیں اس منزل مقصود کے لئے کسی زیادہ واقف کار کو رہبر و رفیق بنا لینا' اور اس کے پیچھے یا ساتھ چلنا' تاکہ نہ صرف گمراہی کے خطرات سے حفاظت ہو بلکہ راستہ سہولت و راحت سے قطع ہو - بالفاظ دیگر اپنے سے زیادہ واقف و ماہر مصلح کے ہاتھ میں اپنے کو اس طرح سونپ دینا' جس طرح بائع مشتری کے ہاتھ اپنی چیز سونپ دیتا ہے - یا جیسے مریض کسی حاذق طبیب کے حوالہ اپنے کو کر دیتا اور دواو پرہیز میں کاملاً اس کی تجاویز و ہدایات پر عمل کرتا ہے - خالی اس گھمنڈ میں کہ خود کوئی شخص لکھا پڑھا بلکہ عالم و فاضل ہے' اور طب کی کتابوں کو پڑھ لیتا ہے' یا باقاعدہ کسی استاد ہی سے پڑھ لیا ہے' مگر مطب نہیں کیا' اگر وہ خود اپنی بیماریوں کا علاج محض کتابوں یا کتابی نسخوں سے کرنے لگے' تو ہلاکت کے خطرات کو دعوت دینے کے سوا کیا ہے - باقاعدہ علاج و نسخہ نویسی کی لیاقت تو باقاعدہ کسی طبیب کے مطب میں دو چار سال بیٹھ کر اور نسخہ نویسی کی مشق ہی سے حاصل ہو گی - حکیم کبیر الدین صاحب نے طب کی کتابوں کو باقاعدہ پڑھا ہی نہیں' بلکہ طب کے مشہور و مستند مصنف ہیں' لیکن خود ان کا یہ اعتراف سنا' کہ علاج کھانسی زکام کا بھی نہیں کر سکتے - اور بھی ایسے معلمین طب گزرے ہیں (جیسے حکیم نور کریم مرحوم دریا بادی) جو عمر بھر طب پڑھایا کئے اور کتابی علم پر اتنا عبور تھا کہ کھانا کھاتے جاتے' راستہ چلتے جاتے اور پڑھاتے جاتے' طبیب گر مشہور تھے' اور استاذ الاساتذہ رہے' مگر معالجہ کی مشق نہ تھی - نہ علاج کرتے تھے - ایک طب و طبیب پر کیا موقوف ہر عملی فن کا یہ حال ہے' کیا کوئی لوہار اور بڑھئی کا کام محض کتابیں پڑھ کر کر سکتا ہے' یا کھانا محض طباخی کی کوئی کتاب پڑھ کر پکا لے گا - بس وہی کچا پکا' الٹا سیدھا' وہ بھی بہت کچھ وقت اور سامان برباد کرنے کے بعد' پھر بھی خود رو ہونے کی خامی ہمیشہ باقی رہے گی -

"کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا' حالانکہ کتابوں میں سب

کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے' مگر تم نہیں کرسکتے' اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا' تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے ' مجھے ہر سال برسات کے اخیر میں بخار آیا کرتا تھا' اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے تھے' میں نے کہا لاؤ اسکو لکھ لیں' جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کر لیا کریں گے' چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا' مگر خاک نفع نہ ہوا' آخرکار حکیم صاحب کو بلایا انہوں نے نسخہ لکھا' اس کے پینے سے آرام ہوا' پھر تحقیق ہوا کہ اس سال صفراء کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں' اب اگر میں نے یہ نسخہ بھی نقل کر لیا' کہ چلو اس میں صفراؤ بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا' کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہوتا کہ اس سال بلغم صفراء سے زیادہ ہے' یا مساوی ہے یا کم' اس کا اندازہ تو طبیب ہی کر سکتا ہے' جو نبض کی حالت کو پہچانتا ہے اس لئے کتب طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے "۔

(اشرف الجواب حصہ دوم ص ۱۸۶)

غرض "اگر شیخ کی تعلیم پر عمل نہ ہو اور اس کے کہنے پر اطمینان نہ ہو اگر ساری عمر بھی چکی پیسے گا ذرہ برابر نفع نہ ہو گا - اس طریق میں انقیاد محض کی سخت ضرورت ہے - ہاں یہ جائز ہے کہ اس کو شیخ ہی تسلیم نہ کر لے - لیکن تسلیم کرنے کے بعد پھر چوں و چرا کرنا' اپنی رائے کو دخل دینا دلیل محرومی کی ہے' یہ تعلق بڑا نازک ہے' اس کے آداب ہی جدا ہیں" (افاضات حصہ چہارم ص ۶۹۲)

یہ بات دراصل بالکل موٹی اور معمولی ہے' پھر بھی اتنی تفہیم و تمثیل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ پہلے تو پرانوں میں خشک مذہب اور تر (یا رسمی) تصوف کی بدولت یہ افراط و تفریط ہوئی کہ ایک نے بیعت و ارادت کو سرے سے حرام و بدعت قرار دے دیا' اور دوسرے نے بیعت کو وہ بھی خالص اس کی رسموں کو لازم

و واجب سمجھ لیا - اور آج کل تو اس سے بھی آگے بڑھ گئے' کہ دینی اصلاح و درستی یا باطنی علاج و معالجہ الگ رہا' اس کا تصور ہی سرے سے مفقود ہے - ظاہری دین اور دینی مسائل تک کے لئے باقاعدہ کسی تعلیم حتیٰ کہ براہ راست ماخذ (کتاب و سنت) سے واقفیت تک کو ضروری نہیں جانتے' بس اردو انگریزی میں قرآن و حدیث کے کچھ ترجمے یا ادھر ادھر کے اخباری مضامین پڑھ کر ہی دین کے مفتی ہی نہیں مجتہد و مجدد سب کچھ بن جاتے ہیں -

کیا جہل مرکب ہے کہ وکیل بننے کے لئے تو گھر بیٹھ کر وکالت کی کتابیں پڑھ لینا کافی نہیں بلکہ باقاعدہ لکچروں کی تکمیل و امتحان کے بعد کسی سینئر مشاق وکیل کے ساتھ کام کرنا اور تجربہ حاصل کرنا ضروری ہے - وہ بڑا احمق ہو گا' جو قانون کے کسی ایسے مشہور سے مشہور پروفیسر کے ہاتھ میں اپنا مقدمہ دے دے جس نے نہ عدالت کی صورت کبھی دیکھی ہو' نہ عدالتی کام کا عملی تجربہ رکھتا ہو - سائنس کی کتابوں کو خود پڑھ کر یا استاد کے محض لکچر سن کر کوئی سائنسدان نہیں بن جاتا جب تک معمل (لیبورٹیری) میں اختیارات و مشاہدات نہ کرے -

حالانکہ ان معاملات و مقدمات تجربات و مشاہدات کا تعلق اسی دنیا اور عالم شہادت سے ہے' لیکن دینی مسائل جن کا رشتہ عالم غیب و آخرت کے مابعد الطبیعاتی مسائل سے جڑا ہوا ہے' ان کو ہر لیڈر' ہر اڈیٹر اور ہر پلیڈر تختہ مشق بنانے کا حق رکھتا اور ان پر مجددانہ و مجتہدانہ اظہار خیال فرماتا ہے!

انتہا یہ کہ خود تصوف اور اسلامی تصوف پر ایسے ہی حضرات تنقید و تحقیق فرمانے لگے ہیں' اور سمندر پار سے اس تحقیق (ریسرچ) کی اسناد لاتے ہیں - ایک بڑے مشہور عالم و مصنف نے محض کتابی معلومات کے زور پر کسی جگہ تصوف پر ایسا ہی عالمانہ لکچر دیا' تو ایک بڑے ذہین سجادہ نشین نے کیا خوب داد دی کہ حضرت اگر تصوف خالی کتابوں سے حاصل ہو جاتا' تو میں آپ سے بڑا کسی کو صوفی نہ جانتا -

غرض ارادت و بیعت کا مطلب بکمال دین یا دین کے مرتبہ احسان کی طلب میں نکل پڑنا، اور اپنے سے زیادہ کسی واقف کار رہبر کے پیچھے ہو لینا ہے - یا یوں کہو کہ اس مرتبہ دین کا تعلق چونکہ خصوصیت کے ساتھ قلب و باطن کی اصلاح اور اس کے امراض کے ازالہ سے ہے، اس لئے کسی شفیق و حاذق طبیب کے زیر علاج اپنے کو دے دینا ضروری ہے -

حضرت علیہ الرحمہ نے اس کو پیر و مرید یا شیخ و طالب کے مابین ایک ایسے معاہدہ سے تعبیر فرمایا ہے، جس میں شیخ کی طرف سے اصلاح کا وعدہ ہوتا ہے اور طالب کی طرف سے اتباع کا - بیعت کی اس ماہیت کو جان لینے کے بعد ظاہر ہے کہ رسمی بیعت فرض و واجب نہیں، اس کا نفع صرف سلسلہ کی برکت کا حصول ہے، یا ایک نفسیاتی فائدہ جیسا کہ ایک حیدر آبادی جامع حال و قال بزرگ (حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے) کہ "مرید کان دے دیتا ہے" یعنی پیر کی باتوں کو قدرۃً زیادہ توجہ سے سنتا اور مانتا ہے -

ورنہ حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کے ہاں تو نفس اس رسمی بیعت کی جو حیثیت تھی اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے فرمایا جا سکتا ہے، کہ ایک صاحب کو سالہا سال کی تعلیم و تربیت کے بعد اجازت عطا فرمانا چاہا تو انہوں نے عرض کیا حضرت ابھی تو احقر کو مرید بھی نہیں فرمایا گیا! فرمایا اچھا آؤ مرید بھی ہو جاؤ! اکثر فرمایا کرتے تھے، کہ مجھ کو یاد بھی نہیں رہتا کہ کون مرید ہے کون نہیں بس میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ کام میں کون لگا ہے - بیعت کی درخواست کرنے والوں سے بالعموم ابتداء میں ایسے جرحی سوالات فرماتے، جن سے بیعت کی اصل غرض و غایت ان پر کھل جائے کیونکہ معمولاً لوگوں کے ذہن میں بیعت کی جو اغراض ہوتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

"بعضے صاحب کشف و کرامت بننا چاہتے ہیں، تو اس کا خود شیخ میں ہونا ضرور نہیں، تو مرید اس کی کیا ہوس کرے، بعضے سمجھتے ہیں، کہ پیر بخشش کے ذمہ دار

ہو جائیں گے' حالانکہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ تک کو فرمایا تھا۔

یا فاطمہ انقذی نفسک من النار

فاطمہ اپنے کو دوزخ سے بچاؤ۔

تو بھلا اور کون پیر کسی مرید کو بچا سکتا ہے' جب تک خود مرید ہی اس کی کوشش نہ کرے۔

بعضے جانتے ہیں کہ پیر صاحب ایک ہی نظر میں کامل کر دیں گے' اگر اس طرح کام بن جاتے تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو کچھ بھی نہ کرنا پڑتا' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل النظر ہو گا' کہیں بطور خرق عادت ایسا ہو بھی گیا' تو خوارق میں دوام و لزوم نہیں' اس بھروسہ پر رہنا بڑی غلطی ہے۔

"بعضے چاہتے ہیں کہ خوب جوش و خروش' شورش و مستی پیدا ہو' گناہ آپ سے آپ چھوٹ جائیں خواہش ہی مٹ جائے' نیک کاموں میں ارادہ ہی نہ کرنا پڑے' آپ سے آپ ہو جایا کریں' وساوس و خطرات سب فنا ہو جائیں' بس ایک محویت کا عالم رہا کرے' یہ خیال پہلے خیالوں سے پاکیزہ سمجھا جاتا ہے' لیکن منشاء اس کا بھی ناواقفی ہے' یہ امور منجملہ کیفیات و احوال کے ہیں' جو اختیار سے خارج ہیں' اور گو محمود ہیں مقصود نہیں' بلکہ ایسی خواہشوں میں نفس کا ایک خفی کید ہوتا ہے' کہ وہ طالب ہے راحت و لذت و شہرت کا اور ان کیفیات میں یہ سب امور حاصل ہیں ورنہ طالب رضا کو جو اصل مقصود ہے' ان خواہشوں سے کیا علاقہ۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب

کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

پھر ایسا شخص دو قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہوتا ہے' اگر یہ کیفیات حاصل ہو گئیں

تب تو بوجہ اس کے کہ یہ شخص اسی کو غایت سمجھتا تھا' اپنے کو صاحب کمال سمجھنے لگتا ہے' اور انہی پر قناعت کر کے تقویٰ و طاعات سے بے فکر ہو جاتا ہے' یا کم از کم طاعات کو حقیر ضرور سمجھنے لگتا ہے ' اور اگر حاصل نہ ہوئیں تو ان کے غم میں مرنے لگتا ہے' اور جو غیر اختیاری امور کا طالب ہو گا' ہمیشہ مبتلائے غم و پریشانی رہے گا -

بعضے سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب کے عملیات بڑے مجرب ہیں' ضرورت کے وقت ان سے تعویذ گنڈے لے لیا کریں گے' یا پیر صاحب بڑے مقبول الدعوات ہیں' معاملات و مقدمات وغیرہ میں ان سے دعا کرایا کریں گے' سب کام ہو جایا کریں گے' گویا ساری خدائی پیر صاحب کے قبضہ میں ہے یا خود ہم ایسی ہی چیز سیکھ لیں گے' بلکہ ایسے لوگ تمامتر بزرگی کا خلاصہ انہی عملیات اور ان کے آثار کو سمجھتے ہیں' جو محض دنیا کی طلب ہے اس لئے فاسد در فاسد ہے" - (۱)

حیدر آباد میں ایک بڑے عہدہ دار خاصے پڑھے لکھے نماز روزہ کے پابند ایک دن فرمانے لگے کہ اب کوئی بزرگ نہیں رہا' کیوں؟ اس لئے کہ دکن و ہندوستان سب جگہ کوشش کی کوئی میرا تبادلہ فلاں جگہ سے بلدہ نہیں کرا پاتا!

"بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر و شغل کرنے سے کچھ انوار نظر آیا کریں گے یا کچھ آوازیں سنائی دیں گی' یہ محض ہوس و نافہمی ہے اول تو ذکر و شغل پر نہ ان آثار کا مرتب ہونا ضروری ہے' اور نہ ذکر و شغل سے یہ مقصود ہے' دوسرے یہ انوار و اصوات وغیرہ بعض اوقات خود اس کے دماغ کا تصرف ہوتا ہے' عالم غیب کی اشیاء میں سے نہیں ہوتیں' تیسرے بالفرض اسی عالم کی چیزیں' منکشف ہو گئیں' تو فائدہ کیا' کسی عالم کے منکشف ہو جانے سے قرب نہیں بڑھتا' قرب کے لئے تو طاعات بنائی گئی ہیں' بعض اوقات شیاطین کو ملا کہ نظر آنے لگتے ہیں'

---

(۱) قصد السبیل ہدایت چہارم - ۱۲

مگر وہ شیطان کے شیطان ہی رہتے ہیں، پھر مرنے کے بعد تو مومن کافر سب ہی کو اس عالم کے بہت سے حقائق کا انکشاف ہو جائے گا، تو کیا اس سے قرب مقصود سب کو حاصل ہو جائے گا "۔

غرض یہ چیزیں بیعت کی صحیح غرض کوئی بھی نہیں، اس لئے سب کو دل سے نکال کر سلوک کی اصلی غرض و مقصود رضائے حق کو سمجھے، جس کا طریق احکام شرعیہ کا بجا لانا، اور ذکر کی مداومت کرنا (یعنی غفلت کو رفع کرنا ہے) اور پیری مریدی کا حاصل یہ ہے کہ

"شیخ اسی کی تعلیم کرتا ہے اور مرید کاربند ہوتا ہے، اگرچہ کوئی کیفیت معلوم نہ ہو، نہ اس کے زعم کے مطابق کوئی کمال حاصل ہو، تب بھی آخرت میں اس کا ثمرہ جو کہ رضا ہے، ظاہر ہو گا اور اس رضا سے دخول جنت و لقائے حق اور دوزخ سے نجات میسر ہو گی، شیخ کی طرف سے اسی کی تلقین کا وعدہ اور مرید کی طرف سے اس کے اتباع کا عہد یہی حقیقت ہے پیری و مریدی کی ۔

"اور گو یہ تعلیم اور اس پر عمل بدون بیعت متعارفہ کے بھی ممکن ہے لیکن بیعت میں طبعًا یہ خاصہ ہے کہ شیخ کو توجہ زیادہ ہو جاتی ہے، اور مرید کو فرمانبرداری کا پاس زیادہ ہو جاتا ہے، اور یہی حکمت ہے شیخ کی تعیین اور وحدت میں کہ جانبین کو خصوصیت بڑھ جاتی ہے، باقی ہاتھ میں ہاتھ لینا، یا عورت کو کوئی کپڑا وغیرہ دینا محض ایک مستحسن عادت ہے، اس معاہدہ کی تاکید کے لئے، نہ کہ نفس معاہدہ یا بیعت کا جزء اسی وجہ سے غائب کے لئے اس کی رسم نہیں، اور استحسان سنت میں بھی وارد ہے چنانچہ مردوں کے لئے ہاتھ میں ہاتھ دینا منقول ہے، اور کپڑا وغیرہ ہاتھ میں دینا یہ اخذ ید کے قائم مقام ہے" - (۱)

---

(۱) قصد السبیل ہدایت چہارم - ۱۲

باقی محض رسمی "اخذید" یا کسی پیر خصوصًا نام کے پیر کا نام کے لئے ہاتھ پکڑ لینا اس کی نسبت ایک موقع پر نہایت جوش و قوت کے ساتھ ارشاد ہوا کہ

"اجی کس کی پیری و مریدی لئے پھرتے ہو، یہ تو پکھنڈے ہیں، بیعت کی صورت ضروری نہیں، اصل چیز بیعت کی روح یعنی اتباع ہے، غرض مرید ہونے کی ضرورت نہیں، پیر کے کہنے کے مطابق کام شروع کر دو، بس ہو گیا تعلق، واللہ وہی نفع ہو گا جو پیری مریدی میں ہوتا ہے، اب لوگوں کا عجب حال ہے، کہ کام بتاؤ تو نہ کریں، بس بیعت کا نام چاہتے ہیں بیعت کی محض رسم ہی رسم رہ گئی ہے، چنانچہ جو پیر ایسے ہیں، کہ مرید کرتے ہیں لیکن کام کچھ نہیں بتلاتے، ان سے لوگ بہت خوش ہیں، اور میں مرید تو کرتا نہیں کام بتلاتا ہوں، تو مجھ سے ناراض ہیں -

یوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ جو بھید ہیں فقیری کے، وہ جو انجھر ہیں پریم کے وہ مریدوں ہی کو بتائے جاتے ہیں، مرید کرتے ہی پیر بس پریم کے دو انجھر بتاوے گا اور ہم اللہ والے ہو جائیں گے، میاں خدا رسول کا نام لو اور احکام بجا لاؤ، بس یہی انجھر ہیں، اصلاح نفس کے طریقے پیر سے پوچھو، یہی بھید ہیں، اگر کوئی کہے کیا باطنی طریق بس یہی ہے، تو ہم بآوازِ دہل کہیں گے کہ ہاں یہی ہے، اور اس طریق میں کبھی بڑے بڑے حالات بھی پیش آئیں گے، بڑی بڑی کیفیات بھی طاری ہوں گی، مگر یہ مقصود نہیں -

بھائی حالات تو سڑک کے پھولدار درخت ہیں، نظر آئے تو کیا، نہ نظر آئے تو کیا، سڑک تو بہرحال قطع ہو گی، بس چلتے رہنا شرط ہے، اور بعضوں کو یہ درخت اور پھول عمر بھر نظر نہیں آتے، واللہ جن حالات کو آپ بڑا کمال سمجھتے ہیں، طریق میں بس ایسے ہیں، جیسے سڑک پر دو طرفہ گلاب اور بیلے کے درخت لگے ہوں، اگر کبھی ہم نیچی نظر کر کے چلتے ہیں تو کیا راستہ قطع نہیں ہوتا، راستہ تو

برابر قطع ہوتا ہے' چاہے درخت نظر پڑیں یا نہ پڑیں - (۱)

"غرض نہ بغیر چلے کام چلتا ہے' نہ بغیر رفیق سیدھا راستہ ملتا ہے اگر ایک نابینا کسی جگہ پہنچنا چاہے تو اول اس کو خود چلنے کی ضرورت ہے اگر چلے نہیں تو ہزار رفیق ملنے پر بھی رستہ قطع نہ ہو گا البتہ چلنے کے بعد پیر اور رفیق کی بھی ضرورت ہے' کیونکہ اگر رہبر نہ ہو تو ناآشنا راستہ میں ضرور کسی جگہ ٹھوکر کھا کر گرے گا' بے خطر منزل پر پہنچنے کی صورت یہی ہے' کہ اپنے پیروں پر چلے اور رہبر کا ہاتھ پکڑے' بالکل ویسی ہی حالت اس رستہ کی بھی ہے' کہ ارادہ کرنا اور کام شروع کر دینا اپنے پیروں پر چلنا ہے' اور کسی بزرگ کا دامن پکڑ لینا رہبر کا ہاتھ پکڑ لینا ہے "۔

صحبت و تعلق: بیعت کی اصلی بڑی ضرورت یہی رفاقت یا پیر کی صحبت و تعلق ہے تاکہ راستہ کے خطرات یا اس کی ٹھوکروں سے حفاظت ہو' اور یہ ایسی موٹی بات ہے کہ دنیا کے کسی موٹے سے موٹے کام میں بھی اس کام کے ماہر و تجربہ کار کی صحبت و اعانت کے بغیر بصیرت پیدا نہیں ہوتی - کسی علم و فن کے معلومات اور چیز ہیں' اور بصیرت اور چیز' معلومات تو باغبانی اور کاشتکاری کی کتابیں پڑھ کر بھی ہم بہت کچھ حاصل کر لے سکتے ہیں' لیکن خالی ان کتابی معلومات کی بناء پر اگر ہم باغ لگانا اور کھیتی کرنا شروع کر دیں تو کیا قدم قدم پر ٹھوکریں نہ کھائیں گے - بخلاف اس کے اگر کچھ دن کسی تجربہ کار باغبان و کاشتکار کے ساتھ یا اسی کی صحبت میں اس کام کو کر لیں تو اس کے نشیب و فراز کی ایسی بصیرت یا اندرونی بینائی حاصل ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی بالکل ہی نئی زمین دے دی جائے' تو اس سے بھی کام لینے میں زیادہ دشواری نہ ہوگی -

---

(۱) اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۶۱ - ۱۲

لیکن اس زمانہ میں لوگوں کو دین کے معاملات میں خصوصًا یہ بیماری وبا کی طرح لگ گئی ہے، کہ رہروی ہی کے لئے نہیں، بلکہ جہالت کی انتہا ہے، کہ رہبری اور تجدید و اجتہاد تک کے لئے محض کتابی معلومات کی بناء پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی صحبت سے محروم اچھے اچھے دینی علوم و معلومات والے ضال و مضل دونوں ہو رہے ہیں۔ احقر کی سمجھ میں ان حضرات کی حالت ایسے نو مسلم کی سی ہوتی ہے، جس کا اسلام تمامتر کتابی معلومات سے ماخوذ ہو، وہ نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ سب کے فرائض و سنن، ارکان و شرائط محض کتابیں دیکھ دیکھ کر پورا کرتا ہو، جس کے مقابلہ میں ایک پابند صوم و صلوٰۃ مسلمان گھرانے کا ان پڑھ بچہ گھر والوں کو دیکھ دیکھ کر زیادہ صحیح طور پر وضو نماز وغیرہ کے واجبات و مستحبات ادا کر سکے گا۔ غرض کوئی علم و فن ہو، اس کے عملی ماہر کی صحبت کے بغیر اناڑی پن مشکل ہی سے نکلتا ہے۔

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و مکمل ہوا ہے، ارے بھائی موٹی بات ہے، کہ بلا بڑھئی کے پاس بیٹھے کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا، حتیٰ کہ بسولا بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جا سکے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا اندازہ بھی نہیں آتا۔ بلا خوشنویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز خوشنویس نہیں ہو سکتا، غرض بدوں کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں بن سکتا، لہٰذا پیر کامل کی صحبت لازم ہے"۔

(۱)

اور ہمارے لئے تو صحبت کی حاجت و اہمیت کی سب سے بڑی دلیل صحابیت ہے، کہ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی فضیلت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین و فقہاء اور بڑے

---

(۱) سوانح حصہ دوم ص ۱۵۹۔ ۱۲

بڑے اولیاء و اقطاب پر مسلم ہے - ظاہر ہے کہ اس فضیلت کا مدار نہ کتابوں پر ہے کہ اکثر صحابہ سرے سے امی تھے نہ کثرت معلومات پر کہ ان کے مقابلہ میں بعد کے معمولی علماء کے بھی نفس معلومات ان سے زیادہ ہی ہوتے ہیں' اس فضیلت کا مدار محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پر ہے کہ جس سے اعلیٰ کیا جس کے مساوی صحبت بھی بعد کے بڑے بڑے علماء و اولیاء کو اب نصیب نہیں ہو سکتی۔ جن کو کچھ تجربہ ہے' وہ جانتے ہیں کہ ایک دن کی صحبت سے جو کچھ نصیب ہوتا ہے' وہ سالہا سال کی کتاب خوانی سے نصیب نہیں ہوتا' اور اس میں کچھ زیادہ مبالغہ نہیں کہ

یک زمانے صحبتے با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

غرض صحبت کی اس ناگزیر ضرورت کی بناء پر قصد السبیل و تعلیم الدین وغیرہ میں جہاں جہاں بیعت و سلوک پر بحث و گفتگو فرمائی گئی ہے' صحبت کی خاص طور سے تاکید ہے کہ بیعت کے بعد اگر وقت و مہلت میسر ہو تو چندے پیر کی خدمت میں رہے' یا کبھی کبھی اپنے پیر کے پاس یا اور کوئی خوش عقیدہ متقی بزرگ موجود ہو تو اس کے پاس بیٹھا کرے - (۱)

اور اگر ذرا طویل صحبت میسر ہو جائے تو یہ بصیرت ایسی بڑھ جاتی ہے کہ واقعی اس کے قبل کی اپنی حالت بالکل احمقانہ معلوم ہونے لگتی ہے' اس احمق راقم پر تو بالکل یہی گزری کہ تھوڑی بہت کتابیں پڑھی تھیں' خالی کتاب خوانوں کی صحبت بھی اٹھائی تھی' فراغت کی سند بھی حاصل تھی' تصنیف و تالیف کا بھی کچھ دعوے تھا' عقل و فہم میں بھی ہم چشموں میں برا نہ خیال کیا جاتا تھا' لیکن حضرت علیہ الرحمتہ کی خدمت میں چند ہی حاضریوں کے بعد معلوم ہو گیا کہ جس بصیرت کو دین

---

(۱) الشریعہ نام وعظ ص ۳۶ - ۱۲

کی فہم و بصیرت کہنا چاہیئے اس کے اعتبار سے خدا گواہ ہے کہ نرا احمق اور گنوار ہی تھا!

"کتنا ہی بڑا عاقل ہو، مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی محقق عالم کی صحبت میں رہا ہو، اس کو کسی محقق کی صحبت میں چھ مہینہ کے لئے بھیج دو، خدا کی قسم اس چھ مہینہ میں وہ محقق ثابت کر دے گا، اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرالے گا، کہ میں احمق ہوں، اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا، اگراس سے زیادہ دلیل کو جی چاہئے، تجربہ کر لو، کہ چھ مہینے کی رخصت لو، پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھ لو، اس وقت دیکھ لو گے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا یہ کہتا ہوا کہ میں احمق ہوں نہیں، بلکہ پہلے احمق تھا، کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آ جائے گی"۔

علمی و دینی یا باطنی تحقیق و بصیرت کا تو ذکر ہی کیا روزمرہ کی ظاہری و معمولی باتوں میں جن چیزوں کو ہم تہذیب و کمال سمجھتے ہیں، حضرت علیہ الرحمتہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے متعلق بھی قدم قدم پر اپنی حماقتوں کا ادراک ہوتا تھا، جونپور کے ایک شاعر حاضر ہوئے جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے۔

"چند روز رہنے کے بعد جب واپس گئے، تو ایک رسالہ لکھا، اس میں یہ بھی لکھا تھا، کہ عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے، وہاں (تھانہ بھون) جا کر معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہ تھی۔ ایک اور دہلی کے طبیب چند روز رہ کر کہنے لگے، کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے تھے، سارے نقائص نکلے، اور جنہیں ہم ہنر سمجھتے تھے، وہ سب عیوب تھے۔" (1)

وحدت شیخ: اسی سلسلہ میں اور ایک بڑی ضروری یاد رکھنے والی بات فرمائی جس سے وحدت شیخ اور وحدت صحبت کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ خصوصًا

---

(۱) الشریعہ ص ۳۹۔ ۴۲

ابتداء اور خامی کی حالت مین اگر ہمارا تعلق کئی شیوخ سے ہویا مختلف رنگ ومذاق کے اہل اللہ کی صحبتوں میں حاضر ہوں ' تواس آزادی وبے قیدی کی بدولت حصول اطمینان کے بجائے انتشار میں مبتلا ہو جانا یقینی ہے ۔" امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان

اور چین بدون تقلید کے نہیں ہوتا ' مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے فلان طبیب کا علاج کریں گے تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے ' بیماری کا خوف نہیں ہو گا ۔ نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا ' کہ کس کا علاج کریں ' اور اگر مقید نہیں ہیں مثلاً ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں ہیں ۔ آج ذرا سا تغیر پیش آیا ' ایک طبیب سے رجوع کیا ' دوسرا تغیر پیش آیا ' دوسرے سے رجوع کیا ' تیسرا پیش آیا ' ' تیسرے سے رجوع کیا ' تو اس میں دل کو چین نہ ہو گا ' ہر وقت فکر رہے گی کہ اب کی تغیر میں کس سے رجوع کریں ۔ "

یہ ایسی مثال حضرت نے دی کہ ظاہری وجسمانی علاج میں اس کا روزانہ ہی تجربہ ہوتا رہتاہے خصوصًا آجکل تو طرح طرح کے طبیبون اور علاج کے نت نئے طریقوں اور طبائع کی بے قیدی و آزادی کی بدولت یہ حال ہے کہ مریض تختہ مشق بن کر رہ جاتا ہے کبھی یونانی علاج کبھی ڈاکٹری علاج 'پھر کبھی اس ڈاکٹر کا کبھی اس ڈاکٹر کا ۔ کبھی یونانی ہے ' تو اس میں بھی کبھی یہ حکیم ' کبھی وہ ' پھر کبھی ہومیوپیتھک ہے ' کبھی قدرتی علاج ہے اس میں نہ صرف بیمار وتیمار دار سب کا اطمینان قلب رخصت ہو جاتا ہے ' بلکہ بارہا مال کی اضاعت کے ساتھ مریض کی ہلاکت کا ظاہری سبب بھی اس طرح تختہ مشق بن جانا ہی ہوتا ہے ۔ بس ایک دفعہ سوچ سمجھ کر معالج کو تجویز کر لیا ' جومہارت وحذاقت میں چاہے اوسط درجہ ہی کاہو ' مگر آجکل کے عام معالجین کی طرح نظر مریض کے مرض سے زیادہ اس کی جیب پرنہ ہو پھر اگر کسی بیماری میں متعدبہ مدت تک اس کے علاج سے نفع نہ ہو تواسی

سے دوسرا معالج بھی تجویز کرا کے اس کے ساتھ شریک کر لے۔

راقم ہذا کا تجربہ ہے ' اپنے اور اپنے گھر بھر کے لیئے یہی طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ اللہ تعالٰی کی رحمت سے ایک بڑے مخلص معالج نصیب ہو گئے ہیں ' جن کی نظر مریض کے مرض اور عنداللہ اجر کے سوا قطعًا کسی چیز پر نہیں ' بس جو بیمار ہوا ان کے حوالہ ' اور الحمد للہ کہ اس کم وبیش پچیس سال کی مدت میں لکھنؤ کے قیام میں کبھی کسی دوسرے معالج سے براہ راست رجوع کی نوبت نہیں آئی ' اور کبھی ضرورت محسوس ہوئی بھی وہ بھی بہت ہی کم تو انہی سے درخواست کر کے انہی کی تجویز سے اور انہی کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کر لیا گیا ' اور اللہ تعالٰی نے دوچار کے سوا جن کا وقت پورا ہو چکا تھا ' باقی سب کو دیر سویر شفاہی عطا فرمائی ۔ اور قلب کو اس سے جو اطمینان رہتا ھے ' اس کا حال توراقم ہی اس تجربہ کی بنا پر خوب جانتا ہے 'کہ بیماری سے قبل اور بیماری کے دوران دونوں میں کتنی بے فکری رہتی ہے ' اللہ تعالٰی ایسے سراپا ایمان واخلاص معالج کو ہم سب کی طرف سے ہزاروں ہزار درجات عطا فرمائے ۔!

اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالٰی کی رحمت نے باطنی امراض کے باب میں حضرت علیہ الرحمتہ سے تعلق تربیت کے بعد دستگیری فرمائی'کہ پھر کسی طرح کی بے قیدی کی ضرورت و نوبت نہیں پیش آئی' حالانکہ تعلیم و تربیت تمامتر ایک ایسی درسگاہ میں ہوئی تھی' جس کا طرہ امتیاز ہی بے قیدی و آزادی ہے ۔ پھر باطن کا یہ مریض باطنی دق کے بالکل آخری درجہ میں تھا' اس لئے اس کی زندگی کا جو رمق بھی رہ گیا' اور جسم و ظاہر کی گوناگوں بیماریوں اور پریشانیوں کے باوجود قلب و باطن میں جو کچھ بھی نام چار کو سکون و اطمینان میسر ہے' وہ حضرت ہی کی ذات و تحریرات کے ساتھ تعلق کا طفیل ہے ۔ بلکہ ظاہر اسباب اس جسم ناتواں کے ساتھ

---

(۱) فرشتہ صفت ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب سلمہ ۔ ۱۲

جان کا رشتہ بھی اسی سے قائم ہے' ورنہ جسم کی بیماریوں اور حالات کی ناسازگاریوں نے اجل مسمٰی کے انتظار کے سوا کچھ چھوڑا نہ تھا۔

جن کو حضرت کی ذات سے تعلق کی سعادت نصیب نہیں ہو سکی' ان کی خدمت میں اپنے ہی نہیں' دوسروں کے بھی کثیر تجربات کی بناء پر عرض ہے' کہ حضرت کی تحریرات کا درجہ بس حضرت کی ذات کے بعد دوسرا ہی ہے - ابتدا خصوصًا مواعظ و ملفوظات سے فرمائی جائے' اور مقدم ملفوظات کو کرنا چاہیے' جس سے بالواسطہ صحبت کا نفع ہو گا - خود حضرت نے بھی براہ راست صحبت میسر نہ آنے کی صورت میں بزرگوں کے ملفوظات ہی کے مطالعہ کی ہدایت فرمائی ہے' بشرطیکہ نیت دینی و باطنی اصلاح و استفاضہ کی ہو' نہ کہ آج کل کی طرح علمی و ادبی تحقیق و تنقید کی - تقویٰ پر ایک وعظ میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا اور قائم رہنے کے سلسلہ میں فرماتے ہیں - کہ

"اس محبت کے قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کیجئے زیادہ نہ ہو تو کم از کم ہفتہ میں ایک ہی بار یا مہینہ میں ایک بار' اس میں خاصیت یہ ہے کہ اس کے اندر جو چیز ہے وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آئے گی' اور میں آپ سے دنیا کے کام نہیں چھڑاتا' اپنی فرصت کے وقت ان کے پاس جا کر رہیئے' اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو' تو ان کے ملفوظات ہی پڑھیئے' لیکن محض تذکرہ اور فن کی کتابوں کی طرح نہ دیکھئے (ص ۱۹)

مجدد وقت کے ملفوظات کو بالخصوص اس لئے پڑھنا چاہئے کہ وہ قدرتاً وقت کے حالات و تجدیدات کے مناسب ہیں بلکہ ابتدا میں قدیم بزرگوں کے ملفوظات پڑھنے سے طرح طرح کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا اندیشہ ہے' خصوصا مبتدیوں اور کم علموں کو - احقر کا واسطہ عمر بھر زیادہ تر اس زمانہ کے حالات و خیالات سے متاثر اور انگریزی دانوں ہی سے رہا' اور ان کو ہمیشہ پہلے حضرت کے ملفوظات پڑھنے کو دیئے' تو نہ صرف دین کے متعلق ان کی طرح طرح کی غلطیوں اور غلط

فہمیوں کا ازالہ ہوا' بلکہ تصوف کے ساتھ نفس دین سے بھی بڑھ کر جو عجیب عجیب بدگمانیاں تھیں' وہ دور ہو کر طالبانہ ذوق و شوق پیدا ہو گیا۔

صحبت سے دین قلب میں رچ جاتا ہے: لہٰذا اہل اللہ کی صحبت سے محض فہم و دین کی بصیرت ہی نہیں پیدا ہوتی' بلکہ صحبت کی بالکل قدرتی و نفسیاتی خاصیت یہ بھی ہے' کہ مصاحب کے اندر جو چیز ہے وہ شدہ شدہ آپ کے اندر بھی آئے گی' مزید برآں آدمی بتکلف و تبعو و عمل بھی اختیار کر لے سکتا ہے' مگر بلا صحبت کے دین قلب و روح میں رچنا یا سرایت بہ مشکل ہی کرتا ہے۔ ایسے عمل کی نوعیت بس زیادہ سے زیادہ ایسے مزدور یا تنخواہ دار نوکر کے کام کی ہوتی ہے' جس کو آجر یا آقا سے کوئی قلبی تعلق نہیں ہوتا' اسی کو مذکورہ بالا وعظ (تقویٰ) میں فرمایا کہ "حضرت عمل تو دوسری چیز ہے لیکن اصل دین وہ ہے جو قلب میں رچ جائے سو یہ صحبت پر موقوف ہے۔

غرض محققین اہل اللہ کی صحبت یا یہ نہ میسر ہو تو کم از کم ان کے ملفوظات وغیرہ کا مسلسل بنظر اصلاح واستفادہ مطالعہ نہ صرف دین کی صحیح فہم و بصیرت کے لئے ضروری ہے' (جو نام ہے باطنی روشنی کا جیسے بصر ظاہری نگاہ کا) بلکہ اس سے اہل اللہ کا ایمان و عمل ہمارے اندر منتقل ہوتا اور قالب سے تجاوز کر کے قلب و روح میں اترتا' یا رچ جاتا ہے۔

لیکن کیا عرض کیا جائے کہ اس بالکل عقلی بلکہ موٹی بات سے اچھے اچھے اہل علم کو ایسی بے پروائی ہے' کہ محض اپنی علمی' بلکہ دراصل محض معلوماتی و تصنیفی قوت اور نرے معلومات کی وسعت کو نہ صرف اپنی صلاح کے لئے کافی سمجھ لیا ہے ' بلکہ اسی بھروسہ پر اصلاح کی مستقل تحریکوں کے امام و علمبردار بن جاتے ہیں' جس کی بدولت اپنی اعلیٰ ذہانت و قابلیت کے باوجود اپنے اور دوسروں کے حق میں ویسے ہی طبیب و معالج بن جاتے ہیں' جس نے کسی طبیب کے پاس باقاعدہ مطب کے بغیر محض کتابی معلومات اور قدرتی ذہانت کے زور پر اپنا اور دوسروں کا علاج

شروع کر دیا ہو، بلکہ امامت کا جھنڈا ہاتھ میں لینے کے بعد کسی کی اقتداء و اتباع کا امکان اور بھی دور تر ہو جاتا ہے! تاہم طلب و تشنگی کے لئے راستہ کبھی بند نہیں، نہ پانی کا قحط ہے ۔

آب کم جو تشنگی آور بدست
تاکہ آبت جو شد از بالا وپست

عشق و محبت

نہ صرف مسلمان صوفیوں کے عالم و جاہل عوام و خواص تمام طبقوں میں عشق و محبت کا لازمہ تصوف یا عین تصوف ہونا مسلم ہے (حتیٰ کہ نام ہی اس کا طریق عشق ہے) بلکہ تمام دیگر مذاہب بلکہ فلسفہ تک میں جہاں کہیں تصوف کے ہم معنی یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ایسی ملتی ہے' جس کو مغربی ادبیات مین سریت (مسٹرزم) کہا جاتا ہے' اس میں بھی بڑا خاص عنصر عشق و محبت کو خیال کیا جاتا ہے ۔ ہمارے مغربی محققین نے تو داد تحقیق یہاں تک دی کہ مسلمان صوفیہ میں عشق و محبت کی تعلیم کو ان ہی بیرونی اثرات سے ماخوذ قرار دے دیا ۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نفس تصوف ہی کو اسلام میں بہت بعد کی اور بیرونی اثرات کی پیداوار کہہ دیا ۔ حالانکہ اسلامی تصوف کی خود محققین صوفیہ کے نزدیک حقیقت یہ ہے 'کہ وہ نام ہے عین اسلام و شریعت بلکہ کمال اسلام و شریعت کا' حتیٰ کہ ہمارے صوفیہ سب سے بڑا صوفی حضرات صحابہ بلکہ خود رسول اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتے ہیں' اور یہی خلاصہ اس باب میں حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کی تجدید کا ہے جیسا کہ اوپر پوری طرح معلوم ہو چکا ۔

اتنا ہی نہیں حضرت نے تو قرآن و حدیث سے تصوف کے تقریباً دو ہزار مسئلے صاف صاف دلالت سے ثابت کر دیئے ہیں' (1) اور فرمایا کہ غور کرتا تو اتنے ہی اور ثابت کر دیتا' اس کی کچھ مثالیں انشاء اللہ آگے اپنے موقع پر آئیں گی ۔ یہاں اس ذکر کا مدعا صرف یہ ہے کہ جس اسلامی تصوف کے دو ہزار اصولی و فروعی

---

(۱) الافاضات الیومیہ حصہ ہفتم ص ۲۰۰ ۔ ۱۲

مسائل خود قرآن و حدیث سے ثابت و مستنبط ہوں' اس میں اب آخر کون سی اہم اور انوکھی بات رہ گئی ہو گی' جس کے لئے اسلامی تصوف ' اسلام کو چھوڑ کر غیروں کا دست نگر ہو سکتا! بات یہ ہے کہ افہام و تفہیم کے لئے بعض رائج الوقت بیرونی تعبیرات و اصطلاحات سے کام لیا گیا' یا غیروں کی بعض محض تدبیری چیزیں تدبیر ہی کے درجہ میں اختیار کر لی گئیں' جیسے کہ پاس انفاس وغیرہ جس کی مثال بقول حضرت مجدد وقت کے ایسی ہی ہے' جیسے غزوہ خندق میں فارسیوں کی خندق کی تدبیر' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بتلانے سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی تھی - اب اگر اس پر کوئی عقلمند محقق یہ داد دینے لگے' کہ اسلامی جہاد ایرانیوں یا فارسیوں کے اثرات سے ماخوذ ہے تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ۔

برین عقل و دانش بباید گریست

اس باب میں ان محققین نے غیر اسلامی اصطلاحات سے بہت دھوکا کھایا ہے' تو ان کی نسبت یاد رکھنا چاہئے کہ "اصطلاحات دو قسم کی ہیں' ایک جو مقاصد سے متعلق ہیں' (جیسے رضا و قرب وغیرہ) وہ تو شریعت سے الگ نہیں' بلکہ مقاصد میں اصطلاحات تصوف کی حقیقت وہی ہے' جو شریعت میں مذکور ہے' دوسری وہ اصطلاحات ہیں جو امور زائدہ کے متعلق ہیں' وہ شریعت سے جدا ہو سکتی ہیں جیسے تجدد امثال توحید و جودی' شغل رابطہ وغیرہ" - (۱)

باقی نفس عشق و محبت کی تعلیم تو اگر ان محققین نے قرآن مجید ہی کو کھول کر دیکھ لیا ہوتا تو نظر آ جاتا کہ صوفی ہونا تو درکنار قرآن کی رو سے تو مسلمان اور مومن ہونے ہی کے لئے اللہ تعالٰی کا عشق و محبت لازم ہے' **الذین امنوا اشد حبا للہ** - اور عشق "اشد حب" کے سوا نام ہی کس کا ہے' اسی طرح حدیث میں

---

(۱) اشرف المسائل ص ۴۴ - ۱۲

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی نسبت ارشاد ہے کہ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کو اس کے ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں -

"عشق لوازم ایمان سے ہے' جب تم نے امنا کہا تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا' جیسے کوئی کہے کہ مجھ پر نان نفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گا' میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا' صرف قبلت النکاح کہا تھا' تو ہر شخص یہی کہے گا کہ قبلت کہنے ہی سے تو شوہری کے حقوق لازم ہو گئے' اسی طرح جب لا الہ الا اللہ کہا بس عاشق ہو گئے' کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہو گئے اور مومن کے بارے میں ارشاد ہے - کہ

والذین امنوا اشد حبا للہ -

یعنی جو خدا پر ایمان لائے وہ خدا کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں' تو تصدیق ایمانی کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہو گئے' تو اب عشق کے حقوق ادا کرو' بس کان مت ہلاؤ' سیدھے محبوب کے کہنے پر چلتے رہو" - (۱)

حب عقلی: البتہ اسلامی تعلیمات جس طرح ہر امر میں افراط و تفریط کی نا استواریوں اور نشیب و فراز سے پاک ہیں' اسی طرح عشق و محبت کے معاملہ میں بھی طبعی یا نفسانی جوش و خروش بے خودی و جامہ دری مامور و مطلوب بالکل نہیں - یوں کسی ضعیف القلب یا مغلوب الحال کا حال ہی یہ ہو جائے' تو وہ معذور ہے - اصل مطلوب و مامور وہی اشد حبا للہ والی حب ایمانی ہے جس کو حب عقلی بھی کہا جاتا ہے نہ کہ حب طبعی یا نفسانی جس کو عرف عام میں عشق کہا جاتا ہے کسی نے ان دونوں کے فرق و فضیلت کی بابت سوال کیا تھا' کہ

"صراط مستقیم میں مولانا اسماعیل صاحب شہید نے حب ایمانی یا عقلی کو حب نفسانی یا عشق پر بہت ترجیح دی ہے' اور طریق عشق کو ایک حد تک مذموم ثابت

---

(۱) الشریعہ ص ۳۳

کیا ہے، حالانکہ بڑے بڑے صوفیائے کرام مولانا رومی مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ وغیرہ نے عشق کی مدح سرائی کی ہے، اس باب میں حضرت کی جو تحقیق ورائے ہو، اس سے مفصل مطلع فرمائیے۔

اب حضرت کا عالمانہ و محققانہ جواب سنیئے۔ پہلے چند مقدمات ہیں،

اول فضیلت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک باعتبار ذات شے کے، دوسری باعتبار اس کی حالت خاصہ کے، پہلی کو فضیلت ذاتیہ کہتے ہیں اور دوسری کو اضافیہ کہنا مناسب ہے، دوم کمالات ولایت مستفاد ہوتے ہیں، کمالات نبوت سے، اس لئے جو کمال ولایت کا جس قدر کمال نبوت سے مشابہ ہو وہ دوسرے کمال سے جو مشابہت میں کم ہے، افضل ہو گا۔ سوم عشق ایک خاص درجہ ہے، محبت کا جس میں ہیجان و غلیان (یا جوش و خروش) ہوتا ہے۔

ان مقدمات کے بعد جاننا چاہئے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں جو صفت محبت الٰہی کی ہوتی ہے، اس میں ہیجان نفسانی نہیں ہوتا اس لئے بالیقین محبت کی یہی نوع فی نفسہ افضل ہو گی، مگر کسی خاص استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے تربیت باطن میں دوسری نوع کا زیادہ نافع و موافق ہو جانا ممکن ہے، جیسے گوشت فی نفسہ افضل الاغذیہ ہے لیکن کسی خاص طبیعت کے لئے آش جو کو اصلح کہا جاتا ہے۔

"پس مولانا شہید رحمتہ اللہ فضیلت ذاتیہ کے مرتبہ میں حب ایمانی کو ترجیح دے رہے ہیں، اور بعض آثار مغلوبیت کے اعتبار سے حب نفسانی کو مضر بتلا رہے ہیں، اور دوسرے حضرات صوفیہ رحمہم اللہ فضیلت اضافیہ کے مرتبہ میں عشق کی مدح کر رہے ہیں، کیونکہ ایسے مضامین اکثر اہل حال کے کلام ہیں وارد ہیں، جن کو تحقیقات عامہ مقصود نہیں، یا عشق سے مراد ان حضرات کی اصطلاحاً مطلق کمال محبت ہو، جو شامل ہے محبت ایمانی کو بھی، اور مقصود مذمت کرنا اس شخص کی ہو، جس میں یہ کمال نہیں، جیسے حدیث میں ہے، لا یومن احدکم حتی

اکون احب الیہ پس دونوں توجیہہ پر مولانا اور صوفیہ کے کلام میں تعارض نہیں رہا، واللہ اعلم" - (۱)

عقلی محبت اختیاری ہے: نیز طبعی اور عقلی یا ایمانی محبت میں ایک اور خاص و عظیم فرق یہ ہے کہ طبعی محبت غیر اختیاری ہوتی ہے، اور اسلام غیر اختیاری چیزوں کی تکلیف نہیں دیتا، بخلاف عقلی و ایمانی محبت کے کہ وہ ہمارے اختیار کی شے ہے - اس کا بڑا مدار عمل پر ہے - مثلاً جس عمل کو ہم ایک مرتبہ عقلاً پسند کر کے اس کو بار بار کرتے رہیں، تو پھر اس سے محبت و انس قدرتاً پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر وہ عمل کسی کے حکم یا اتباع کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے تو کرتے کرتے اس حاکم یا متبوع سے بھی محبت ہو جانا لازم ہے - اس لئے اللہ تعالیٰ نے اختیاری محبت کا سیدھا نسخہ یہ تجویز فرما دیا ہے، کہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا محب و محبوب ہے، زندگی کو اس کے رنگ میں رنگ لو تو آپ سے آپ اللہ کے سچے اور پکے محب و عاشق ہی نہیں، بلکہ محبوب بھی بن جاؤ گے **ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ** -

"عمل میں خاصیت ہے محبت پیدا کرنے کی، تجربہ کر لو، روز روز کسی کے پاس جایا کرو دیکھو محبت ہو جائے گی، پہلے تھوڑی ہو گی، پھر جاتے جاتے ایسا تعلق ہو جائے گا، کہ بہت ہی زیادہ ہو جائے گی وہ جو کہتے ہیں، کہ پالے کی محبت اس کی یہی تو اصل ہے، غرض نیک عمل میں یہ برکت ہے کہ اس سے محبت حق پیدا ہوتی ہے -

"یہاں ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم تو مدت سے نیک عمل کر رہے ہیں مگر محبت پیدا نہیں ہوئی، جواب یہ ہے کہ نیک عمل کے مفہوم میں ایک ہی چیز تو نہیں کہ بس عمل کر لیا، بلکہ وہ مرکب ہے اور اجزاء سے ایک جزء تو عمل کرنا

---

(۱) التکشف عن مہمات التصوف جلد سوم از امداد الفتاویٰ ص ا - ۱۲

ہے اور دوسرا جزء یہ ہے کہ عمل کو اس کے طریق کے مطابق کیا جائے' مثلاً صرف ٹکریں مارنے کو نماز نہیں کہتے' نیک عمل کا جو مامور بہ طریق ہے اس طریق سے کرو - پھر دیکھو' محبت کیسے نہیں پیدا ہوتی' تیسری وجہ اثر نہ ہونے کی یہ ہے کہ تم نے عمل کو صرف عادت سمجھ کرکیا' اس نیت سے نہیں کہ اللہ کی محبت بڑھ جائے' سو اس نیت سے عمل کرو پھر دیکھو انشاء اللہ کیسا اثر ہوتا ہے -

"بہرحال ایک جزء تو اس نسخہ کا یہ ہے کہ نیک عمل میں بہ نیت ازدیاد محبت استقامت کے ساتھ مشغول رہو' دوسری بات ضروری یہ ہے کہ اللہ کا نام لو جی لگا کر' یعنی تھوڑا اللہ اللہ بھی کرو (مگر وہی کہ جی لگا کر تاکہ محض صورت ذکر نہ ہو) تیسری بات یہ ہے اور یہ بہت ضروری ہے کہ اہل محبت کی صحبت اختیار کرو' اس سے لوگ بھاگتے ہیں' اول تو اس طرف توجہ ہی نہیں 'کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جا کر رہیں' بس تھوڑی سی کتابیں پڑھ لیں' اور سمجھ لیا کہ ہم کامل و اکمل ہو گئے' بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و اکمل ہوا ہے " - (۱)

اسی نسخہ کو بعض اور اجزاء کی اعانت سے یوں تجویز فرمایا ہے کہ

"جن چیزوں سے کوئی محبوب ہوتا ہے یعنی انعام و نوال' حسن و جمال اور فضل و کمال وہ ہر طرح سے عقلاً و نقلاً علی وجہ الکمال اللہ ہی میں ہیں' پس وہی مستحق ہیں' تدبیر یہ ہے کہ چند باتوں کا التزام کر لو' ایک تو تھوڑی دیر خلوت میں اللہ اللہ کر لیا کرو' اگرچہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو' لیکن اس نیت سے کہ خدا تعالٰی کی محبت ہو' دوسرے کسی وقت تنہائی میں خدا کی نعمتوں کو سوچا کرو' پھر اپنے برتاؤ کو غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالٰی کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں' اور اس کے باوجود خدا تعالٰی ہم سے کس طرح پیش آ رہے ہیں' تیسرے محبان خدا سے

---

(۱) اشرف السوانح - ۱۲ :

علاقہ پیدا کرو' آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت ہی رکھو' چوتھے خدائے تعالیٰ کے احکام کی پوری اطاعت کیا کرو' کیونکہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے' اس سے ضرور محبت بڑھ جاتی ہے' پانچویں خدا تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ اپنی محبت عطا فرمائیں" -

غرض جو عشق و محبت مامور و مطلوب ہے' وہ طبعی و نفسانی نہیں' بلکہ عقلی و ایمانی ہے جو بالکل اپنے اختیار میں ہے' اور اس کے حصول کا جو نسخہ تجویز فرمایا گیا ہے اس کے بھی تینوں اجزاء بالکل اختیاری ہیں' یعنی (۱) اعمال صالحہ بہ نیت محبت (۲) ذکر اللہ مع الحقیقت (۳) اہل اللہ سے تعلق یا صحبت' جس کی ضرورت پر اوپر مفصل گفتگو گزر چکی -

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق
عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

نیز یہ اعمال صالحہ یہ اتباع سنت والی عقلی و ایمانی محبت کا راستہ وصول الی اللہ کا نہ صرف یقینی و اقرب راستہ ہے بلکہ اسہل بھی اتنا ہے کہ زیادہ مجاہدات کی ضرورت نہیں ہوتی' اصطلاح میں اس کو طریق جذب بھی کہتے ہیں' کیونکہ اس میں چونکہ سب سے بڑے محب و محبوب الٰہی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نقل و اتباع ہوتی ہے' اس لئے قدرتاً اپنے کامل ترین محب و محبوب کے متبع یا نقل اتارنے والے کی خود حق تعالیٰ کی طرف سے کشش یا انجذاب ہوتا ہے' کسی موقع پر فرمایا کہ

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے سلسلہ میں جو اس قدر جلد وصول الی اللہ ہوتا ہے' حالانکہ نہ یہاں کچھ زیادہ ریاضات ہیں' نہ مجاہدات' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وصول بطریق جذب ہوتا ہے' بطریق سلوک نہیں' اور یہ جذب برکت ہے اتباع سنت کی' کیونکہ اتباع سنت کا ثمرہ بوجہ تشبہ

بالمحبوب کے محبوبیت عند اللہ ہے' اور محبوبیت کے لئے جذب لازم ہے" - (۱)

محبوب سے ظاہری شباہت بھی کسی کو ہو تو اس کی طرف کشش قدرتی بات ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی بھی توجہ کی جلد امید ہے' حضرت خواجہ (عزیز الحسن مرحوم) نے خوب فرمایا کہ۔

ترے محبوب کی یا رب شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں

اللہ تعالیٰ ہم کو اتباع سنت کی توفیق بخشیں اور خواجہ صاحب کی اس دعا کو اپنے تمام متبع سنت بندوں کے حق میں قبول فرمائیں -

محبت کا مدار مناسبت پر: اسی عشق و محبت کے سلسلہ میں شریعت و طریقت کے جامع مجدد علیہ الرحمہ نے ایک اور بڑی لطیف بحث فرمائی ہے' جو صوفیہ اور اہل محبت سے بھی زیادہ ہمارے خشک علماء کے سننے اور سمجھنے کی ہے - خلاصہ یہ ہے کہ محبت کا مدار مناسبت پر ہے' اور یہ مناسبت انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمام مخلوقات سے زیادہ حاصل ہے ' جس کو حضرات صوفیہ مظہر اتم ہونے سے تعبیر فرماتے ہیں' اور جس پر احقر کے نزدیک خود اللہ تعالیٰ ہی نے سند خلافت اور **نفخت فیہ من روحی** سے سرفراز فرما کر قرآنی شہادت کی مہر لگا دی ہے' کیونکہ کسی کا خلیفہ وہی ہو سکتا ہے' جس کو ظاہراً و باطناً مستخلف سے زیادہ سے زیادہ مناسبت و مشابہت ہو - اگر خلافتی تصرفات سے ظاہری مناسبت عیاں ہے تو **من روحی** سے باطنی' اس لئے اگر یہ احسن تقویم کی بلندی سے اسفل سافلین کی پستی میں پھینک دیئے جانے کا راستہ خود ہی نہ اختیار کر لے' تو اس کا مطلوب و محبوب اللہ تعالیٰ کے سوا ہو ہی کون سکتا ہے -

---

(۱) اشرف السوانح ص ۳۳۸ حصہ دوم ۱۲

خلق اللہ ادم علٰے صورتہ کا مطلب : "اور محبوب کون ہوتا ہے، وہی جس سے مناسبت ہو تو قلب کو جس سے مناسبت ہو گی وہی محبوب ہو گا میں نے ایک باپ سے سنا ہے کہ مجھ کو بڑے بیٹے سے محبت زیادہ ہے، وجہ یہ ہے کہ وہ میرا سا ہے، یعنی مجھے اس سے مناسبت ہے، سو برہان و وجدان سے ثابت ہو چکا ہے کہ قلب کو پوری مناسبت صرف حق سبحانہ سے ہے، اور اسی مناسبت کی نسبت شہادت دی ہے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ان اللہ خلق ادم علی صورتہ یعنی اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

"یہاں صورت کے معنی شکل کے نہیں، بلکہ وہی مناسبت ہے، جس کو صوفیہ نے ایک خاص عنوان سے کہا ہے جسے علمائے خشک قبول نہیں کرتے، کہ انسان مظہر ہے حق تعالٰی کا اس لفظ سے چونکتے ہیں، جو حقیقت میں اس حدیث کی تفسیر کا عنوان ہے، اور بدون اس تفسیر کے سخت اشکال پڑتا ہے، جس سے بچنے کے لئے بعضوں نے ضمیر کا مرجع آدم کو بنایا ہے مگر بعض روایات میں بجائے صورتہ کے صورۃ الرحمٰن آیا ہے، اس کو کیا کریں گے، اس کے جواب میں یہ کہہ دیا کہ راوی نے اپنے اجتہاد سے روایت بالمعنی کر دی ہے، میں کہتا ہوں کیوں تکلف کرتے ہو جو تفسیر صوفیائے کرام نے کی وہ نہایت بے تکلف و سہل ہے"۔

کیونکہ صورت اصل میں اسی کو کہتے ہیں، جس کے واسطہ سے کوئی شے ظاہر ہوتی ہے، اور چونکہ حق تعالٰی کی ذات و صفات کا سب سے بڑا اتم ظہور انسان ہی کی ذات و صفات سے ہوا ہے، اس لئے اس کو تمام دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں اللہ تعالٰی نے گویا اپنی ہی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔

"یہ دیکھئے کہ صورت کسے کہتے ہیں، اگر کہو کسی چیز کی شکل کو کہتے ہیں مانا، مگر اس کو کیوں کہتے ہیں، اصل میں صورت کی حقیقت ظہور ہے، چنانچہ یہ بھی محاورہ ہے کہ صورۃ المسئلتہ کذا، یعنی فلاں مسئلہ کی صورت یہ ہے اور یوں بھی کہتے ہیں، کہ اس کام کے بننے کی کیا صورت ہے تو یہاں صورت کے معنی

ظہور کے ہیں، اور چہرہ کو بھی صورت ظہور ہی کے معنی میں کہتے ہیں، کہ اس
سے حقیقت انسانیہ کا ظہور ہوتا ہے"۔

آگے اس حقیقت باطنہ کو بالکل ظاہر فرما دیا ہے کہ وہی "من روحی" والی روح یا انا ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ

"یہ حقیقت وہ ہے جس کو انا سے تعبیر کرتے ہیں، اور وہ روح ہے، اور وہ ایک مخفی چیز ہے، چونکہ روح ایک خفی چیز تھی، جسے کالبد سے ظاہر فرمایا، اس لئے کالبد کو اس کی صورت کہہ دیا تو اصل معنی صورت کے ظہور کے ہوئے۔

"اب سمجھئے کہ خلق ادم علی صورتہ کے معنی ہیں علی ظھورہ یعنی خدا نے آدم کو اپنے ظہور پر پیدا کیا، یعنی آدم کو پیدا کر کے اپنے صفات کو ظاہر کر دیا، گو اور مخلوقات سے بھی صفات کا ظہور ہوتا ہے، مگر انسان چونکہ سب سے زیادہ جامع کمالات ہے، اس لئے اس سے زیادہ ظہور ہوتا ہے، اسی واسطے اس کو مظہر اتم کہتے ہیں۔

"صوفیہ نے کیا کہا، وہی انہوں نے بھی کہا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، صرف اصطلاح بدل دی، یہ ان کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لئے اصطلاحیں مقرر کر لی ہیں، علمائے خشک جو ان کی اصطلاح نہیں سمجھتے، اعتراض کر دیتے ہیں، جو واقع میں خود اپنی فہم پر ہوتا ہے، اور محققین کی عادت ہوتی ہے، کہ طالب کے سامنے تو نکات کو ظاہر کر دیتے ہیں، لیکن معاند کے اعتراض سن کر بھی خاموش رہتے ہیں، بلکہ اپنے متوسلین کو بھی اظہار سے منع کرتے ہیں ؎

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی
بگذار تا بمیرد و رنج خود پرستی (۱)

---

(۱) الشریعہ از ص ۱۴ تا ص ۱۶۔ ۱۲

حمل امانت کی توجیہہ : غرض تمام مخلوقات میں چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناسبت و مشابہت زیادہ حاصل ہے' اس کی بناء پر اس کو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا عاشق بھی ہونا چاہئے ابتدائے طالب علمی میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "انسان کی حقیقت حیوان عاشق ہے' اس کی فصل عاشق ہے' کیونکہ ناطق تو جنات و ملائکہ بھی ہیں' (۱) بلکہ حضرت تو اس کے قائل ہیں' کہ تمام مخلوقات حیوانات و نباتات حتیٰ کہ جمادات بھی عاقل ہیں' ہاں یہ مسلم ہے کہ ان میں اتنی عقل نہیں' جو تکلیف کے لئے کافی ہو - حمل امانت کی بھی ایک دلچسپ توجیہ حضرت نے انسان میں غلبہ عشق ہی سے فرمائی ہے - اللہ تعالیٰ سے غایت مشابہت کی بناء پر عشق تو تھا ہی' اور معشوق کے حکم و خوشی کے پورا کرنے میں چوں و چرا شان عشق نہیں' بس اس دیوانگی میں کچھ سوچ سمجھے بغیر اپنے کو پیش کر دیا -

"بہرحال انسان کے حمل امانت کا منشاء عشق تھا' اور اس کو میں نے حافظ شیرازی کے کلام سے سمجھا ہے' فرماتے ہیں۔

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اس میں لفظ دیوانہ سے منشاء حمل امانت پر اشارہ ہے' اور اسی کلام سے معلوم ہو گیا کہ عشق دیوانگی کا نام ہے' جو محبت کے علاوہ درجہ ہے - (۳)

"البتہ حق تعالیٰ کی محبت میں شان عقلیت غالب ہوتی ہے' اور اپنے ہم جنس کی محبت میں شان طبیعت غالب ہوتی ہے' اور سرسری نظر میں محبت عقلی محبت طبعی کے سامنے مضمحل معلوم ہوتی ہے' حالانکہ امر بالعکس ہے' چنانچہ اس محبوب طبعی سے نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی شان کے خلاف کوئی معاملہ قولی یا فعلی صادر ہو تو

---

(۱) وعظ التحصیل والتسہیل ص ۳۶ - ۱۲
(۲) ایضاً ص ۴۴ - ۱۲
(۳) ایضاً ص ۳۶ - ۱۲

وہی محبوب فوراً مبغوض ہو جائے" - (۱)

یہ ایک طالب کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا تھا' جن کو یہ شبہ ہو گیا تھا' کہ وہ حضرت علیہ الرحمتہ کے ساتھ محبت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کم محسوس کرتے ہیں -

حق تعالیٰ میں اسباب محبوبیت بدرجہ کمال جمع ہیں : پھر کسی سے محبت کے عقلاً جو اسباب ہو سکتے ہیں' وہ بالذات اور بدرجہ اتم و اکمل اللہ تعالیٰ ہی میں موجود ہیں -

"کسی سے جو محبت ہوتی ہے' اس کی وجہ یا کمال ہے' یا جمال یا نوال (یعنی داود دہش) تو معلوم ہوا کہ محض ذات سے محبت نہیں ہوتی' کسی صفت کی وجہ سے ہوتی ہے' اب دیکھو یہ صفتیں بالذات کس کی ہیں' جس میں یہ اوصاف بدرجہ اکمل ہوں گے' وہ زیادہ محبوب ہو گا' تو اس میں مسلمان کو تو شبہ نہیں ہو سکتا' کہ سب سے زیادہ کمال کے ساتھ یہ اوصاف خدا ہی میں پائے جاتے ہیں"۔

غرض مسلمان یا مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عقلی محبت میں اشد ہونا بالکل لازمہ ایمان ہے - یہی نہیں بلکہ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اس کو جس شے سے محبت ہوتی ہے وہ دراصل محبت حق ہی کا ظل و پر تو ہوتی ہے' کیونکہ جہاں کہیں جو بھی جمال و کمال پایا جاتا ہے' وہ کمال حق ہی کا پر تو ہے -

"ہر کمال کمال خداوندی ہی کا ظل ہے تو ہر شخص اگرچہ وہ کسی کا عاشق ہوا ' واقع میں وہ کمال خداوندی کا عاشق ہے' اور اس کی ایسی مثال ہے ' جیسے ایک شخص نے دیوار پر دھوپ دیکھی' اور اس کی وجہ سے وہ دیوار کا عاشق ہو گیا' حالانکہ یہ واقع میں دیوار کا نہیں آفتاب کا عاشق ہے کیونکہ دیوار کا عشق ایک کمال کی وجہ سے پیدا ہوا یعنی نور جو واقع میں آفتاب کا کمال ہے نہ کہ دیوار کا یہی وجہ ہے کہ جب آفتاب چھپ جاتا ہے اور وہ نور

---

(۱) اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۲۷ - ۱۲

زائل ہو جائے، تو عشق بھی زائل ہو جاتا ہے۔

عشق با مردہ نباشد پائدار
عشق راباحی و با قیوم دار
عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود عاقبت ننگے بود

عقلی محبت کا لازمہ: لیکن سب سے زیادہ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس عقلی عشق و محبت کا لازمہ یہ ہونا چاہئے "کہ اس دنیا میں بھی محب کے ذمہ محبوب کے جو حقوق ہوتے ہیں اسی طرح کا تعلق ہم کو حق تعالیٰ سے رکھنا چاہئے'

دیکھئے کہ عاشق کو معشوق سے کس قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اس کے دل میں معشوق کی کتنی عظمت و وقعت ہوتی ہے، کیا اگر معشوق یہ حکم دے کہ تم میرے پاس آؤ یا گرمی کے وقت چلچلاتی ہوئی دوپہر میں چار کوس تک برہنہ پا چلے آؤ، تو کیا عاشق انکار کرے گا، یا اس سے اس حکم کے مصالح پوچھے گا، اگر اس کو سچا عشق ہے، تو بلانے سے دوڑا ہوا آئے گا اگر کوئی روکنا بھی چاہے تو ہرگز نہ رکے گا، غرض کسی قسم کے امرونہی میں اس کو ذرا بھی پس و پیش نہ ہو گا لوگ اس کی حرکات پر اس کو دیوانہ بتلائیں گے پاگل کہیں گے، مگر اس کو اس سے ذرا عار نہ ہو گا اور کہے گا۔

ما اگر قلاش دگر دیوانہ ایم
مست آن ساقی و آن پیمانہ ایم

"سب جانتے ہیں، کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے، تو اس کی یاد کسی وقت دل سے نہیں اترتی، اور دوسرے اس کے ہر حکم کو گوش قبول سے سنتا ہے، کبھی ایسا نہیں ہوتا، کہ عاشق سے محبوب کے کسی حکم میں بھول چوک یا نافرمانی کا ظہور ہو، کیونکہ بھول ہمیشہ اس کام میں ہوا کرتی ہے، جس کی جانب

پوری توجہ نہ ہو' اور جو چیز ہر وقت قلب پر مستولی ہو' اس میں بھول کا ہونا عادۃً ممکن نہیں" ۔

بس حضرات صوفیہ کے ہاں جس عشق پر اتنا زور ہے' کہ ان کا سارا دین و مذہب ہی عشق معلوم ہوتا ہے' وہ حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کی تجدید و اصلاح کے مطابق طبعی و نفسانی جوش و خروش کا نہیں بلکہ ایمانی و عقلی محبت کے اس استیلائی درجہ کا نام ہے' جس میں محبوب کی طرف توجہ اور اس کی یاد و اطاعت کے سوا دل و دماغ میں ماسوا کی قطعاً گنجائش ہی نہیں رہتی' اسی کو سرآمد صوفیہ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں ۔

عشق آن شعلہ است چون بر فروخت
ہر کہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

عشق و تفویض : اس ایمانی عشق کا منصوص و معروف نام تفویض ہے' ارضاء الحق نام وعظ میں ارشاد ہے کہ

"عشق کی حقیقت تفویض ہے کہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے' جس طرح چاہئیں ہم میں تصرف کریں تشریعًا بھی تکوینًا بھی اور ہم ہر حال میں راضی رہیں' یہی حقیقت ہے تفویض کی" ۔

"ایک عجیب نکتہ کسی ملفوظ میں یہ بیان فرمایا کہ "شیطان جو مردود ہوا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ سالک محض تھا' جذب و محبت کا مادہ بالکل نہ تھا ورد اس بے ادبی سے اعتراض نہ کرتا' اس لئے سالک محض (خشک اہل عمل) کی حالت خطرہ سے خالی نہیں - چاہئے کہ جذب کا مادہ بھی پیدا کریں' جس کا طریقہ کثرت ذکر اور صحبت اہل محبت ہے" - (۱)

اور یہ ایمانی عشق لا الہ الا اللہ پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ ہے' کیونکہ غیر اللہ

---

(۱) اشرف المسائل ص ۱۷ - ۱۲

سے جتنے تعلقات ہیں، وہ ان کے آلہ و معبود یا نافع و ضار ہونے ہی کی غلطی و غلط فہمی سے ناشی ہیں، جس کی خود قرآن مجید نے شدت سے نفی فرمائی ہے، افتعبدون من دون اللہ مالا ینفعکم شیئا ولا یضرکم خود مولانا (روم) اسی مذکور بالا شعر کے بعد فرماتے ہیں، کہ

تیغ لا درقتل غیر حق براند
درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند
ماند الا اللہ باقی جملہ رفت
مرحبا اے عشق شرکت سوزرفت

دنیوی عشق یا استیلائے محبت کا لازمہ بھی یہی سمجھا جاتا ہے، کہ غیر پر نظر نہ پڑے مولانا نے مثنوی میں ایک حکایت بیان فرمائی ہے کہ

"ایک شخص ایک عورت کے پیچھے چلا، اس نے پوچھا کہ تو میرے پیچھے کیوں آتا ہے، کہنے لگا میں تجھ پر عاشق ہو گیا ہوں، اس نے کہا کہ میرے پیچھے میری بہن آ رہی ہے 'وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے، ہوسناک تو تھا ہی فورا پیچھے لوٹا، جب لوٹنے گا تو اس عورت نے ایک دھول رسید کیا، اور

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی
در بیان و دعوئے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر
نیست این دعوائے عشق اے بے ہنر

کہ مردود اگر تو عاشق تھا تو غیر پر کیوں نگاہ کی، یہ کیسی محبت کہ دعویٰ خدا کی محبت کا اور تعلق دوسروں سے" ۔

عشق مجازی کی حقیقت : اس حکایت کے سلسلہ میں عشق مجازی کی حقیقت ذرا کان کھول کر سن لینی چاہیئے، کیونکہ تصوف کو بدنام کرنے والے بہت سے جاہل ہوسناکوں نے اس کو اپنی ہوس رانی کا پردہ بنانا چاہا ہے، حدیث میں ہے

کہ

من عشق فعف وکتم فمات مات شہیدا۔

یعنی جو شخص کسی پر (بلا اختیار) عاشق ہو جائے پھر عفیف رہے' اور پوشیدہ رکھے پھر مر جائے تو وہ شہید مرے گا۔

اس حدیث میں دو مسئلے ہیں' پہلا یہ کہ عشق غیر اختیاری مطلق مذموم نہیں (جیسا کہ) بعض خشک مزاج اس کو عیوب میں شمار کرتے اور عاشق کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں' اور مذموم کیسے ہو سکتا ہے ' جب کہ شہادت تک پہنچاتا ہے' اور اسی وجہ سے بعض اہل طریق اس کو مدح کرتے اور وصول الی المقصود کے اسباب میں کہتے ہیں' عارف جامی فرماتے ہیں۔

متاب از عشق اوگرچہ مجازی است
کہ آن بہر حقیقت کارسازی ست

اور عارف رومی فرماتے ہیں۔

عاشق گرزین سرو گر زان سرست
عاقبت مار ابدان شہ رہبر ست

"دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس عشق کے محمود و موصل الی المقصود ہونے کی شرط یہ ہے' کہ معشوق مجازی کی طرف قطعاً التفات نہ ہو' نہ اس کی طرف نظر کرے' نہ اس کا کلام سنے حتیٰ کہ اس کی طرف قلب سے بھی توجہ نہ کرے (یعنی دل میں بھی تصور نہ لائے) اور یہی مراد ہے جامی کے قول سے جو شعر بالا سے متصل ہی ہے۔"

ولے باید کہ برصورت نمانی
وزین پل زود خود را بگذرانی

اسی طرح عارف رومی کا قول شعر بالا کے تھوڑی دور بعد ہے۔

عشقہائے کزپئے رنگے بود

عشق نبود عاقبت ننگے بود

اور راز اس میں یہ ہے کہ مقصود حقیقی تک پہنچنے کی بڑی شرط ماسوا سے قطع تعلق کرنا ہے، اور عشق بجز محبوب کے سب سے تعلقات کو قوت کے ساتھ قطع کر دیتا ہے، جیسا کہ عارف رومی فرماتے ہیں ؎

عشق آن شعلہ ست چون بر فروخت
ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

تو محبوب مجازی کا ماسوا تو اس عشق مجازی سے فنا ہو گیا، پھر جب اپنے نفس کو اس محبوب مجازی سے بالکل الگ کر کے مراقبات و اذکار سے ہمہ تن محبوب حقیقی کی طرف توجہ کر کے اس کے قریب کر دیا، پس تعلقات رخصت ہو گئے اور صرف واحد محبوب حقیقی باقی رہ گیا جیسا کہ شعر بالا کے بعد ہی مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

تیغ لادر قتل غیر حق براند
درنگر آخر کہ بعد لاچہ ماند
ماند الا اللہ و باقی جملہ سوخت
مرحبا اے عشق شرکت سوز، زفت

عشق مجازی کو حقیقی میں مبدل کرنے یا اس کو عشق حقیقی کا ذریعہ بنانے کے لئے جو شرائط ہیں، ان کی تفصیل التکشف میں فرمائی ہے، کہ اگر اتفاقاً و بلا قصد عشق مجازی میں مبتلا ہو جائے،

"تو اول عفت و پارسائی اختیار کرے، کوئی امر خلاف شرع نہ کرے، نہ قصداً اس کو دیکھے، نہ اس سے باتیں کرے، نہ اس کی باتیں کرے نہ دل میں قصداً اس کا خیال کرے، کیونکہ مخالفت شرع عشق حقیقی کے منافی ہے، اور منافی کے ہوتے کب امید ہے کہ عشق حقیقی حاصل ہو (۲) دوسرے اس سے ایسی دوری اختیار کرے، کہ اتفاقاً بھی اس پر نظر نہ پڑے، نہ آواز کان میں پہنچے، تاکہ قلب

میں سوز و گداز پیدا ہو' (۳) تیسرے خلوت و جلوت میں یہ سوچا کرے کہ اس کا کمال یا حسن و جمال کہاں سے آیا' اور کس نے عطا کیا' جب موصوف مجازی کی یہ دلربائی ہے تو موصوف حقیقی کی کیا شان ہو گی۔

چہ باشد آن نگار خود
کہ بہ بندد این نگار ہا

"اس سے اس کا عشق مجازی مخلوق سے خالق کی طرف مائل ہو جائے گا' یہی معنی ہیں اس قول کے کہ شیخ کامل عشق مجازی کا ازالہ (یعنی اس کو فنا) نہیں کرتا' بلکہ امالہ (یعنی معشوق حقیقی کی طرف مائل) کر دیتا ہے' جس طرح انجن گرم ہو مگر الٹا چلتا ہو' تو قطع مسافت کرنے والے کو مناسب نہیں کہ اس کو بجھا دے' بلکہ اس کی کل پھیر کر سیدھا چلا دے۔

اور بعض مشائخ نے جو بعض طالبین کو قصداً عشق مجازی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے' اس سے حلال عشق مراد ہے (مثلاً بی بی سے) نہ کہ حرام ' کیونکہ معصیت تو موصل الی اللہ ہو ہی نہیں سکتی' اور جو اس مشورہ سے غرض ہے' وہ عشق حلال سے بھی حاصل ہے' کیونکہ عشق میں گو وہ مجازی ہو' یہ خاصیت ضرور ہے' کہ اس سے قلب میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے' اور دوسروں کے تعلقات قلب سے دفع ہو جاتے ہیں' اور خیال میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے' اب صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے کہ اس تعلق کو حق تعالٰی کی طرف پھیر دیا جائے تو بہت آسانی سے قلب خالی ہو جاتا ہے۔

" جیسے گھر میں جھاڑو دے کر سب خس و خاشاک ایک جگہ جمع کرلیتے ہیں پھر کسی ٹوکرے میں اٹھا کر باہر ایک دم پھینک دیتے ہیں ' اگر ایک ایک تنکا اٹھا اٹھا کر پھینکا جائے طویل مدت صرف ہو ' پھر بھی اس قدر صفائی نہ ہو ' غرض مقصود اصلی ترک تعلقات یا قلب میں رقت سوز و گداز پیدا کرنا ہے ' جو اگر اور طریقہ سے حاصل ہو جائے تو بھی کافی ہے "۔

اور آج کل خصوصًا اور طریقے ہی مناسب ہیں۔

"چونکہ اس زمانہ میں اس طریق کے اندر خطرہ شدید ہے' کیونکہ نفوس میں شہوت پرستی و لذت جوئی زیادہ ہے' اس لئے قصداً ایسے طریق کا بتلانا جائز نہیں' ہاں اگر اتفاقاً مبتلا ہو جائے تو بطریق مذکور اس کا امالہ عشق حقیقی کی طرف کر دینا چاہئے' (تکشف جلد سوم ص ٦' ٥)

لیکن یہ پھر ایک مرتبہ سن لینا اور خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ اس استیلائی محبت "یا جملہ سوز" اور "شرکت سوز" عشق کی گرمی۔

"حاصل اس طرح ہوتی ہے کہ کسی گرمی والے کے پاس رہے' اور اس کی ہدایت کے بموجب عمل کرے' اور یہی وہ چیز ہے ' جو سینہ بسینہ چلی آتی ہے' نہ مولوی بن کر حاصل ہوتی ہے' نہ مورخ' اور یہ کوئی عجیب بات نہیں' اس کے سوا بھی اکثر ایسے کام ہیں' جو سینہ بسینہ چلے آتے ہیں اگر کوئی ساری خوان نعمت حفظ کر لے' مگر جب تک کسی کامل استاد کے پاس نہ رہے باورچی گری نہیں آ سکتی' اسی طرح اگر کوئی کتاب دیکھ کر کرتے' اچکن وغیرہ کی کاٹ ازبر کر لے' تو اس کو درزی کا کام نہیں آ سکتا' تصوف کے سینہ بسینہ ہونے کے یہی معنی ہیں' نہ یہ کہ مسئلے سینہ بسینہ ہیں' کیونکہ مسائل تو تمام کتابوں میں موجود ہیں' بلکہ وہی ایک نسبت ہے جس کو گرمی سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ سینہ بسینہ چلی آتی ہے" - (۱)

---

(۱) الرفیق ص ۸۱ - ۱۲

باطنیت

تصوف کی باطنیت یا سینہ بسینہ ہونے کی شہرت، تصوف کے دوستوں اور دشمنوں سب کے لئے بڑے فتنہ کا سامان رہی ہے۔ جاہل غیر محقق نام نہاد صوفیوں کے لئے تو اس کی بدولت الحاد و اباحت تک کا راستہ صاف ہو گیا۔ جس ہوا و ہوس کی ظاہری کتاب و سنت میں گنجائش نہ دیکھی اس کو باطن کا علم یا سینہ بسینہ راز بتا دیا۔ دوسری طرف علمائے ظاہر ایسی باتوں سے متوحش ہو کر سرے سے تصوف ہی کے منکر و دشمن ہو گئے۔ حالانکہ اس کو علم باطن کہنے کے اصلی و صحیح معنی وہی تھے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی کہ اس علم کا خاص تعلق خاص موضوع بحث قالب و ظاہر کے بجائے قلب و باطن کے احکام، اس کے امراض اور ان امراض کا معالجہ ہے۔ اور جو شریعت کا اسی طرح ایک حصہ ہے، جس طرح فقہ ظاہر و جوارح کے احکام کا۔ اور جس طرح فقہ کے ظاہری احکام تمامتر کتاب و سنت ہی میں منصوص یا اسی سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح تصوف کے باطنی احکام بھی بالکلیہ قرآن و حدیث ہی کے منصوصات یا ان ہی پر مبنی ہیں۔

اخفاء کی وجہ: باقی کچھ چیزیں تو ہر علم و فن ہی میں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا تعلق یا تو ذاتی تجربہ سے ہوتا ہے اس لئے وہ بغیر اس تجربہ سے گزرے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتیں، اور اندھے کے حق میں کھیر ٹیڑھی بن جاتی ہیں۔ اس لئے ان کی تعبیر بجائے تفہیم کے الٹے غلط فہمی کا موجب ہو جاتی ہے، جیسا کہ عام ذوقیات و وجدانیات یا صوفیانہ کیفیات و مکاشفات وغیرہ کا حال ہے۔ پھر یہ بھی تجربہ ہی کی بات کہ ان کے اظہار سے اکثر اپنا باطنی نقصان بھی ہوتا ہے، اس لئے بھی ان کا اخفا ضروری ہے۔

"تصوف کے اجزاء بہت سے ہیں، منجملہ ان کے احوال بھی ہیں، ان کو کسی سے بیان نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہ اپنے خاص معاملات ہیں خدا کے ساتھ جن کے

ظاہر کرنے سے اپنا باطنی نقصان ہوتا ہے - نیز ایک جزء اس میں علم مکاشفہ و اسرار بھی ہیں' ان کو بھی کسی کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہئے - کیونکہ اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے - اور بہت سی غلط فہمیاں سننے والوں کو ہو جاتی ہیں جن سے ان کا بہت نقصان ہوتا ہے - اگر کسی شخص نے کبھی آم نہ کھایا ہو اور اس کے سامنے آم کی کیفیت بیان کی جائے تو کیسی ہی جامع حقیقت بیان کرو' لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی اسی لئے کسی نے کہا ہے کہ

پر سید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم کہ چو مای شوی بدانی

اور وجہ یہ ہے کہ امور وجدانیہ وجدان ہی سے سمجھ میں آتے ہیں' اور وجدان محض سننے سے پیدا نہیں ہوتا - (۱)

اسی طرح ایک ملفوظ میں ارشاد ہے کہ "اپنے حالات و اسرار پر کسی کو مطلع نہ کرنا چاہئے' اگرچہ کوئی کتنا ہی مخلص دوست ہو- ایسا کون ہو گا کہ اپنی بی بی کو کسی دوست کی بغل میں دینا گوارا کرے" (اشرف المسائل ص ۲۰)

ایک اور وجہ : یہ تو وجدانیات و ذوقیات کی اخفاء کی وجہ تھی - علاوہ برین بعض باتیں ماہر علم و فن کی ایسی پیچیدہ و دقیق ہوتی ہیں کہ ہر کس و ناکس ان کے فہم کی استعداد نہیں رکھتا -

"مولانا روم ایسے ہی نازک مضامین کی نسبت فرماتے ہیں۔

نکتہا چوں تیغ پولا دست تیز
گر نہ داری تو سپر واپس گریز
پیش این الماس بے اسپر میا
کزبر یدن تیغ رابنودن حیا

---

(۱) الرفیق ص ۲۵

اور اسی واسطے ابن العربی نے کہا کہ یحرم النظر فی کتبنا کہ ہماری کتابوں کا دیکھنا حرام ہے - رہا یہ شبہ کہ جب ان کی کتاب کے دیکھنے کی اجازت نہیں تو پھر لکھا کیوں تو انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے جیسوں کے لئے لکھا ہے - (۱)

بعض اور مصالح : اس کے علاوہ بعض ضمنی مصالح و منافع کی بنا پر بھی تصوف کی تعلیم میں کچھ اخفاء سے کام لیا جاتا ہے' مثلا ہر شخص کو اس کی خاص حالت و استعداد کے موافق اس تعلیم سے نفع ہوتا ہے - دوسرا اگر اس کی ریس کرنے لگے تو الٹے ضرر کا اندیشہ ہے - یا اسی طرح اخفاء و خلوت کے اہتمام کے ساتھ جو بات کہی جائے' تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے -

> "چنانچہ جو محقق ہیں وہ دماغی قوت اور فرصت کو دیکھ کر تعلیم کرتے ہیں' اور سب کو الگ الگ بتلاتے ہیں اور اسی وجہ سے تصوف کی تعلیم مخفی ہے کہ ہر ایک کا حال جدا ہے' تو علانیہ تعلیم میں احتمال ہے کہ ایک طالب براہ ہوس دوسرے کی تعلیم پر بلا اجازت عمل کرنے لگے یہ وجہ ہے مخفی تعلیم کی نہ اس وجہ سے جو کہ مشہور ہے' کہ تصوف کے مسائل سینہ بسینہ علاوہ شریعت کے چلے آتے ہیں - دوسری حکمت اس میں ہے کہ خلوت کی بات خصوصیت کی سمجھی جاتی ہے اور اس کی قدر زیادہ ہوتی ہے" - (۱)

غرض کسی بات کا کسی مصلحت سے اخفا نہ فی نفسہ کوئی جرم و گناہ ہے' اور نہ صرف تصوف کے ساتھ خاص کہ اس کی وجہ سے اس سے توحش جائز ہو - رہا جاہل یا نفس پرست نام کے صوفیوں کا اس سے ناجائز کام لینا سو وہ بھی تصوف کے ساتھ خاص نہیں - جہلا اور اہل غرض ظاہر شریعت میں کب اس سے باز رہتے ہیں - باقی مخلص و متقی محققین یا ان کے مقلدین کے لئے جب کتاب و سنت کی

---

(۱) التقوی ص ۱۵ - ۱۲

کسوٹی الحمد للہ موجود ہے' تو وہ کھوٹے کھرے کی تمیز ہر وقت کر سکتے ہیں ۔

اور حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کی تجدید و تحقیق کا یہ معیار تو اس درجہ بلند تھا کہ تصوف کی مقبول سے مقبول تعلیم کو بھی جہاں اس معیار سے گری یا مشکوک ہوئی تو بے تکلف ترک فرما دیتے تھے یا اگر خود گنجائش بھی نظر آتی' مگر طالب کے شک میں پڑ جانے کی وجہ سے اس کو خلجان ہونے کا اندیشہ ہوتا' تو اس کو ترک ہی کا مشورہ دیتے ۔ اسم ذات کا ذکر صوفیہ کے سارے سلاسل میں کیسا مقبول و مسلم ہے ۔ خود احقر کو پہلے اس میں شک ہوا' کہ خالی اللہ اللہ کے ذکر کی کوئی اصل و سند نہیں معلوم ہوتی پھر خیال ہوا "واذ کرسم ربک اور ذکر اسم ربہ فصلی وغیرہ سے ذکر اسم ذات بھی مراد ہو سکتا ہے ۔ تاہم حدیث میں ہر موقع اور ہر قسم کے اذکار کی تعلیم پائی جانے کے باوجود اسم ذات کی تعلیم نہ ہونا یا صحابہ میں اس کا کوئی اثر تک نہ ملنا سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ آخر اس بارے میں حضرت سے مکاتبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ احقر کو اس سے بالکلیہ منع فرما دیا ۔ اور خود حضرات صوفیہ کی تعلیم میں اس کے رواج عام کا منشا نفس ذکری حیثیت کو نہیں بلکہ مشق و تمرین کی حیثیت کو قرار دیا ۔

اسی طرح ذکر جہر و ضرب کی تعلیم بھی حضرات صوفیہ کے ہاں کتنی عام ہے اس کی نسبت قصد السبیل ہی میں بقدر ضرورت اجازت کے ساتھ تنبیہہ فرمائی ہے کہ "یہ سمجھ لینا چاہئے کہ زور سے ذکر کرنا اور ضرب لگانا خود کوئی ثواب کی بات نہیں ایسا اعتقاد کرنا گناہ ہے" ۔

ایک اور بڑی تنبیہہ : کی بات اس سلسلہ میں اس عام و عامیانہ خیال کا ازالہ تھا کہ علم باطن علم ظاہر یا شریعت سے افضل ہے ' جیسا کہ مثلاً ان اشعار سے شبہ ہوتا ہے ۔

آن پسر راکش خضر ببرید حلق
سرآن رادرنیا یدعام علق
گر خضر در بحر کشتی راشکست
صد درستی در شکست خضرہست
وہم موسیٰ علیہ السلام باہمہ نور و ہنر
شد ازاں محجوب تو بے پرمپر

حالانکہ یہاں مقصود فقط اتنا ہے' کہ بہت سی باتوں کی مصلحت و حکمت مخفی ہوتی ہے ہر شخص خصوصا عوام کی سمجھ میں نہیں آتی' لہٰذا بزرگوں کو ایسی باتوں پر اعتراض میں عجلت و مبادرت خواص کو بھی زیبا نہیں صبر و تحقیق سے کام لینا ضروری ہے غرض

"اس میں تائید ہے ترک اعتراض کی یعنی دیکھو ظاہر میں خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑا تھا مگر واقع میں اس کی حفاظت تھی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے - لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خیال باوجود تمامتر علم و معرفت و کمال نبوت کے اس کی وجہ سے معلوم کرنے سے محجوب رہا سو تم بے پر مت اڑو" -

"اس قصہ سے بعضوں کو شبہ ہو گیا کہ علم باطن علم شریعت سے افضل ہے' اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے پاس استفادہ کے لئے بھیجا گیا - نیز اس سے مستنبط کیا کہ اگر شیخ خلاف شرع کچھ حکم کرے تو مرید کو اس کا اتباع واجب ہے" -

"سو خوب سمجھ لو کہ یہ سب دعوے باطل ہیں - علم باطن کا حکم شرع سے افضل ہونا اس قصہ سے ثابت نہیں ہوتا دو وجہ سے اول یہ کہ علم باطن خود ایک شعبہ ہے علم شریعت ہی کا - اصلاح ظاہر کے حکم کو فقہ کہتے ہیں اور اصلاح باطن کے حکم کو تصوف - سو جزء کس طرح کل سے افضل ہو سکتا ہے - دوسری وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں خضر علیہ السلام کہ جو بعض امور بعیدہ و مخفیہ کی

اطلاع ہو گئی تھی ' یہ سرے سے علم باطن ہی نہیں ' جس میں گفتگو ہے - بلکہ چند واقعات جزئیہ و حالات کونیہ ہیں' جن کا انکشاف ان کو ہو گیا تھا" -

"جس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ جو چیزیں زمانا یا مکانا بعید تھیں' وہ ان کے علم میں قریب ہو گئیں - سو دور کی چیز کا نزدیک معلوم ہونا علم باطن نہیں - بخلاف علم موسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ علوم شرعیہ کلیہ و معارف الیہ ہیں کہ ظاہر و باطن سب ان کے شعبے ہیں - غرض علم خضری کسی طرح علم موسوی سے فائق نہیں - جیسے کسی بڑے کامل کو یہ خبر نہ ہو کہ پس دیوار کیا ہے' سو اس واقعہ کا جاننے والا کسی طرح اس کامل سے نہیں بڑھ سکتا" -

"اور جو مسئلہ (پیر کی علی الاطلاق وجوب اطاعت کا) استنباط کیا ہے وہ بھی غلط اور قیاس مع الفارق ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کا کامل ہونا خود اللہ تعالیٰ کی شہادت سے معلوم ہو گیا تھا' تو یقیناً یہ بھی معلوم تھا کہ ان سے کوئی امر خلاف شرع نہ ہو گا' گو اس کی وجہ نہ سمجھنے سے انکار فرمایا ورنہ سکوت و تسلیم کی گنجائش تھی - باقی جو شخص خلاف شرع ہو یا دوسرے کو ایسا امر بتلائے ' اس کا کامل ہونا ہی مشکوک ہو جائے گا" -

"پھر خضر علیہ السلام شریعت موسویہ کے اتباع کے مکلف نہ تھے' ان کی شریعت کچھ اور تھی - بخلاف اس وقت کے کہ سب ایک ہی شریعت کے مکلف ہیں - اب خلاف کرنے والے کا اتباع جائز نہیں - پس معلوم ہوا کہ یہ سب دعوے سرتا سر غلط ہیں - اور اس مقام پر مولانا روم کا مقصود علم خضری کو علم موسوی پر فضیلت دینا نہیں - بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب بعض اکابر کو بعض چھوٹے اسرار پر اطلاع نہیں ہوتی' تو تم چھوٹے ہو کر بڑوں کے اسرار کا انکار کیوں کرتے ہو" - (۱)

اشد فتنہ : " لیکن اس باطنیت کی راہ سے جو فتنہ سب سے اشد تصوف

---

(۱) التکشف جلد سوم مسائل مثنوی ص ۱۵ و ص ۱۶ - ۱۲

میں داخل ہو گیا وہ قرآن کے ظاہری و باطنی معنی و تفسیر کا ہے اس کی حقیقت پوری توجہ سے معلوم کر لینا چاہئے -

"اکثر صوفیاء کرام کے کلام میں بعض آیتوں کا خلاف ظاہر معانی پر محمول ہونا پایا جاتا ہے ایسے مواقع پر ناظرین کو دو غلطیاں ہو جاتی ہیں - بعض تو یوں اعتقاد کر لیتے ہیں کہ قرآن شریف کی تفسیر یہی ہے' اور علمائے ظاہر کی تفسیر غلط ہے - یہ اعتقاد بالکل باطل اور زنادقہ کا شعار ہے جس سے ساری شریعت ناقابل اعتبار اور منہدم ہو جاتی ہے - اور بعض لوگ ان حضرات پر طعن کرنے لگتے ہیں کہ انہوں نے قرآن میں تحریف کر دی اور تفسیر بالرائے کرتے ہیں' اس لئے اس کی تحقیق ضروری ہے -

"اصل قرآن کی تفسیر تو وہی ہے جو علمائے مفسرین نے لکھی ہے - لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو مضمون قرآن کا مقصود یا مدلول ہے' اس کے مشابہ کوئی ایسا مضمون ہوتا ہے' کہ مدلول قرآنی سے ذہن اس مشابہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے - جیسا زید و عمر میں مناسبت ہو' اور زید کے بیان میں عمر یاد آ جائے - اس انتقال ذہن کی وجہ سے جو مضمون قرآن کا اصل مدلول ہے اس پر مشابہ کا قیاس کر کے اس کے لئے بھی وہی حکم جو مدلول قرآنی کا ہے ثابت کرنے لگتے ہیں - لیکن اس سے مقصود صوفیہ کا اس مشابہ مضمون کو خود نص میں داخل کر دینا نہیں ہوتا - بلکہ محض قیاس و تمثیل کا قصد ہوتا ہے -

" مثلاً طہرا بیتی کا اصل مقصود و مدلول تطہیر کعبہ ہے جس سے ذہن منتقل ہو گیا کہ انسان میں بھی ایک چیز کعبہ کے مشابہ ہے' اور وہ قلب ہے - کیونکہ جس طرح کعبہ پر انوار الٰہی نازل ہوتے ہیں' قلب پر بھی فائض ہوتے ہیں (یا جس طرح کعبہ بیت اللہ ہے اسی طرح قلب المومن عرش اللہ ہے - راقم ہذا) اس سے قیاس کیا کہ جس طرح کعبہ کی تطہیر ضروری ہے' اسی طرح قلب جو مورد تجلیات الٰہی ہے' اس کا پاک رکھنا بھی ضروری ہے

"اس کو علم اعتبار کہتے ہیں' جس کی اجازت فاعتبروایا اولی الابصار میں موجود ہے' اور تمام فقہاء و محدثین احکام میں اس کا استعمال کرتے ہیں -پس اگر کوئی اس معنی میں مقیس (مشابہ) کو مجازا مدلول نص کہہ دے بایں معنی کہ قیاس مظہر ہے نہ مثبت تو اس میں کوئی بات قابل مواخذہ نہیں - ساری خرابی غلو کی ہے چنانچہ

"بعض نے جو یہ تکلف کیا ہے کہ ہر آیت کا ایک ظہر اور ایک بطن ہے یہ نہایت بعید ہے' کیونکہ ظہر و بطن دونوں کا اس آیت میں احتمال (گنجائش) ہونا ضروری ہے - اور ایسے نکات و اعتبارات وغیرہ (جو ہر آیت میں نکالے جائیں) یقیناً آیت میں متحمل نہیں ہوتے - جیسا کہ ماہرین قواعد شرعیہ و عربیہ پر مخفی نہیں' اس لئے ان کو بطن قرآن کہنا نہایت مستنکر ہے - بلکہ بطن سے (اصل ہیں) مراد وہ دقیق معانی اور خاص استنباطات ہیں' جن کو حضرات مجتہدین سمجھے ہیں اور جس کی تفصیل اہل اصول نے وجوہ و دلالات میں لکھی ہے اور ان بطون میں مراتب مختلف ہیں - بعض عوام نہیں سمجھتے علماء متوسطین سمجھ جاتے ہیں - بعض وہ ہیں' جن کو علمائے راسخین و مجتہدین سمجھتے ہیں' اور بعض ایسے ہیں' جن کو صرف انبیاء علیہ السلام سمجھتے ہیں - فوق کل ذی علم علیم -

"قرآن و حدیث کے ظاہری معنی کا انکار کفر ہے - البتہ ظاہر کو تسلیم کرنا اور باطن کی طرف عبور کرنا محققین کا مسلک ہے مثلاً حدیث میں ہے کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے نہیں جاتے - اہل ظاہر نے کتا پالنے کو تو برا سمجھا' مگر دل میں صفات کلبیہ کو جمع رکھا لیکن ایمان موجود ہے' مرپٹ کر ایسوں کو تو جنت مل جائے گی - منکرین ظاہر نے کتا پالنے کی اجازت دی اور کہا کو مولوی حدیث کا مطلب نہیں سمجھے بیت سے مراد قلب ہے اور ملا ئکہ سے مراد انوار غیبیہ اور کلب سے مراد صفات سبعیہ وغیرہ یہ شرع کا انکار کر کے کافر و مستحق جہنم ہوئے - محققین نے کہا کہ مطلب تو حدیث کا وہی ہے' جو اہل ظاہر سمجھے مگر غور کرنا

چاہئے کہ ملائکہ کو کتے سے کیوں نفرت ہے، صرف اس کے صفات ذمیمہ سبعیہ و نجاست و حرص و غضب وغیرہ کی وجہ سے، پھر جب ظاہری گھر میں کتا رکھنا جائز نہیں تو باطنی گھر میں کتے کے صفات کا رکھنا کیسے جائز ہو گا"

ایک اور بڑا غلو و غضب بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ اس مخفی و باطنی علم کی سند حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کی خود حدیث سے نکالی اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی تعلیم کو خصوصا اس میں داخل کر دیا۔

"یہ جہلا مدعیان تصوف نے مشہور کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاص اسرار حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بتلا دیئے تھے اور وہ سینہ بسینہ اب تک چلے آ رہے ہیں۔شیعوں کا یہی عقیدہ ہے .... سو اس کے متعلق خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ هل خصكم رسول الله صلى الله عليه وسلم بشيئى دون الناس کیا آپ کو حضورؐ نے کچھ خاص اسرار بتلائے ہیں جو اوروں کو نہیں معلوم آپ نے فرمایا لا الا فهما اوتيته فى القران یعنی مجھے کوئی خاص اسرار نہیں معلوم بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو قرآن کا فہم عطا فرمایا ہے"۔

وحدۃ الوجود

اس مسئلہ میں بھی بعض اکابر کے انکار کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے بعض عنوانات و تعبیرات بظاہر موحش اور خلاف شریعت معلوم ہوتے تھے اور پھر بہت سے اصاغر یا چھوٹوں نے قدرۃً ان اکابر کی ریس میں منہ سے بڑی بڑی باتیں نکالیں اور نکالتے رہتے ہیں (یغفر اللہ لنا ولھم) حالانکہ اس مسئلہ کے سب سے بڑے قائل اور اکبر الاکابر حضرت شیخ اکبر رحمتہ اللہ علیہ کی تعبیر و عنوان کی تغلیظ فرمانے کے باوجود حضرت مجدد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ خود ان کو اپنے مکتوبات میں "تصریحاً مقبولان الٰہی میں شمار فرماتے ہیں" - ایسی حالت دوسروں کا منہ کیا ہے!

اور یہی حاصل اس باب میں حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمتہ کی تجدید و اصلاح کا ہے کہ ایک طرف تو اس کی مشکل و موحش تعبیرات کو ایسا بدل دیا کہ نفس مسئلہ عامی سے عامی کے لئے قابل فہم اور خشک سے خشک متوہب کے لئے ناقابل انکار ہو گیا - دوسری طرف ایسے قائلین کے ساتھ جو اپنے دیگر حالات کی بناء پر اہل اللہ و مقبولین میں شمار ہوتے ہیں، حسن ظن و تاویل کی تاکید فرمائی اور ان کی تکفیر و اضلال میں معادات اولیاء کا خطرہ بتلایا -

مسئلہ کی نفس علمی تحقیق: ظہور العدم بنور القدم کے نام سے ایک 26 ' 27 صفحات کا مستقل رسالہ قلم بند فرمایا ہے - اس میں مسئلہ کی نفس حقیقت اور وجود و شہود دونوں تعبیرات پر جو بحث فرمائی گئی ہے، وہ اہل علم کے لئے لائق دید ہے - البتہ عوام کی نظر سے ایسے مباحث کا دور رکھنا ہی حضرت کا مسلک تھا - غالباً اسی بناء پر رسالہ کی عبادت کو تمامتر علمی و اصطلاحی رکھا گیا ہے - نیز خود راقم احقر نے جب ابتداء میں اس مسئلہ سے متعلق کچھ اپنے رجحانات خدمت میں پیش کئے، تو صبح کی مجلس کا وقت تھا - رسالہ خانقاہ کے اپنے خاص حجرہ سے (کیونکہ عام اشاعت مطلوب نہ تھی) خود ہی نکال کر اس شرط کے ساتھ عطا

فرمایا کہ پڑھ کر واپس کر دوں چنانچہ دو تین گھنٹہ میں ختم کر کے ظہر کے بعد مجلس میں حاضر خدمت کر دیا۔

یہاں اس سے فقط ایسی عام باتوں کا نقل کر دینا مقصود ہے، جس سے حضرت کی اصلاح و تجدید کے مذکورہ بالا خاص مسلک کی توضیح ہو جائے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مسئلہ چونکہ بہرحال قطعیات میں نہیں، بلکہ "کیفیت ثبوت الوجود للحوادث کے اعتبار سے سب کے نزدیک ظنی ہے"۔ اس لئے "بطلان مسئلہ کا حکم جزمی یا ضلال اصحاب مسئلہ کا حکم قطعی یہ تو یقیناً غلو اور معاداۃ اولیاء ہو گا جس میں ایذان بحرب اللہ کی وعید وارد ہے" اور "فریقین کے محتاطین اس مسئلہ پر عامل ہیں کہ ابھموا ما ابھم اللہ (یعنی جس چیز میں اللہ تعالٰی نے ابہام رکھا ہے، اس میں تم بھی ابہام ہی رہنے دو)۔ مگر جن کو کشف سے ابہام نہ رہا وہ بزعم خود اس اصل کا تارک نہیں

وکل یعمل علی شاکلتہ

ان سے حسن ظن قائم رکھنے کی صورت یہ ہے کہ

"کبھی کسی علمی مسئلہ کے اضطراری کشف یا اختیاری مراقبہ و استحضار سے کسی کیفیت یا حال کا ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ اس مسئلہ کا اظہار بلا اختیار ایسے عنوان سے ہو جاتا ہے' جو مسئلہ کے تمام جوانب کے احاطہ کے لئے کافی نہیں ہوتا - اور اس ناتمام عبارت کے سبب سامعین کو غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے - پس اس مسئلہ میں جو موہم عبارات بعض کے اقوال میں پائی جاتی ہیں سو حسن ظن کا مقتضا یہ ہے کہ اگر فن میں مہارت ہو تو اس کو حقیقت کی طرف راجع کر لے ورنہ سکوت اختیار کرے -

"اور مسائل تصوف ہی پر کیا موقوف واقعات یومیہ میں بھی کسی عارض سے کبھی ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ ایک طرف مشغول ہو جانے سے دوسری جانب سے ذہول ہو جاتا ہے (جیسے) اکثر فرح یا غضب کے غلبہ میں ایسا ہو جاتا ہے کہ کبھی ذہن قابو میں نہیں رہتا' کبھی زبان قابو میں نہیں رہتی - اسی طرح اگر باطنی حال کے مغلوب کو تکلم کے وقت خصوص جب کہ وہ بھی اضطرار ہو' عبارت کے تمام جوانب کا احاطہ نہ رہے تو کیا مستبعد ہے - اس کو معذور سمجھنا چاہئے -

"رہا یہ کہ بعد افاقہ اس کی اصلاح کر دینا چاہیے تھا تاکہ گمراہی نہ پھیلتی - جواب یہ ہے کہ اس پر مطلع صرف خواص ہوتے تھے اور وہ حقیقت کو سمجھتے تھے - کتابیں بھی خواص کے لئے لکھی جاتی تھیں' تاکہ اپنے واردات کو ان پر منطبق کر کے صحت و فساد کا اندازہ کر سکیں - ان بزرگوں کو ان مطالع کی جو ہر خفی و ظاہر مضمون کے لئے مطالع ہو گئے کیا خبر تھی - اس پر بھی انہوں نے غیر اہل کے لئے یہ فتوے دیا ہے کہ یحرمُ النظر فی کتبنا (کہ ہماری کتابوں کا دیکھنا حرام ہے) اس سے زیادہ کیا کرتے" -

وحدۃ وجود کے قول سے چارہ نہیں : غرض حسن ظن کی گنجائش کے لئے اقل مرتبہ یہ ہے کہ ایسے حضرات کو مغلوب جان کر معذور خیال کیا جائے -

ورنہ جو ذہنی و علمی اہلیت و مہارت کے ساتھ اس مسئلہ میں غور کرے گا' اس کو کسی نہ کسی طرح وجود کی وحدت کا قائل ہی ہونا پڑے گا ۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی تردید فرمائی اور اس کے مقابل میں وحدت شہود کی تعبیر اختیار فرمائی ۔ پھر بھی اس وحدت شہود کی تحقیق و تفصیل کے بعد مجدد وقت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ

"یہ ہے حاصل مجدد (الف ثانی) صاحب کے مشرب کا جس کا لقب وحدۃ الشہود ہے ۔ اور حقیقت اس کی یہی وحدۃ الوجود ہی ہے ۔ کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا کہ ان کے نزدیک بھی حقیقی وجود واحد ہی ہے' جیسا کہ شیخ اکبر کے نزدیک تھا ۔ صرف فرق یہ ہے کہ شیخ اکبر وجود ظلی کی نفی کرتے ہیں اور مجدد صاحب اثبات کرتے ہیں ۔ پس اصطلاح میں وحدۃ الوجود کے معنی یہ ہوئے کہ وحدۃ الوجود کا اثبات وجود ظلی کی نفی کے ساتھ ۔اور ظاہر ہے کہ مجدد صاحب اس کے قائل نہیں ' اس لئے ان کے مشرب کا لقب وحدۃ الوجود نہیں ہوا ۔ باقی وحدۃ الشہود سے ملقب ہونے کی وجہ سو وہ یہ ہے کہ مجدد صاحب نے شیخ اکبر کا عذر یہ فرمایا ہے کہ ان کو غلبہ نور وجود سے وجود ظلی مشہود نہیں ہوا' صرف وجود واحد ہی مشہود ہوا" ۔

لہٰذا بایں معنی کہ مشہور وحدۃ الوجود کی حقیقت حضرت مجدد صاحب نے وحدۃ الشہود ظاہر فرمائی' اس لئے ان کے مسلک کا لقب بھی وحدۃ الشہود ہوا ۔

"پس گویا شیخ اکبر مسئلہ کی حقیقت وحدۃ الوجود سمجھے اور مجدد صاحب اسی مسئلہ کی حقیقت وحدۃ الشہود سمجھے ۔ نیز شیخ وجود عالم کی نفی کرتے ہیں' اس لئے صرف وجود حق کا مشاہدہ کرتے ہیں ۔ اور مجدد صاحب عالم کے لئے وجود ظلی کا اثبات کرتے ہیں' مگر باوجود اس کے اس کا مشاہدہ نہیں کرتے ۔ مشاہدہ صرف وجود حق ہی کا کرتے ہیں' جیسے دن میں ستاروں کا مشاہدہ نہیں ہوتا باوجود یہ کہ ستارے موجود ہیں ۔ اور موجود سمجھے بھی جاتے ہیں ۔

"یہ وجہ ہے اصطلاحی تسمیہ میں فرق کی، ورنہ لغوی معنی میں وحدۃ الوجود کے قائل ہونے میں دونوں حضرات شریک ہیں، جیسا اوپر ظاہر ہو چکا کہ وہ بھی وجود کو جزئی حقیقی کہتے ہیں - پس چار مذاہب (یعنی علمائے ظاہر، بعض حکما نے اسلام وجودیہ، اور شہودیہ) میں سے تین مذاہب اس دعوے میں متفق ہیں - صرف علمائے ظاہر وجود کو کلی مشکک اور اس کے مصداق کو متعدد مانتے ہیں" -

وجود و شہود کا اصطلاحی فرق: آخر میں وجود و شہود دونوں کے اصطلاحی فرق کو پھر اصطلاحات ہی میں مختصرا بیان فرما کر ایک وصیت فرمائی ہے - فرق تو یہ ہے کہ

"وجود یہ کے نزدیک حقیقت عالم کی اسما و صفات ہیں جو ظاہر وجود پر متجلی ہوئے اور اس سے عالم کے وجود کا خیال پیدا ہوا، جس کی تعبیر کبھی یوں بھی کرتے ہیں کہ وہ معدوم محض ہے، مگر ساتھ ہی احکام کا مورد ہے اور کبھی یوں کرتے ہیں کہ وہ عین حق ہے - اور دونوں کا حاصل ایک ہے - اور شہودیہ کے نزدیک حقیقت عالم کی عدمات میں جن پر اسماء و صفات نے تجلی کی، جس سے وجود ظلی پیدا ہوا اس لئے وہ عالم کو نہ معدوم سمجھتے ہیں نہ عین حق -

"باقی عالم سے حقیقی وجود کی نفی میں دونوں شریک ہیں - اور اس میں اہل ظاہر کی ملامت کے دونوں ہدف ہیں - اور یہ ملامت شیخ پر اس لئے زیادہ ہے کہ ان کے کلام کو غلط سمجھے ہیں - حالانکہ ظاہر ہے کہ اگر شیخ کا قول ضلال محض ہوتا تو حضرت مجدد صاحب بجائے اس کی تقریر کے اس کا ابطال اور شیخ کی تضلیل بلکہ تکفیر فرماتے - حالانکہ باوجود تغلیط کے ان کو تصریحًا مقبولان الہی میں شمار فرماتے ہیں -

ضروری وصیت: یہ ہے کہ

"اول تو تمام مسائل کلامیہ میں عمومًا، اور خصوصًا جن کا تعلق ذات و صفات سے ہے، بدون قطعی عقلی یا نقلی دلیل کے محض ظنیات کی بناء پر کہ کشف سب

ظنیات میں انزل ہے، کوئی حکم کرنا خصوص حکم جازم، بلکہ بلا ضرورت کچھ گفتگو کرنا سخت محل خطر و خلاف مسلک سلف صالحین ہے اور جن بزرگوں نے کچھ کلام کیا ہے، ان میں اکثر کی غرض محض اہل ہوا کا دفع تھا جیسا کہ مجدد صاحب نے بغرض اصلاح غلاۃ وجود یہ اس میں کلام فرمایا ۔ گو بعض نے اس کو مقصود بنا لیا جو خلاف احتیاط ہے ۔

"اسلم ایسے مسائل میں یہی ہے کہ نصوص سے تجاوز نہ کریں، اور سلف کے مسلک پر اور ان کے ارشاد کو ابھموا ما ابھم اللہ تعالی پر عمل رکھیں ۔ اور اگر کوئی حقیقت زائدہ علی النص کسی دلیل ظنی سے کہ کشف بھی اس میں داخل ہے، منکشف ہو اور کسی دلیل عقلی قطعی اور نیز کسی نص قطعی یا ظنی کے مخالف نہ ہو تو اس میں بھی خوض نہ کریں دونوں جانب کو متحمل سمجھتے رہیں ۔

"چونکہ یہ مسئلہ متکلم فیہا بھی ان ہی مسائل سے ہے، جن کا تعلق ذات و صفات سے ہے ۔ کیونکہ حاصل اس کا ارتباط الحادث بالقدیم ہے، اس لئے اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ رکھیں اور اجمالا یہ اعتقاد توجزم کے ساتھ رکھیں، کہ عالم پہلے ناپید تھا اللہ تعالی نے اس کو اپنے علم و قدرت و ارادہ سے پیدا فرمایا ۔ باقی کس طرح سے پیدا فرمایا، اس میں نہ خوض کریں نہ کلام کریں ۔ جیسے مسئلہ قدرمین احادیث میں بھی منصوص ہے کہ اجمال کے درجہ میں اس کے اعتقاد کو شرط ایمان فرمایا اور تفصیل کے درجہ میں خوض یا کلام کو منع فرمایا ۔

تجدیدی مسلک : بس یہ ہے حضرت مجدد تھانوی کا اس مسئلہ میں اصل تجدیدی مسلک کہ نہ اس کا جزم و قطعیت کے ساتھ انکار ہو نہ اثبات دونوں کو احتمال کے درجہ میں رکھا جائے ۔ لیکن انتہا پسندوں نے جہاں ایک طرف اس کا قطعی انکار اور اس کے قائلین کی تکفیر و تضلیل تک میں تامل نہیں کیا وہاں

---

(۱) ساری عبارات رسالہ مذکورہ کے مختلف مقامات سے ماخوذ ہیں ۱۲

دوسری طرف اپنوں اور پرایوں دونوں میں بہتوں نے بڑی غلطی یہ کھائی کہ اس کو تصوف کا جزء بلکہ جزء لاینفک سمجھ لیا' اور پھر بناء فاسد علی الفاسد اس کی جو توجیہات و تشریحات صوفیہ نے کی ہیں ان کو قدرۃً ویدانت وغیرہ کی فلسفیانہ و عقلی تعبیرات سے مماثل پا کر اسلامی تصوف ہی کو اجنبی ماخذوں سے ماخوذ و مستعار سمجھ لیا گیا۔ لہٰذا اس بارے میں حضرت جامع المجددین علیہ الرحمتہ کی ایک اعتبار سے زیادہ اہم تجدید و تحقیق یہ ہے' کہ مسئلہ خواہ وحدۃ وجود کی صورت میں ہو یا وحدۃ شہود کی براہ راست اسلامی تصوف کا کوئی خاص و ضروری جزء بالکل نہیں "بلکہ کلامی و علمی" یا عقلی و فلسفیانہ مسئلہ ہے یا بعضوں کے لئے شئی جو بجائے خود کوئی قطعی حجت نہیں۔

مسئلہ وجود و شہود اسلامی تصوف کا کوئی جزء لاینفک نہیں :

"اور وجہ ان کے (یعنی مسئلہ وجود و مشہود) کے علمی و کلامی ہونے کی ظاہر ہے۔ کیونکہ حاصل ان کا ارتباط الحادث بالقدیم (حادث کے قدیم کے ساتھ ربط و تعلق) کی تحقیق ہے' جس کا مسئلہ علمیہ و کلامیہ ہونا معلوم ہے۔ البتہ یہ ان مسائل کلامیہ میں نہیں جو عقلی محض ہیں۔ کیونکہ اصلی مسائل کلامیہ دو قسم کے ہیں' ایک عقلی محض۔ یعنی عقل ان کے لزوم کے حکم کے لئے کافی ہے۔ جیسے مسئلہ وجود صانع و حدوث عالم وغیرہ' دوسرے عقلی غیر محض یعنی عقل محض ان کے امکان کا حکم کرتی ہے' مگر ثبوت میں نقل کی بھی احتیاج ہوتی ہے' جیسے مسئلہ رویت ....سو وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود کے مسئلہ بوجہ مدخلیت کشف کے قسم اول میں تو نہیں' لیکن قسم ثانی میں سے ہیں۔

"باقی یہ کہ کتب کلامیہ میں مذکور کیوں نہیں۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ متکلمین نے بالالتزام صرف ان مسائل کو لیا ہے جو اول تو قطعی ہوں دوسرے کسی فرقہ سے ان میں کلام ظاہر ہوا ہو۔ گو بعض مسائل غیر قطعیہ تبعاً ذکر میں آ گئے جیسے جزء لا یتجزیٰ کا مسئلہ جو حدوث عالم کے مسئلہ کے لئے تبعاً مذکور ہو

گیا، لیکن التزام قطعیات ہی کا ہے۔ اور یہ (وجود و شہود کے) مسئلے نہ قطعی ہیں، نہ تدوین کلام کے زمانہ میں ان کا اس طرح ظہور ہوا تھا۔

"رہا یہ کہ قسم ثانی میں سے کس طرح ہیں، مسئلہ وجود کو متکلمین نے تو قسم اول میں ذکر کیا ہے۔ سو بات یہ ہے کہ حوادث کے اثبات وجود کی کیفیت متکلمین کے نزدیک تو محض عقلی ہے اور صوفیہ کے نزدیک امکاناً عقلی اور وقوعاً کشفی ہے۔ اس لئے مسئلہ وجود متکلمین کے نزدیک تو قسم اول اور صوفیہ کے نزدیک قسم ثانی سے ہے۔ متکلمین کے مسائل قسم ثانی سے اس کو اتنا فرق ہے کہ انہوں نے نقل میں محض نصوص کو لیا ہے، اور صوفیہ نے کشف کو بھی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مسئلہ عقلی نہ رہے، جس طرح مسئلہ رویت باوجود مدخلیت نص کے عقلی ہے، غایت ما فی الباب بوجہ استناد الی ا لکشف ظنی ہو گا۔ اور ظنیت میں بھی ظنیات اصولیہ سے متنزل (یعنی کم درجہ کا) کیونکہ کشف کو کسی شے میں حجت کا درجہ نہیں حاصل" ۔ (۱)

ظنی مسئلہ کو منصوص قطعی قرار دینا بہت خطرناک ہے: اس لئے ایسے ظنی و احتمالی مسئلہ کی کسی خاص تعبیر کو خواہ مخواہ قرآن و حدیث کی نصوص سے کھینچ تان کر ثابت کرنے کی کوشش بڑی جسارت اور خطرہ کی بات ہے۔ جس میں تحریف تک کا غلو لوگوں نے کیا۔ اس کے متعلق بھی رسالہ مذکورہ بالا کے ایک الحاق میں متنبہ فرمایا ہے کہ

"مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود مسائل کشفیہ ہیں، کسی نص کے مدلول نہیں۔ ایسے مسائل کے لئے یہی غنیمت ہے کہ وہ کسی نص سے متصادم نہ ہوں۔ یعنی کوئی نص ان کی نافی نہ ہو۔ باقی اس کی کوشش کرنا کہ نص کو ان کا مثبت بنایا جائے، اس میں تفصیل ہے کہ اگر نص اس کی محتمل ہو تو درجہ احتمال

---

(۱) بوادر النوادر از ص ۷۶۰ تا ۷۶۴۔ ۱۲

تک اس کا رکھنا غلو تو نہیں مگر تکلف ہے اور درجہ احتمال سے بڑھا دینا غلو ہے'
اور اگر وہ محتمل بھی نہ ہو تو اس کا دعویٰ کرنا احتمالاً یا جزماً صریح تحریف ہے -
"البتہ اگر وہ دعویٰ بطور تفسیر یا تاویل کے نہ ہو محض بطور علم اعتبار کے ہو
تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ وہ حکم اگر کسی اور نص سے ثابت ہو تب تو وہ
اعتبار داخل حدود ہے' ورنہ وہ بھی تکلف ہے" -

آگے اس غلو و تکلف کی بعض مثالیں نمونہ کے طور پر دے کر چند تنبیہات بھی فرمائی ہیں - غلو کی حد یہ ہے کہ "بعض مغلوبین نے لا الہ الا اللہ کی تفسیر میں ایک رسالہ "کلمہ الحق" لکھ دیا ' جس میں یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ "نہیں ہے کوئی الہ مگر اللہ" اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے غیر اللہ الہ بنائے گئے ہیں' وہ سب معاذ اللہ اللہ ہی ہیں! اور حضرت علیہ الرحمتہ کی احتیاط کی بھی حد یہ ہے کہ ایسے تحریف کی حد تک غلو کے ابتلا کو بھی "مغلوبیت" فرما کر تا بہ امکان سوء ظن سے بچنے اور بچانے کا خیال رکھا -

راقم احقر پر کچھ تو ہمیشہ سے طبعًا عقلیت و تفلسف کا غلبہ رہا - پھر کڑوا کریلا نیم چڑھا کہ ساری عمر فلسفہ کے مطالعہ اور تعلیم و تعلم کا مشغلہ رہا - اور فلسفہ دراصل نام ہے وحدۃ الوجود ہی کی تاریخ کا' یعنی عالم کثرت کے مبدء و حدت کو معلوم کرنے کی فکری و عقلی سعی و طلب کا - لیکن متعارف و اصطلاحی وحدۃ الوجود کا نام زیادہ تر تصوف کے سلسلہ میں سننے اور پڑھنے میں آتا رہا - خصوصًا حیدر آباد کے دوران قیام میں' جہاں ایک زمانہ تک غالیانہ وجودیت و عینیت کا بہت زور رہا - کہنا یہ ہے کہ حضرت کا یہ رسالہ از سر نو پڑھنے تک غلط فہمی تو یہی رہی کہ یہ مسئلہ خاص تصوف کا جزء ہے' حتیٰ کہ جامعہ عثمانیہ میں اس پر تصوف ہی کے ایک مسئلہ کی حیثیت سے ہمیشہ لکچر دیتا رہا - اور اس کی تردید بھی کرتا رہا کہ نفس مسئلہ کہیں باہر سے ماخوذ و مدخول نہیں بلکہ قرآن و حدیث ہی میں اس کی اصل موجود ہے - تاہم اس کی تفسیر و تعبیر صوفیہ کے کلام میں جو پڑھتا یا ایک بڑے صاحب

حال وقال حیدر آبادی بزرگ (1) کی زبان سے سنتا رہا وہ قال کی حد تک بس ایک عقلی مسئلہ یا فلسفہ معلوم ہوتا رہا ۔ اس لئے حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمتہ کی اس مجددانہ تحقیق و توثیق سے بڑا اطمینان ہوا کہ یہ مسئلہ درحقیقت ایک علمی و کلامی مسئلہ ہے' اور اسلامی تصوف کا یہ کوئی خاص جزء نہیں اور نہ اس اعتبار سے اس بحث کی کوئی اہمیت و حاجت رہ جاتی ہے' کہ اسلامی تصوف میں یہ باہر سے داخل ہوا یا نہیں ۔ بلکہ اس کی غالیانہ تعبیرات یقیناً بیرونی اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں ۔ (واللہ اعلم بالصواب) لہٰذا صحیح مسلک حضرت مجدد وقت ہی کا ہے کہ یہ ایک ظنی مسئلہ ہے ' جس کے انکار و اثبات دونوں میں جزم و قطعیت سے باز رہنا اور مغلوب الحال قائلین کو معذور سمجھنا چاہئے ۔

وجودیت اور عقلیات جدیدہ : البتہ جدید عقلیات و فلسفیات خصوصًا اس کے مادہ و مکاں (ا) کے مباحث نے حضرت شیخ اکبر رحمتہ اللہ علیہ کی وجودیت بلا عینیت کی تعبیر کو زیادہ اقرب الی العقل کر دیا ہے اور "ایک وجود و ذات" کی تشریح کے بعد شریعت یا کتاب و سنت سے بھی کم از کم اس کو تصادم و تعارض نہیں رہتا' اور نہ اس کو صحیح طور سے سمجھ لینے کے بعد حلول و اتحاد یا عینیت میں ابتلا کا خطرہ رہتا ہے ۔ خاص کر جو لوگ عقل و فلسفہ سے "مغلوب الحال" ہیں اور عدم اثبات و عدم انکار کے پل صراط پر قدم نہیں جما سکتے' اور وجود و تخلیق کا راز بزعم خود کچھ نہ کچھ سمجھ لینا چاہتے ہیں' ان کے لئے یہ وجودیت بلا عینیت والی تعبیر کا قبول کر لینا ہی غنیمت و اسلم ہے ۔ اور کچھ اسی طرح کے حال و میلان کے تحت احقر نے ایک دفعہ خود حضرت علیہ الرحمتہ کی خدمت میں تحریراً اس کو پیش بھی کیا تھا ۔ جس میں تخلیق کی تین احتمالی صورتوں کے بیان کے بعد عرض کیا

(ا) حضرت مولانا محمد حسین رحمتہ اللہ علیہ ۱۲

(ا) جن پر انشاء اللہ جدید علم کلام کے مباحث میں گفتگو کا موقع ہوگا ۱۲

تھا کہ

"ایک چوتھی صورت خلق اشیاء کی وہ ہو سکتی ہے جس طرح ہم خود النفس میں اپنے خیالات و تصورات کو پیدا کرتے ہیں - خصوصًا خواب کی صورت میں تو ہمارا ذہن ہو بہو بیداری کی دنیا کو پیدا کر لیتا ہے (یا یوں کہئے) کہ خود ہی اپنے معلومات و خیالات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے - زیادہ قدرت والی ذات نہ صرف بیداری میں اس طرح سارا عالم پیدا کر سکتی ہے بلکہ ہمارے خواب سے بڑھ کر یہ قادر مطلق ذات اپنی تصوری مخلوقات انسان و حیوان وغیرہ کو ایسا بنا سکتی ہے کہ وہ خود کو اپنی اپنی جگہ مستقلاً ذی حس و ادراک مخلوق پائیں -

"خلق اشیاء کی یہ صورت نہ صرف عقلاً زیادہ قابل قبول معلوم ہوتی ہے' (1) بلکہ نقلاً بھی بہت سے عقائد و نصوص کی تصحیح سہل و اقرب ہو جاتی ہے اس لئے کہ خالق ومخلوق کے اس تعلق کا خلاصہ یہ ہے کہ عالم خود اپنے مخلوقات یا صور علمیہ کی صورتوں سے تجلی یا ظہور فرماتا ہے - جس میں نہ خالق و مخلوق کا عین ہونا لازم آتا ہے' اس لئے کہ معلوم عین عالم نہیں ہو سکتا' نہ اس طرح غیر ماننا پڑتا ہے کہ خالق کہیں ہو اور مخلوق کہیں - نہ اس میں لاشی سے شی یا عدم سے وجود کا لزوم ہوتا ہے - جدید فلسفہ اور سائنس کے رجحانات کے بھی یہ صورت اقرب ہے" -

یہ اپنے الفاظ میں مختصراً حضرت شیخ اکبر رحمتہ اللہ علیہ کے مسئلہ کی وہی تقریر تھی جو حضرت مولانا محمد حسین حیدر آبادی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے' اور جس کی بدولت نہ صرف حیدر آباد کی عینیت والی غالیانہ وجودیت کا فتنہ مغلوب ہو گیا' بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ خصوصًا فلسفہ پڑھنے پڑھانے والوں یا عقلی و فلسفی مزاج

---

(۱) خصوصا جدید فلسفہ تصوریت کے تحت ۱۲

والوں کے لئے حفاظت ایمان بلکہ حلاوت ایمان کا باعث بن گئی - گو راقم سطور کے نزدیک اس میں زیادہ دخل حضرت ممدوح کے خاص حال و اخلاص کو تھا، تاہم موجودہ عقلیت و فلسفیت کی راہ سے انکار وارتیابیت میں مبتلا ذہنوں کے لئے تجربہ نے اس کو ایمان کا بڑا سہارا پایا -

قیاس غائب علی الشاہد کا مغالطہ : مگر حضرت مجدد وقت علیہ الرحمتہ کے مذاق نے اس کو بہرحال پسند نہیں فرمایا - اور اپنی تحقیق کے تحت یہ بالکل ہی بجا تنقید فرمائی کہ اس تقریر و تعبیر میں جو سہولت نظر آتی ہے، وہ "قیاس الغائب علی الشاہد سے ناشی ہے - البتہ ان مسائل میں آدمی اگر ایمان سازج ایمان الجائز سے آگے قدم ڈالنے کا خطرہ مول لیتا ہے، تو غائب کے شاہد پر قیاس سے چارہ نہیں - بلکہ انسان کی ساری فکر و منطق نام ہی ہے کسی نہ کسی درجہ میں نامعلوم کو معلوم پر قیاس کرنے کا، جو عالم شہادت میں تو کچھ دور تک ٹھیک چلتی اور علم و یقین بخشتی ہے - لیکن عالم غیب کے معاملہ میں یہ زائد سے زائد بس منطق تمثیل کا درجہ رکھتی ہے - اس لئے اس میں شک نہیں کہ کامل سلامتی اس بحرناپیدا کنار کے کنارے اور ان تخمینات سے دور رہنے ہی میں ہے، اور حضرت مجدد علیہ الرحمہ کا اصل تجدیدی مسلک یہی تھا - جیسا کہ آگے اسی عریضہ کے مزید معروضات کے جواب میں ارشاد فرمایا وہ معروضات یہ تھے کہ

> "کن فیکونی تخلیق بھی اس سے سمجھ میں آ جاتی ہے، کہ نفس نے کسی شے کا ارادہ کیا کہ وہ خلق ہو گئی - اقربیت، احاطت معیت وغیرہ میں بھی تاویل و توجیہہ نہیں کرنا نہیں پڑتی عالم سے بڑھ کر معلوم کے اقرب اس کو محیط اور اس کے ساتھ کون ہو سکتا ہے - سب سے بڑھ کر اولیت و آخریت ظاہریت و باطنیت کا تعلق سمجھنا آسان ہو جاتا ہے - کیونکہ معلوم من حیث المعلوم کا اول و آخر

---

(۱) یہ عریضہ مع تحقیق و جواب النور بابت جمادی الاول ۱۳۵۹ھ میں منقول ہے ۱۲

ظاہر و باطن سب کچھ خود عالم ہی ہوتا ہے - پھر وھو بکل شیئی علیم کو اگر ھو الاول و الظاہر والباطن کے دعوے کی دلیل کا اشارہ قرار دیا جائے' تو خلق اشیاء کی یہ صورت منصوص (باشارۃ النص) ہو جاتی ہے' کہ وہ ہر شے کا اول و آخر ظاہر و باطن اس لئے ہے کہ ہر شے کا علیم ہے' - یعنی شے کی ماہیت اس کا معلوم ہونا ہے "

سلامتی و احتیاط : کا جواب لاجواب ملاحظہ ہو کہ

"یہ سب تخمینات و خرافات (گزاف) ہیں جن کی حقیقت ابھی عرض کی گئی ہے - اس لئے لوٹ پھر کر اسی قلعہ میں پناہ لینا پڑتی ہے' جس کا حاصل عدم خوض اور تفویض اور اقرار بالعجز عن الادراک ہے' جو ان آیات میں منصوص ہے - قولہ تعالی فلاتضربوا للہ الامثال - قولہ تعالی اشھدوا اخلقھم - قولہ علیہ السلام تفکرو فی کل شیئی ولا تفکروا فی ذات اللہ تعالی - واجمع العارفون علی ان کل ماخطر ببالک فھو ھالک واللّٰہ اجل واعلیٰ من ذالک (۱) وقال عارف رومی -

نکتہا چون تیغ پولا دست و تیز
چون نداری توسپر واپس گریز
پیش این الماس بے اسپر میا
کز بریدن تیغ رانبو و حیا

واقعی یہ مسئلہ ہے تیغ بے نیام -اگر ذرا کج فہمی ہو گئی تو ایمان ہی کا کام تمام! باقی حضرت مجدد علیہ الرحمتہ کے اس مسلک تجدید اور مذاق احتیاط کی پوری قدر اس کو ہو سکتی ہے' جس کو فلسفہ اور فلسفہ کی ارتیابیت مذمومہ سے گزر کر

---

(۱) جس کا ترجمہ ہے -

اے برتر از خیال و قیاس وگمان و وہم
و ز ہرچہ خواندہ ام و شنیدم وگفتہ آم

حیرت محمودہ کی لذت و معرفت نصیب ہو کہ

نے چنان یحران کہ پشتش سوئے دوست
بل چنیں حیران کہ غرق و مست دوست

تاہم یہ مسئلہ عقلاً و نقلاً تار عنکبوت ہرگز نہیں کہ جزم و قطعیت کے ساتھ اس کا انکار کر دینا کوئی دین و دانش کی بات ہو - بس اس کی کامل احتیاط ضروری ہے' کہ عینیت کا خطرہ پاس نہ آنے پائے اور خالق و مخلوق کی غیریت برقرار ہے - اس لئے اس کی تحقیق بھی توجہ سے سن لینے کی ہے -

عینیت کے معنی: ایک یہ ہیں کہ "دو چیزوں کا ہر طرح سے ایک ہونا کہ ان میں کسی قسم کا بھی فرق نہ ہو - اور غیریت یہ کہ دونوں میں کسی قسم کا تغایر و امتیاز یا فرق ہو اس معنی میں عینیت و غیریت میں باہم تناقض ہے جس سے دونوں کا کسی محل میں جمع ہونا بھی محال اور مرتفع ہونا بھی محال - متبادر معنی عینیت و غیریت کے یہی ہیں اور یہی معنی لغوی ہیں اور اس میں اکثر عرفاً استعمال ہوتا ہے - اس اعتبار سے کوئی شے باری تعالیٰ کی عین ذات نہیں -

"دوسری صورت یہ ہے کہ عینیت کے تو وہی (مذکورہ بالا) معنی لئے جائیں اور غیریت کے معنی یہ ہوں کہ دو چیزوں میں کسی ایک کا بدون دوسری کے موجود ہو سکنا- اس تفسیر میں عینیت و غیریت میں باہم تناقض تو نہیں' مگر تضاد ہے' یعنی دونوں ایک محل پر صادق نہیں آ سکتے' مگر مرتفع ہو سکتے ہیں یہ اصلاح متکلمین کی ہے اور اس تفسیر سے بھی ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات میں عینیت نہیں بلکہ غیریت ہے کہ مخلوقات تو بدون ذات باری تعالیٰ کے موجود نہیں ہو سکتی' لیکن باری تعالیٰ بدون مخلوق موجود ہو سکتے ہیں' جیسا کہ واقع میں قبل ایجاد خلق کے موجود تھے -

"تیسرے معنی عینیت کے ہیں ایک شے کا اپنے وجود میں دوسری شے کی طرف محتاج ہونا' گو دوسری پہلی کی طرف محتاج نہ ہو - اور غیریت کے وہی پہلے

معنیٰ کہ دو چیزوں میں کسی قسم کا تغایر و امتیاز یا فرق ہونا یہ اصطلاح حضرات صوفیہ کی ہے - جس کے اعتبار سے ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات میں عینیت بھی ہے - کیونکہ مخلوقات ذات باری تعالیٰ کی اپنے وجود میں محتاج ہے گو ذات باری تعالیٰ اس احتیاج سے مبرا ہے' اور غیریت بھی ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ اور مخلوقات میں لاکھوں طرح کے فرق ہیں " -

اور یہی حق و خلق کا سیدھا سادھا تعلق ہے' جو عامی آدمی بھی سمجھتا اور سمجھ سکتا ہے' کہ مخلوقات اپنے وجود ذات و صفات و افعال و آثار تمام چیزوں میں بالکلیہ خالق کے وجود کی محتاج اور اس کے تابع ہے اور خالق اپنے وجود میں اس سے غنی ہے - اسی کو نہایت صاف و سادہ طور پر قرآن نے یوں ادا فرما دیا کہ انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید (تم اللہ کے ہر طرح محتاج و تابع ہو اور وہ ہر طرح غنی و بے نیاز ہے) -

گو "اس تیسرے معنیٰ کے اعتبار سے صوفیہ تمام مخلوقات کو عین باری تعالیٰ کہتے ہیں - مگر بعض اوقات ایک قید اور بڑھا دیتے ہیں' یعنی اس احتیاج خلق الی الحق کا علم و معرفت بھی حاصل ہو' اور اس مقید معنیٰ کے اعتبار سے تمام مخلوقات میں صرف عارف کے لئے عینیت کا اثبات کرتے ہیں' کہ دوسری مخلوق اس عرفان (کے شعور) سے خالی ہے - پھر بعض اوقات اس قید پر ایک اور قید بڑھا دیتے ہیں' کہ ایسی معرفت میں اس قدر استغراق ہو' کہ خود مخلوق حتیٰ کہ اپنی ذات و ہستی کی طرف بھی التفات نہ رہے" - (۱)

بس یہ ہے حضرت مجدد کی صوفیانہ وحدۃ الوجود یا حق و خلق کی عینیت کے باب میں تجدید و تحقیق کا خلاصہ- جس سے نہ کس عامی کو انکار ہو سکتا ہے' نہ کسی عالم کو توحش' اور جس کے سمجھنے کے لئے نہ فلسفی ہونے کی حاجت نہ کسی

---

(۱) التکشف جلد سوم ص ۱۰ تا ۱۲ - ۱۲

مابعد الطبیعاتی فلسفہ یا نظریہ کی ضرورت' نہ بندہ کی بندگی میں کوئی فرق نہ خدا کی خدائی یا تنزیہ میں اس سے کوئی نقص۔

توحید ذات و صفات و افعال : کی اسی طرح جو تحقیق حضرت نے فرمائی اس کا ماحصل یہ ہے کہ توحید افعالی ۔

"جس کا مشہور عنوان لا فاعل الا اللہ ہے (اللہ کے سوا کوئی فاعل نہیں) اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تعالٰی کے سوا کسی کی طرف کوئی فعل منسوب نہیں ۔ اول تو یہ عقائد کے خلاف' پھر اس میں قبائح کا صدور جناب باری تعالٰی سے لازم آتا ہے' پھر مشاہدہ و وجدان بھی اس کی تکذیب کرتا ہے پھر تمام شرائع کا ابطال لازم آتا ہے ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ منتہا تمام اسباب و افعال کا یا یوں کہئے کہ خالق افعال کا بجز حق تعالٰی کے کوئی نہیں گو وسائط و ظاہری اسباب اور بھی ہیں ۔

"البتہ چونکہ عارف کو دوسرے فاعلین کی طرف التفات نہیں ہوتا اس لئے وہ ان کی نفی کرتا ہے' سو واقع میں یہ نفی باعتبار قابل التفات ہونے یا کرنے کے ہے ۔ یعنی بجز اللہ تعالٰی کے کوئی فاعل قابل التفات نہیں یا اس کی طرف التفات نہیں ۔

"اسی طرح توحید صفاتی و توحید ذاتی کو سمجھنا چاہئے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بجز صفات و ذات خداوندی کے کوئی صفت یا ذات موجود نہیں' بلکہ عارف کو کسی اور ذات و صفت کی طرف التفات نہیں ہوتا ۔ اسی مرتبہ میں وحدت کا حکم ہوتا ہے سو یہ تینوں مراتب توحید وجودی کی فرع ہیں" ۔ (۱)

غرض وحدۃ الوجود اور توحید ذات و صفات و افعال کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ خدا یا خالق کے سوا مخلوقات کا سرے سے کسی قسم کا قطعًا نہ کوئی وجود ہے نہ ان

---

(۱) التکشف جلد سوم ص ۱۳۱۵ ۔ ۱۲

کی کوئی ذات اور نہ اس کی طرف کسی درجہ میں کسی طرح کے صفات و افعال کی نسبت کی جا سکتی ہے اور نہ ایسے وحدۃ الوجود کا کوئی محقق صوفی کیا معنی کوئی صحیح الدماغ آدمی قائل ہو سکتا ہے - مطلب صرف یہ ہے کہ حقیقی و ذاتی وجود بلکہ جس کو وجود کہنا چاہیے وہ محض حق تعالیٰ کا ہے - اس طرح صفات و افعال بھی مستقلاً بالذات صرف ایک ہی ذات کے لئے ثابت ہیں - جس کے مقابلہ میں مخلوقات کا وجود اور ذات و صفات وافعال سب کچھ ہونے پر بھی نہ ہونے (۱) ہی کے برابر ہیں - البتہ صوفی پر چونکہ اصلی و حقیقی وجود کا استیلا و استحضار اتنا غالب ہوتا ہے کہ اس کو قدرۃً یہ نہ ہونے کے برابر ہونا بھی سرے سے نظر نہیں آتا جس طرح آفتاب کی روشنی و غلبہ کے استیلاء میں ستارے نظر نہیں آتے -

اسی کو حضرت علیہ الرحمتہ نے اوپر وحدۃ شہود سے تعبیر فرمایا ہے - اور بالعموم مواعظ و ملفوظات وغیرہ میں اس کی وحدۃ الوجود کے نام سے مختلف پیرایوں میں تشریح فرمائی ہے، بلکہ تصوف میں عشق پر جو اتنا زیادہ زور ہے اس کا راز بھی یہی ہے کہ غلبہ عشق میں عاشق کی نظر میں صرف معشوق ہی معشوق رہ جاتا ہے - حتیٰ کہ اپنا وجود بھی اس کو محسوس نہیں رہتا - اور انا لیلی کی طرح انا الحق پکار اٹھتا ہے - سر آمد عرفا و صوفیہ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں کہ ؎

---

(۱) رہا اس "نہ ہونے" کا برابر "ہونے" یا وجود کی اصل نوعیت کیا ہے تو یہ اصل میں خالق و مخلوق یا حادث و قدیم کے ربط و تعلق کی کنہ کا سوال ہے، جو نہ کبھی عقل سے حل ہوا ہے نہ حل ہوگا - کچھ مثالیں البتہ ماری جا سکتی ہیں سو اگر کسی کے تفلسف کی بغیر "ضرب مثال" کے چین نہیں آتا، تو کسی ایسی مثال سے اپنے کو سمجھا لینے میں مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، جس میں حق وخلق کی غیرت محفوظ رہے - اور اس عتبار سے بہترین مثال (مثال ہی کے درجہ میں) احقر کے نزدیک حضرت شیخ اکبر کی وجودیت کی وہ شرح ہے جو مولانا محمد حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ عالم و معلوم کی مثال سے فرمایا کرتے اور اس کے بہترین شارح مولانا مرحوم کی "لسان" ہمارے ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ - اور ان کے مضامین ہیں - ۱۲

جملہ معشوق است و عاشق پردہ
زندہ معشوق است و عاشق مردہ

اسی شعر کے تحت حضرت علیہ الرحمتہ التکشف میں "مسئلہ وحدۃ الوجود ووحدۃ الشہود کی تحقیق" کے عنوان سے فرماتے ہیں کہ

توحید وجود کی تفہیم عام: اوپر کے اشعار میں راز عشق کو کہ مسئلہ توحید وجود ہے پوشیدہ کر گئے، مگر وہ اخفاء عوام کے لئے تھا جو اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے، اور گمراہی و ضلالت میں مبتلا ہوتے ہیں - اس شعر میں خواص کے لئے قدرے اس راز کی طرف اشارہ کر دیا ہے - سو یہ احقر فہم عوام کے لائق بیان کرتا ہے -

"مصرعہ اولیٰ مسئلہ کا دعویٰ ہے اور ثانی میں اس کی تفسیر جملہ معشوق است ہم معنی ہے ہمہ اوست کا جو اس مسئلہ کا مشہور عنوان ہے - عاشق سے مراد کل ممکنات ہیں، جو قدرت خداوندی کے مسخر یا تابع ہیں، پردہ خود نظر آتا ہے مگر پردہ دار نظر نہیں آتا - پس پردہ کے معنی موجود ظاہری کے ہوئے -

خلاصہ دعوے کا یہ ہوا کہ ممکنات کا وجود صرف ظاہری ہے، ورنہ حقیقت میں کوئی بجز ذات حق کے موجود یعنی موصوف بکمال ہستی نہیں - اسی مضمون کو ہمہ اوست سے تعبیر کرتے ہیں - جیسے روزمرہ کے محاورہ میں بھی مثلاً کوئی حاکم کسی فریاد خواہ سے کہے کہ تم نے پولیس میں رپٹ لکھوائی کس وکیل سے مشورہ کیا، اور وہ عرض کرے کہ جناب پولیس و وکیل سب آپ ہی ہیں - تو ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ حاکم پولیس اور وکیل سب ایک ہی ہیں ان میں کچھ فرق نہیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ پولیس اور وکیل کسی شمار میں نہیں، آپ ہی صاحب اختیار ہیں -

"اسی طرح "ہمہ اوست" کے معنی یہ نہیں کہ "ہمہ" اور "اوؔ" ایک ہی

ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمہ کی ہستی لائق شمار نہیں صرف "او" کی ہستی قابل اعتبار ہے دوسرا مصرعہ اس کی تفسیر و تمثیل ہے - ہر صفت کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک کامل ایک ناقص' اور کامل کے روبرو ناقص ہمیشہ کالعدم سمجھا جاتا ہے مثلاً ادنیٰ درجہ کا حاکم اجلاس پر بیٹھا ہوا شان حکومت دکھلا رہا ہو کہ بادشاہ وقت آ پہنچا' اس کے دیکھتے ہی حکومت کا نشہ ہرن ہو گیا - اب جو اپنے اختیارات کو اقتدار شاہی کے سامنے دیکھتا ہے' تو ان کا نام و نشان نہیں پاتا' نیچے کو گڑا جاتا ہے' نہ آواز نکلتی ہے' نہ سر اٹھتا ہے- تو گو اس صورت میں اس کا منصب وعہدہ معدوم نہیں ہوا' مگر کالعدم ضرور ہے -

"بس اس طرح سمجھنا چاہئے کہ گو ممکنات موجود ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے' تو موجود کیوں نہ ہوتے - مگر وجود حق کے سامنے ان کا وجود نہایت ناقص و ضعیف و حقیر ہے' اس لئے گو اس کو عدم نہ کہیں' مگر کالعدم ضرور کہیں گے - تو جب یہ کالعدم ہوا تو واقعی و معتدبہ وجود ایک ہی رہ گیا - یہی معنی ہیں وحدۃ الوجود کے - کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے وجود کا ایک ہونا - سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا ہے سہی مگر اس کا ہونا ایسا ہی ہے جیسا نہیں ہے' اسی کو مبالغۃً وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے - شیخ سعدی نے خوب ہی فرمایا ہے -

یکے قطرہ از ابر نیسان چکید
خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائیکہ دریاست من کیستم
گر اوہست حقا کہ من نیستم

ہمہ ہر چہ ہستند ازوکمترند
کہ باہستیش نام ہستی برند

شیخ نے تو تصریح کر دی کہ ہست تو سب ہیں' مگر ان کی ہستی حق تعالیٰ کے

سامنے ہستی کہنے کے قابل نہیں مولانا (روم) نے دوسرے مصرعہ (زندہ معشوق است و عاشق مردہ) میں اس کو ایک مثال سے بیان کیا ہے کہ حضرت حق کو مثل زندہ کے سمجھو' اور ممکن کو مثل مردہ کے کہ گو لاش بھی کسی درجہ کا وجود رکھتی ہے' مگر زندہ کے روبرو اس کی ہستی قابل اعتبار نہیں - (۱)

اسی طرح توحید وجودی کی ایک اور تقریر مولانا روم ہی کے ان دو اشعار کے تحت فرمائی گئی ہے -

چونکہ بیرنگی اسیر رنگ شد
موسی با موسی درجنگ شد
چوں بہ بیرنگی رسی کان داشتی
موسی و فرعون دارند آشتی

"یہ ظاہر ہے کہ موجودات عالم مطلق وجود میں باہم مشترک ہیں اور انواع وجود میں جن کو ظہورات کہتے ہیں باہم مختلف ومتغائر ہیں - یعنی ہر موجود میں وجود کا ظہور جداگانہ آثار کے ساتھ ہے' مثلا پانی میں وہی وجود اس طرح کا ظاہر ہوا کہ آگ کا بجھا دینا اس کے آثار سے ہیں - اور اہل کشوف کو محقق ہو گیا ہے کہ یہ وجود جو تمام موجودات میں مشترک ہے ماہیت واحدہ ہے - یعنی ہر موجود کا حصہ وجود دوسرے موجود کے حصہ سے وجود و ماہیت میں مختلف نہیں' صرف آثار و عوارض کا اختلاف ہے "-

"باقی وجود مشترک تمام موجودات میں حال یعنی حق تعالی کی وجود بخشی کا ظل یا فیضان ہے - بالفاظ دیگر حق تعالی اس فیضان میں سب کے ساتھ یکساں ہے - حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ جب مختلف موجودات یا ممکنات سے نظر مرتفع ہو

---

(۱) التکشف جلد سوم ص ۲۰۴-۲۰۳-۲۰۲ - ۱۲

گی تو وجود واجب ہی نظر میں رہ جائے گا۔

"تو اب سمجھنا چاہئے کہ مذکورہ بالا دو اشعار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طریق حق پر ہونا اور فرعون کا ناحق پر ہونا بیان کیا گیا ہے پھر بطور انتقال الی التوحید خود مسئلہ توحید کی تحقیق فرماتے ہیں کہ جب وجود مطلق نے تقید و تعین اختیار کیا تو ایک ہادی کو دوسرے ہادی سے اختلاف و تمایز پیدا ہو گیا (جیسا کہ انبیاء علیہم السلام فروع شرائع میں مختلف ہیں گو وہ اختلاف محمود ہے) اس طرح جب تم مختلف و مقید موجودات سے اپنی نظر اٹھا کر اس وجود مطلق پر پہنچ جاؤ تو وہاں ہادی و مضل بھی باہم نفس وجود میں مشترک و متحد نظر آئیں گے۔

"مقصود و توحید کی ترغیب ہے کہ حوادث کے اختلاف پر نظر محدود مت کر لو تاکہ اصلی علت ذات و صفات و افعال حق کا مشاہدہ ہو۔

(کلید مثنوی جلد سوم ص ۴۵" ۴۴)

ان دونوں تقریروں میں وحدۃ الوجود کی ایسی تفہیم ہے کہ ایک طرف عامی بھی آسانی سے سمجھ لے سکتا ہے' دوسری طرف فلسفی کے تفلسف کی بھی تشفی ہو جا سکتی ہے۔ نیز اس میں کسی طرح کے غلو وگمراہی کا اندیشہ نہیں۔ ساتھ ہی وحدۃ الوجود کا اصل مدعا بھی محفوظ ہے۔ کیونکہ علمی یا فلسفیانہ وحدۃ الوجود کی بھی نہ کوئی ایسی صورت ہے نہ ہو سکتی ہے' کہ واجب یا حق تعالیٰ کے سوا ممکن یا خلق کا سرے سے کسی طرح اور کس درجہ کا کوئی وجود ہے ہی نہیں۔ کسی نہ کسی طرح کا ظلی و مثالی یا علمی و تصوری وجود ممکنات کا ماننا ناگزیر ہے۔ حتیٰ کہ فرضی وجود بھی اگر کہا جائے تو وہ بھی ایسا ہے کہ آخر فرض تو کرنا ہی پڑتا ہے یا دو وجود نہ سہی تو کم از کم دو ذاتیں ہی موجود ماننا پڑتی ہیں۔

علمی وحدۃ الوجود سے قرب مطلوب حاصل نہیں ہوتا: رہی ظلی و مثالی' علمی و تصوری یا ایک وجود دو ذات وغیرہ کی سی فلسفیانہ تعبیرات' تو کلام و فلسفہ میں یا فلسفی مزاجوں کے لئے اس کی جو کچھ قدر و قیمت ہو' لیکن اسلامی

تصوف کے وہ بالذات مقاصد میں داخل نہیں' نہ اس کا حصول کوئی مطلوب کمال ہے - خود احقر کو بھی اسی قسم کی تعبیرات سے ذہنی و فلسفیانہ دلچسپی بہت رہی' اور بعض تعبیرات نصوص سے بھی اقرب معلوم ہوتی ہیں' تاہم یہ خیال غلو سے خالی نہیں کہ کسی خاص فلسفیانہ یا علمی تعبیر کا نفس جان لینا "اولئک هم المقربون" والا وہ قرب ہے جو کتاب و سنت کی رو سے مطلوب ہے' یا اس سے بڑھ کر یہ کہ یہی وہ خاص تعلیم ہے' جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوشیدہ طور پر فرمائی تھی' اور جو سینہ بسینہ چلی آتی ہے - حد یہ کہ علم دین کے مقابلہ میں اس علم قرب کو ایک الگ اور اعلیٰ علم سمجھ لیا گیا! تو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ یہ کوئی بڑے راز کی بات نہیں فلسفہ میں ہمیشہ اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں اور رہیں گی (1) - ورنہ پھر جو فاسق و فاجر بلکہ جو کافر و فلسفی بھی اس مسئلہ کو جان لے یا اس کا قائل ہو جائے بس وہ مقرب ہو گیا' یہ تو وہی زندقہ و اباحت کا دروازہ کھول دینا ہے -

دوسرے اگر وہ قرب مطلوب جو دراصل دین کا سب سے بڑا مطلوب و مقام ہے یہی تھا اور پھر بھی عام تعلیمات سے اس کو الگ رکھ کر بطور خاص راز کے تعلیم کیا گیا' تو گویا اصل دین اور دین کے اہم مقصد بلکہ کمال دین کو مخفی اور راز رکھا گیا شتان بینهما! ایسے دعوے سے دین کی عام تعلیمات پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے' کہ نہیں معلوم صیغہ راز میں اور کیا کیا تعلیم کیا گیا ہو' یا اس راز کی تعلیم و

---

(1) سورت کانفرنس کے موقع پر راقم نے جب مذہب و عقلیات پر تقریر کی تو وہاں بہت سے خوجے حضرات تشریف فرما تھے خود سرابراہیم رحمتہ اللہ علیہ صدر تھے - چونکہ اس تقریر میں جدید فلسفہ کی بعض باتیں ایسی تھیں جن سے ان کے نام نہاد اسرار کی تائید ہوتی ہے' تو ان خوجہ حضرات میں سے بعض نے بہت راز میں دریافت فرمایا کہ یہ باتیں آپ کو کہاں سے معلوم ہوئیں -

"در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید" - میں نے عرض کیا "حضرت آپ کے یہ راز اب فلسفہ کے ہر حرف شناس کی زبان پر ہیں! " نہاں کے ماند آن رازکزو سازند محفلہا" - ۱۲

تعبیر کے متعلق، جس مدعی کا جو کچھ جی چاہے کہہ دے - اور کہنے والوں نے کیا الحاد و اباحت تک کی باتوں کو اسرار بتا اور بنا کر لوگوں کو گمراہ نہیں کیا؟

سارے مفاسد کا سدباب : حضرت مجدد علیہ الرحمہ نے ان سارے مفاسد کا سدباب ایک ہی جملہ میں فرما دیا کہ "اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توحید کہتے ہیں، جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں" - یعنی توحید کی محض اس علمی یا فلسفیانہ و متکلمانہ تحقیق کا نفس جان لینا کوئی مطلوب کمال نہیں -

> "غرض وحدۃ الوجود کی حقیقت تحقیق علمی کے درجہ میں تو ہم سب سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس سے عارف نہیں ہو سکتے، کیونکہ عارف کا وہ حال ہوتا ہے، ہمارا محض قال جیسے طوطے صاحب نبی جی بھیجو نبی جی بھیجو رٹ رہے تھے، مگر جب بلی نے دبوچا تو سوائے ٹیں ٹیں کے کچھ منہ سے نہ نکلا" -
>
> (الافاضات حصہ ہفتم ص ۳٦۰)

ہاں بلاشبہ قال کے بجائے

> "جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں فنا کہلاتا ہے یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے - اور یہی حاصل وحدۃ الشہود کا ہے، جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے - کیونکہ اس کا ترجمہ ہے شہود کا ایک ہونا، یعنی واقع میں تو ہستی متعدد ہے، مگر سالک کو ایک ہی مشاہدہ ہوتا ہے، اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہو چکا - ایک اور سب سے واضح تر مثال شیخ سعدی نے بیان فرمائی -

مگر دیدہ باشی کہ درباغ وراغ
بتابد کرکے چوں چراغ
یکے گفتش اے مرغک شب فروز
چہ بودت کہ بیروں نیائی بروز
بہ بین کا تشین کرمک خاک زاد

جواب از سر روشنائی چہ داد
کہ من روز شب جز بصحرا نیم
ولے پیش خورشید پیدانیم

تو اس حال کے "صاحب حال" کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کو نہ کسی سے نفع کی توقع نہ ضرر کا خوف رہے یہ نقال جو تصوف بگھارتے ہیں "ان کو پکڑنے اگر کوئی کانسٹیبل بھی آ جائے تو ڈر کے مارے کانپنے لگیں اور یہاں سارے دنیا کے بادشاہ بھی ہجوم کر کے آ جائیں، تب بھی قلب میں ذرہ برابر اثر نہ ہوا" - "امید و ہراسش بناشد زکس" اور یہ حال اگر حاصل کرنا ہو تو اس کی تدبیر تحقیق علمی نہیں، بلکہ اس کے لئے شیخ کی ضرورت ہے (الافاضات حصہ ہفتم ص ۳۶۰)

"پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے (کما قال مرشدی) مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے، اس لئے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا - جو بہ نسبت عنوان متروک کے اس معنی میں زیادہ ظاہر ہے - کیونکہ لفظ وحدۃ الوجود کی دلالت معنی مذکور پر مجازی ہے، اور وحدۃ الشہود کی دلالت اس معنی پر حقیقت ہے - اور دلیل نقلی اس مسئلہ کی یہ آیت ہو سکتی ہے - کل شیئی ھالک الا وجھہ جیسا شارح عقائد نسفی نے تفسیر کی ہے (۱)

لیکن وحدۃ الوجود کی تائید میں جن دیگر آیات کو زیادہ پیش کیا جاتا ہے، وہ قرب اقربیت، احاطت و معیت اور ظاہریت و باطنیت، اولیت و آخریت کی آیات ہیں، مگر ان آیات سے جس طرح جزم و قطعیت کے ساتھ وحدۃ الوجود کی کسی خاص علمی و فلسفیانہ تعبیر و تفسیر پر استدلال کرنا اگر تحریف نہیں، تو تفسیر بالرائے ضرور ہے اسی طرح دوسری طرف علمائے ظاہر کا ذاتی اقربیت و معیت وغیرہ کا انکار

---

(۱) التکشف جلد سوم ص ۴ - ۱۲

بھی بمالا یرضیٰ بہ قائلہ کی زیادتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ تو فرمائیں کہ میں تم سے قریب و اقرب ہوں ۔ تمہارے ساتھ ہوں یا وہ تمام چیزوں کو محیط ہے وہ سب کا اول و آخر ظاہر و باطن ہے ۔ اور ہم کہیں کہ نہیں معاذ اللہ اللہ تعالیٰ سے کہتے نہیں بنا میں اور وہ سے خود "وہ" یا ان کی ذات نہیں' بلکہ ہر جگہ بلا کسی قرینہ کے ان کی صفات علم و قدرت و نصرت وغیرہ ہی مراد ہیں ۔ یہ تو حق تعالیٰ کے قرب سے جان بوجھ کر اپنے کو محروم کرنا ہے ۔ حضرت علیہ الرحمتہ نے معیت ذاتیہ کے اعتقاد کو صرف ایسے عوام الناس کے لئے احتیاطاً ممنوع فرمایا ہے' جن سے اندیشہ ہے کہ اس کو جسمانی معیت یعنی ایسی معیت سمجھ نہ بیٹھیں گے جیسی کہ دو جسموں میں ہوتی ہے' ورنہ فی نفسہ اس ذاتی قرب و معیت کے خلاف نہ کوئی عقلی و نقلی دلیل ہے اور نہ بلا تکیف اس کے قائل ہونے میں کوئی محذور و خرابی ہے ۔ کسی نے انہیں آیات نحن اقرب الیہ من حبل الورید اور ھو معکم وغیرہ کے پیش نظر سوال کیا کہ

قرب ذاتی و وصفی : "بعض لوگ اس سے قرب ذاتی و وصفی کے قائل ہیں' اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں اس سے مراد محض قرب و صفی ہے ۔ تو ان دونوں فریق میں حق پر کون ہے؟ اور اگر اللہ تعالیٰ بالذات قریب ہو تو یہ قرب استوا علی العرش کے ساتھ کیسے جمع ہو گا؟ نیز جو لوگ اس قرب کو قرب وصفی کہتے ہیں' وہ قرب ذاتی کے قائلین کو کافر کہتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟"

جواب یہ ہے کہ

"چونکہ عوام الناس معیت ذاتی سے معیت جسمانی سمجھ جاتے ہیں' اس لئے علماء نے اس کا ابطال کیا' اور بعض نے اس کے قائلین کی تکفیر کی ۔ لیکن اگر معیت ذاتی سے مراد بلاکیف ہو تو اس میں کوئی محذور نہیں' نہ استواعلی العرش کے ساتھ اس کا اجتماع ممتنع ہو گا کیونکہ نہ وہ ذات متناہی ہے۔(جو یہ دشواری ہو کہ عرش پر ہو کر فرش پر یا ہمارے ساتھ یا ہمارے قریب کیسے ہو سکتی ہے؟) اور

نہ اس کی معیت کو کسی خاص کیفیت کے ساتھ مقید کیا گیا ہے "۔

"البتہ جس کو بلا کیفیت کی قید کے ساتھ اعتقاد پر قدرت نہ ہو' اس کے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ معیت وصفی کا قائل رہے" - (۱)

مطلب وہی ہے کہ وحدۃ الوجود یا ذاتی قرب و معیت کی محتمل و مشیر آیات و نصوص کی تفسیر کو اپنی عقل و رائے کی کسی علمی و فلسفیانہ تعبیر و توجیہ کے ساتھ مقید کرنا نصوص پر زیادتی بھی ہے اور خلاف احتیاط و موجب مفاسد بھی - اور حضرات صوفیہ کا تحقیقی مسلک بھی قرب یا اتصال کے باب میں یہی ہے - جیسا کہ عارف رومی فرماتے ہیں ۔

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس رابا جان ناس

---

(۱) بوادر ص ۵۱ ' ۵۰ - ۱۲

قرب مطلوب

پھر خالق کے مخلوقات یا اللہ تعالٰی کے کائنات کے ساتھ "اس بے تکیف اتصال" و قرب کی حقیقت خواہ وہ ذاتی ہو یا صفاتی' محض قرب واقعی کی ہے' نہ کہ قرب مطلوب کی' اور قرب واقعی یا نفس الامری مومن و کافر صالح و فاسق' انسان و حیوان' نباتات و جمادات غرض ساری کائنات کے ساتھ ثابت و یکساں ہے' کسی کی تخصیص نہیں - اور قرب کی جو آیات مسئلہ وحدۃ الوجود یا قرب ذاتی و صفاتی کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں وہ دراصل اسی قرب واقعی کی نصوص ہیں - مثلاً سب سے اہم آیت "ھو الاول والاخر والظاھر والباطن وھو بکل شئی علیم" کی ہے' تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالٰی کی یہ اولیت و آخریت ظاہریت و باطنیت ساری اشیاء کائنات سے متعلق ہے اور " وھو بکل شئی علیم " کے تحت سموات والارض (یعلم ما فی السموات والارض) کی ساری چیزیں بلا تخصیص اس کی معلوم ہیں - اسی طرح نحن اقرب الیہ من حبل الورید کی اقربیت یا ھو معکم کی معیت جس طرح مومن و صالح کے لئے ثابت ہے' اسی طرح کافر و فاسق کے لئے وقس علی ھذا -

البتہ مومن ہونے کے لئے جس طرح قرآن کی دیگر آیات یا ان کی صحت و واقعیت نفس الامری کا ماننا لازم ہے' اسی طرح اس قرب کی صحت و واقعیت کا ماننا بھی لازم ہے' خواہ اس کی حقیقت و ماہیت سمجھ میں آئے یا نہ آئے' اور بفرض آ بھی جائے' تو اس کی مثال ایسی ہی ہو گی' جیسے کسی بے نمازی کی سمجھ میں اقامت صلٰوۃ کی حقیقت و نوعیت یا اس کی حکمت و مصلحت واقعیہ سب کچھ آ جائے' مگر رہے وہ بے نمازی کا بے نمازی تو بس جیسے بے نمازی مومن نے نماز کا فلسفہ جان لیا' ویسے ہی ہم نے قرب کا بھی ایک فلسفہ جان یا بنا لیا —ورنہ اس قرب و معیت یا وحدۃ الوجود کے ایمان و علم کا بھی اصل مقصود مدعا وہی وحدۃ

الشہود ہے' کہ حق تعالیٰ کی ذات و صفات کا حضور دوام یا مقام احسان حاصل کیا جائے' یعنی اس کا ماننے اور جاننے والا اپنی زندگی کے سارے اعمال و افعال حرکات و سکنات میں اس طرح اللہ تعالیٰ کو قریب و اقرب یا حاضر و ناظر جان کر انجام دے کہ گویا وہ خدا کے سامنے ہے اور اس کو دیکھ رہا ہے - ورنہ کم از کم خود خدا تو اس کو دیکھ ہی رہا ہے - اس استحضار سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی و ناراضی یا معصیت سے بچنے کی فکر ہو گی اور دوسری طرف فرمانبرداری و رضا جوئی یا اطاعت میں مقام احسان نصیب ہو گا جو اسلام و ایمان کا کمال مطلوب ہے - ورنہ اگر "اقیمو الصلوۃ" پر خالی ایمان کے ساتھ ہم نے اس کی حقیقت و اہمیت کا کچھ فلسفہ بھی جان لیا' اور رہے پھر بھی اقامت صلوۃ سے محروم کے محروم' تو الٹے اور زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی یا مار کھانے کا اندیشہ ہے -

بالذات جنت بھی مطلوب نہ ہو : غرض قرب مطلوب یا قرب کا اصلی مقصود بقول حضرت علیہ الرحمہ کے نعوذ باللہ خدا کی گود میں جا بیٹھنا نہیں ہے' بلکہ یہ محققین حضرات صوفیہ کی اصطلاح میں رضا جوئی کے اس بلند ترین مقام کا نام ہے' جس میں بندہ کا مطلوب خود اللہ تعالیٰ یا ان کی رضا جوئی ہوتی ہے - حتیٰ کہ جنت بھی بالذات مطلوب نہیں رہتی - اسی درجہ سبقت (یا عام اہل ایمان سے آگے نکل جانے والوں) کو اللہ تعالیٰ خود اپنے فضل و احسان سے "اصحاب میمنہ" (یا طالبین جنت کے مقابلہ میں) اپنا مقرب خاص بناتے ہیں' جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیات ذیل میں ارشاد ہے کہ

> "فاصحب المیمنہ ما اصحب المیمنہ واصحاب المشمہ ما اصحب المشمہ
>
> ظاہر ہے کہ یہاں اصحاب المیمنہ (داہنی طرف والوں) سے مراد کل اصحاب جنت نہیں' بلکہ صرف عامہ مسلمین مراد ہیں - اور خواص کا ذکر آگے السابقون السابقون اولئک المقربون (۱) میں ہے' جس سے معلوم ہوا کہ یہ تیسری قسم

---

(۱) آگے بڑھ جانے والے آگے بڑھ جانے والے ہی تو مقربین - ۱۲

اصحاب جنت سے بھی ممتاز ہے -

"مگر یہ مطلب نہیں کہ یہ جنت سے کہیں الگ رہیں گے - سکونت کے اعتبار سے یہ بھی اصحاب جنت ہیں، مگر طلب کے اعتبار سے ان سے الگ ہیں - پس اصحاب جنت کی دو قسمیں ہیں ایک طالب جنت، دوسری طالب حق اور سابقون کی تکرار سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ دونوں مذکورہ طبقوں سے سابق ہیں، لہذا اصحاب جنت سے بھی سابق ہوئے یہی معنی اہل جنت سے ان کے ممتاز ہونے کے ہیں -

"اور اہل طریق کے کلام میں تو اس کی بہت تصریح ہے -بزرگوں نے فرمایا ہے کہ طلب کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی چیز کا طالب نہ ہو، نہ جنت کا نہ دوزخ سے بچنے کا - مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کو طلب نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بالذات طلب نہ کرے" (۱) -

وصال و ہجر چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از دغیر اوتمنائے

ایک شبہ : یہ ہوتا ہے کہ حدیث میں ہے کہ اللھم انی اسئلک رضاک وجنتک ' (۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود جنت مطلوب ہے -

"جواب یہ ہے کہ اس سوال جنت کی مثال ایسی ہے، کہ جیسے کوئی سوال کرے کہ فلاں صاحب سے کہاں ملاقات ہو گی اور معلوم ہو کہ باغ میں ہوگی اس پر وہ شخص اگر باغ میں جانے کا آرزو مند ہو تو حقیقت میں وہ باغ مقصود بالذات نہ ہو گا، بلکہ مقصود وہ صاحب ہوں گے - مگر چونکہ وہ باغ میں ملیں گے ' اس لئے باغ کی تمنا ہوتی ہے - اسی طرح حدیث میں مقصود اصلی رضا ہے، جس کو جنت پر مقدم فرمایا ،مگر چونکہ اس کا حصول جنت میں ہو گا - لہذا جنت کا

(۱) اشرف السائل ص ۱۴۴ - ۱۲

(۲) اے اللہ میں آپ سے آپ کی رضا اور آپ کی جنت مانگتا ہوں - ۱۲

بھی سوال کیا - اسی طرح حق سبحانہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں و رضوان من اللہ اکبر ' جہاں رضا کو جنت سے اکبر فرمایا ہے - اس سے معلوم ہوا کہ بڑی چیز رضا ہی ہے - اس اکبر کی تحصیل کا ذریعہ بھی اکبر ہونا چاہئے سو فرماتے ہیں

ولذکر اللہ اکبر معلوم ہوا کہ وہ ذریعہ ذکر اللہ ہے - اور تمام احکام پر عمل کرنے کا مقصود ذکر اللہ ہے (اشرف المسائل ص ۱۸)

"غرض طاعات میں صرف خدا کو مطلوب سمجھو' بلکہ جس کو وصال سمجھ رہے ہو اس پر بھی نظر نہ رکھو - صرف اس عمل کو (مقصود سمجھو جس سے خدا راضی ہے) اور ہمت سے اسی میں لگے رہو حتیٰ کہ اگر رضا فراق میں ہو' تو وصال کا خیال ہی ترک کر دو -

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق
ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(اشرف المسائل ص ۸۴)

باقی گود میں جا بیٹھنے والے وصال یا قرب و معیت کا اہل فلسفہ کے ہاں جو فلسفہ ہو ہو' مگر اہل دین کے فلسفہ میں معتبر و مطلوب قرب رضا ہے - اور اس کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح کی معیت کاملہ ہے - خود قرآن ہی میں ارشاد ہے کہ ان الذین امنوا وعملو الصلحت اولئک ہم خیر البریہ جزاء ہم عندر بہم جنات علن تجری من تحتها الانہار خالدین فیہا ابدا رضی اللہ عنہم رضواعنہ "اس میں ایک تو بلند ترین مقام و درجہ اولئک المقربون کی طرح خیر البریہ (بہترین مخلوق) سے تعبیر فرمایا اور دوسرے اللہ تعالیٰ سے ان کا امتیازی تعلق رضا کا فرمایا - دوسری جگہ وضاحت کے ساتھ مقرب بننے ہی کا ذریعہ ایمان و عمل صالح کے جمع و کمال کو فرمایا - کیونکہ ناقص ایمان و عمل یا محض تھوڑا بہت ایمان تو "عامہ مسلمین" کو بھی حاصل ہوتا ہے - بہر حال اس آیت کے تحت کہ ما اموالکم ولا اولاد کم بالتی تقربکم عند نا زلفی الامن امن وعمل صالحا فاولئک لہم جزاء الضعف بما عملوا وہم فی الغرفات امنون ـ"

ارشاد ہے کہ

" یہ قرآن مجید کی ایک آیت ہے - اس میں خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک بڑی دولت (قرب) کا پتہ اور اس کے حصول کا طریقہ بتلایا ہے اور جو غلطیاں اس میں واقع ہوتی ہیں ان پر تنبیہہ فرمائی ہے - اور یہ دولت قرب خداوندی ہے مگر وہاں قرب جسمانی تو ہے نہیں کہ فاصلہ کم ہو جائے - کیونکہ یہ خواص جسم سے ہے - اور یہاں سے ان عوام الناس کی غلطی معلوم ہو گی جو خواص یعنی مشائخ و صوفیہ کی صورت بناتے ہیں' اور حقیقت میں عامی یا جاہل ہیں - وہ سمجھتے ہیں قرب خداوندی قرب جسمانی ہے' جس کا پتہ ان مثالوں سے چلتا ہے -

"اگر محققین سے اس قسم کی کوئی مثال منقول ہے' تو ہم اس میں تاویل بھی نہیں کرتے' بلکہ ظاہری معنی مراد لیتے ہیں - اور اس قسم کے اقوال بولنے والوں میں بعض تو خدا کو دریا اور اپنے کو موج کے ساتھ تشبیہہ دیتے ہیں اور بعض قطرہ اور دریا کی تشبیہہ دیتے ہیں' تو ایسی تشبیہات اگر کسی معتبر کلام میں پائی جائیں گی تو ہم اس کی تاویل کریں گے" -

انکار تشبیہہ غلو ہے : "کیونکہ نفس تشبیہہ پر انکار کرنا تو غلو ہے - خود قرآن شریف میں تشبیہہ موجود ہے کہ اللہ نورالسموات والارض مثل نورہ کمشکوۃ فیہا مصباح المصباح فی زجاجہ الزجاجہ کانہا کوکب الایہ - اس آیت میں تصریح ہے کہ نور خداوندی کی مثال ایسی ہے' جیسے ایک طاقچہ ہو' جس میں ایک چراغ ہو اور وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو اور چراغ کی یہ حالت ہو جیسے ایک درخشاں ستارہ الی آخرالایہ تو اگر مطلق تشبیہہ مذموم ہوتی تو قرآن میں یہ تشبیہہ کیوں مذکور ہوتی -

"یہ اس واسطے ذکر کر دیا کہ بعض متشدد دین بہت غلو کرتے ہیں کہ معنی پر غور نہیں کرتے محض ظاہری الفاظ دیکھ کر کفر و بدعت کا فتویٰ لگا دیتے ہیں - حالانکہ ارشاد خداوندی ہے کہ لا تغلوا فی دینکم غیر الحق' کہ حق سے

آگے نہ بڑھو - مثلاً جس چیز کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے' اس کو علی الاطلاق حرام کہہ دیا جائے " -

تو چونکہ تشبیہات خود کلام مجید میں موجود ہیں' اس لئے ظاہر ہے کہ تنزیہ پر اتنا زور دینا درست نہیں ہو سکتا کہ تشبیہ کو بالکلیہ حرام قرار دے دیا جائے -

"ہاں وجہ شبہ متعین کرنی چاہئے - تشبیہ نام ہے دو چیزوں میں کسی خاص امر کی باہم مشارکت کا - مثلاً کسی کے چہرے کو چاند کہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز میں چاند اور چہرہ شریک ہیں' اس میں چہرہ چاند کا سا ہے' نہ یہ کہ چہرہ بھی اس قدر بڑا جسم ہے جس قدر چاند یا چاند میں بھی آنکھ کان خدوخال موجود ہیں ' یا جیسے چاند کے ہاتھ پاؤں نہیں اس شخص کے بھی نہیں "-

" علی ہذا خدا تعالٰی نے جو تشبیہ دی ہے ' اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کمال نورانیت میں اس کے مشابہ ہے - اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ دونوں کے کمال کا بھی ایک درجہ نہیں' جس طرح کلی مشکک کے سب افراد برابر نہیں ہوتے' مگر کوئی امران میں مشترک ضرور ہوتا ہے - مثلاً شدت ضیا - نیز مشبہ بہ کا (یعنی جس سے تشبیہ دی جائے) اس کا مشبہ سے زیادہ کامل ہونا بھی ضروری نہیں' البتہ زیادہ واضح و مشہور ہونا ضروری ہے' تو اس طرح اگر کسی محقق کے کلام میں خدا کو دریا اور اپنے کو موج کے ساتھ تشبیہ دی ہو' تو وہ تشبیہ بھی صرف کسی خاص امر میں ہو گی - جیسا مغربی نے کہا کہ

زدریا موج گونا گوں برآمد
زبے رنگی بہ رنگ چوں برآمد

حالت یہ ہے کہ جنہوں نے ایک پارہ قرآن کا نہیں پڑھا' ان اشعار کو پڑھتے اور وجد کرتے ہیں' حالانکہ سمجھتے خاک نہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو یہی کہ خدا پھیلا ہوا ہے اور ہم اس سے نکلے ہیں' اور یہ سمجھ کر اپنا دین برباد کرتے ہیں -

ان کے سامنے ایسے اشعار پڑھنا بھی جائز نہیں" - (۱)

غرض یہ تو جاہل اور نام کے صوفیوں کو ایسی تشبیہات اور ان کے ظاہری اور لغوی معنی کی گمراہیوں پر ضروری تنبیہہ تھی کہ "قرب کے معنی یہ نہیں' جو دریا اور قطرہ میں سمجھتے جاتے ہیں' اور ایسے الفاظ کا لغوی معنی پر محمول کرنا غلطی ہے" -

"بلکہ مراد اس قرب سے جو آیت میں مذکور ہے رضا ہے - یعنی خدا تعالیٰ کا راضی ہونا مراد ہے - قرب کے مختلف درجے ہیں' ایک قرب علمی ہے' جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہر چیز ہی کو حاصل ہے' چنانچہ ارشاد ہے - نحن اقرب الیہ منکم ولکن لاتبصرون یا نحن اقرب الیہ من حبل الورید اور ایک قرب رضا ہے جو بعض کو حاصل ہوتا ہے - اور مذکورہ آیت میں بھی رضا کا قرب مراد ہے' نہ کہ قرب علم کیونکہ وہ مومن و صالح کے ساتھ خاص نہیں- "اور یہ قرب رضا بڑی دولت ہے' مگر اس کو اہل دنیا تو کیا مقصود سمجھتے' بہت سے اہل دین بھی پورے طور سے مقصود نہیں سمجھتے - (۱)

حصول رضا کا طریقہ : یہ معلوم ہو چکنے کے بعد کہ قرب کی جو دولت مطلوب ہے جس کے حصول کا ہم سے مطالبہ ہے ' وہ قرب علمی نہیں بلکہ قرب رضائی ہے' کہ اللہ تعالیٰ کو راضی رکھا جائے - اب زیادہ غور و توجہ سے سمجھنے کے لائق وہ طریقہ ہے جو قرآن مجید نے اس رضا کے حاصل کرنے کا بتلایا ہے -

"پس اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کا طریق بیان فرمایا ہے - ارشاد ہے - ما اموالکم الایتہ یعنی مال و اولاد جس کی تحصیل کے پیچھے لوگ پڑے ہیں یہ قرب کا ذریعہ نہیں ہو سکتے' بلکہ اس کے ذرائع ایمان و عمل صالح ہیں - اور ظاہر ہے کہ ایمان و عمل صالح میں وہی درجہ مطلوب ہو گا جو کامل ہو' کیونکہ ناقص

---

(۱) الرفیق ص ۲۲۴ - ۱۲

(۱) الرفیق ص ۲ - ۱۲

(تو ادنیٰ سے ادنیٰ مومن کو بھی حاصل ہے) وہ پورا پسندیدہ نہ ہو گا' اور جو پورا پسندیدہ نہ ہو' وہ پسند یا رضا کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے" - (۱)

مطلب یہ کہ قرآن مجید کی رو سے جو قرب مطلوب ہے' اور جس کو "اولئک المقربون" - میں انسانیت کا بلند ترین مقام قرار دیا گیا ہے' وہ کمال ایمان و عمل یا بالفاظ دیگر کمال دین ہی کا نام ہو سکتا ہے' اس لئے اگر اصطلاحا علم احسان کی طرف تصوف کا دوسرا نام علم قرب رکھ جائے تو مضائقہ نہیں بلکہ اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے' کہ اسلامی تصوف چونکہ نام ہی احسان یا کمال دین کا ہے اور اسی کمال دین کے درجہ کا قرآنی نام قرب ہے - البتہ ہے یہ عین دین ہی یعنی کمال ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کا تمام و کمال اجتماع -

درجہ کمال کے تین اجزا: "ایمان و عمل صالح کا یہ درجہ کمال موقوف ہے تین چیزوں پر (۱) علم (۲) عمل دائم (۳) اور حال - اور دین کے یہی تین شعبے ہیں - اگر علم نہیں تو احکام کی اطلاع ہی نہ ہو گی - اور اگر عمل نہیں تو اس اطلاع سے کیا نفع ہوا' اور اگر عمل ہے اور بظاہر عمل ہونا کافی معلوم ہوتا ہے - لیکن غور کرنے کے بعد یہ حالت بھی کچھ مفید نہیں' کیونکہ اس میں خلوص و بقا کی امید نہیں - اور حال سے مراد ملکہ ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کسی سے محبت ہو جائے اور اس کو کھلاؤ پلاؤ تو یہ عمل ہے - دوسرے یہ کہ اس کی محبت میں بے چینی ہونے لگے تو یہ حال ہے -

"نرا عمل بدون حال کے پائیدار نہیں ہوتا اور حال ہو جانے کے بعد پائیدار ہو جاتا ہے - مثلاً ایک شخص نماز روزہ کرتا ہے' لیکن صاحب حال نہ ہونے کی وجہ سے نفس پر جبر کر کے کھینچ تان کر کرتا ہے - اگر ایک وقت چھوٹ جائے تو کچھ زیادہ قلق نہیں ہوتا - اور دوسری حالت یہ ہے کہ ایک وقت بھی چھوٹ

---

(۱) الرفیق ص ۱۳۱ - ۱۳

جائے تو زندگی وبال معلوم ہونے لگتی ہے - تو یہ دوسرا صاحب حال ہے - اسی کو کہتے ہیں ؎

بردل سالک ہزار ان غم بود
گر ز باغ دل خلالے کم بود

اور گو اس حالت کا پیدا کرنا واجب نہیں - کیونکہ اگر اخلاص ہوا اور تکلف سے بھی اعمال کرتا رہے ' تو خدا کے ہاں مقبول ہے' اس میں کچھ کمی نہیں - لیکن ہے یہ حالت خطرناک - کیونکہ جب قلب میں تقاضا نہیں تو خدا جانے گاڑی کہاں اٹک جائے' اور کہاں پہنچ کر عمل کا خاتمہ ہو جائے - اس لئے ضروری ہے کہ حال کو بھی پیدا کرے اسی کو کہا ہے

صنمارہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

دراز و دور کے یہی معنی کہ عمل ہو اور حال نہ ہو تو رستہ قطع تو ہو جائے گا لیکن بڑی دشواری و مشکل سے - اور اسی معنی میں مولانا فرماتے ہیں " قال را بگذر مرد حال شو " آگے اس کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ "پیش مردے کاملے پامال شو" - یعنی یہ حالت لکھنے پڑھنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ محض صحبت سے حاصل ہوتی ہے - کیونکہ یہ ملکہ ہے اور ملکہ صحبت ہی سے پیدا ہوتا ہے - اگر کوئی شخص اڑرنگ چین لے کر خط کی مشق کرے تو کبھی وہ ملکہ پیدا نہ ہو گا' جو کسی ماہر خوشنویس کی صحبت سے پیدا ہو گا - یہی کیفیت باطنی حال کی بھی ہے' کہ بے صحبت کے پیدا نہیں ہوتا - لہٰذا

علم و عمل اور حال : تینوں چیزوں کی ضرورت ہوئی - اور یہی دین ہے - اس حال کی تعلیم اس آیت میں ہے - الم یان للذین امنو ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ - مطلب یہ کہ اس طرف جلد توجہ کرو ایسا نہ ہو کہ ایک زمانہ گزر جانے سے قلب میں قساوت پیدا ہو جائے اس آیت سے ثابت ہوا کہ حال

کی تاکید بھی کس درجہ میں قرآن سے ثابت ہے -

" اور یہی وہ شان ہے' جس کو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کان خلقہ القران کہ قرآن آپؐ کا امر طبعی بن گیا تھا' آپ کا جی اسی چیز کو چاہتا تھا' جس کو خدا چاہے - جس شخص کی یہ حالت ہو گی وہ انشاء اللہ راجع کبھی نہ ہو گا نہ واقف (ٹھہرا ہوا) بلکہ برابر ترقی کرتا چلا جائے گا - کیونکہ اول تو قلب میں ایک محرک موجود ہے دوسرے اس حالت کی برکت سے یہ محب ہونے کے ساتھ محبوب بھی ہو جاتا ہے ' بلکہ بعض اوقات اس کی یہ حالت ہوتی ہے' جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے لئے فرماتے ہیں کہ اللھم ادرالحق حیث دار یعنی جس طرف یہ جائیں حق بھی اسی طرف جائے - (۱)

بظاہر یہ مستبعد بلکہ معکوس بات معلوم ہوتی ہے' لیکن اللہ تعالٰی کی قدرت میں تو سب کچھ ہے' وہ اپنے محبوب کے لئے الٹی بات کو بھی سیدھی بنا دے سکتے ہیں

" مثلاً اگر دو شخصوں میں لڑائی ہو جائے اور ایک ایسا ہی محبوب اپنے اجتہاد سے ان میں کسی ایک طرف ہو جائے جو واقع میں حق پر نہ ہو تو خدا تعالٰی حق اس طرح اس کے ساتھ کر دیتے ہیں کہ وہ شخص تائب ہو کر حق پر ہو جائے' اور ان کو اپنی رائے سے پھرنا نہ پڑے" - (۲)

قرب نام ہے کمال دین کا : ماحصل یہ نکلا کہ قرب نام ہے کامل ایمان و عمل صالح یا کمال دین کا' خصوصًا جب وہ امر طبعی کا سا حال بن جائے' کہ دینی زندگی اور دینی احکام کی اطاعت طبیعت بن جائے اور زندگی کی ہر حرکت و سکون میں وہی بات بالطبع مرغوب ہو پسند ہو اور کرنے کا جی چاہے' جو خدا و رسول کو

---

(۱) الرفیق ص ۱۳۴ - ۱۲

(۲) الرفیق ص ۱۳۲ - ۱۲

پسند اور اس کی مرضی ہو - ایسی صورت میں قدرۃً نہ دین سے کسی قسم کی رجعت و ارتداد کا اندیشہ ہے، اور نہ اس راہ میں ترقی کے کسی مقام پر ٹھہر جانے کا، بلکہ طبعی مرغوبات و مطلوبات کی طرح اس میں بھی مزید کی طلب اور برابر آگے بڑھنے ہی کی دھن لگی رہے گی - دین کی لازم یا متعدی کسی زندگی میں کسی درجہ پر قناعت نہ ہو گی، جس طرح طبعی و نفسانی مرغوبات و مطلوبات یا دنیاوی ترقیوں میں آدمی کسی درجہ پر نہ ٹھہرتا ہے، نہ قانع ہوتا ہے - پھر خدا رسی کے درجات کی تو بجائے خود بھی حد و نہایت نہیں ۔

اے برادر بے نہایت در گہے ست
ہر چہ بروے میرسی بروے مایست

"پس علم و عمل اور حال کا جمع کرنا یہ طریقہ ہے قرب و رضا کا جو بہت بڑی دولت ہے - کیونکہ دولت کا مقصود راحت قلب ہے تو اس سے بڑھ کر کیا راحت ہو گی کہ محبوب حقیقی راضی ہو اور قریب ہو"

محبوب و معشوق کے قرب و رضا یا نزدیکی و خوشنودی میں تو ایسی مستی و لذت ہوتی ہے کہ کلفت بھی عین راحت معلوم ہوتی ہے -

ناخوش تو خوش بود برجان من
دل فدائے یار دل رنجان من

جان تک دینے میں پس و پیش نہیں ہوتا -

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستان سلامت کہ تو خنجر آزمائی

"مجنوں کو اس کے اقارب خانہ کعبہ میں لے گئے اور کہا کہ دعا کر اے اللہ رحم فرما لیلیٰ کی محبت سے نجات دے، تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ لیلیٰ کی محبت اور زیادہ کر - غور کرو کہ عورت کی محبت میں یہ حالت ہے تو

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود

گوئے گشتن بہراو ادنی بود (1)

عبدیت : شریعت کی اصطلاح میں اسی عشقی و طبعی حال یا ایمان و عمل کے کمال کا نام عبدیت یا غلامی ہے' یعنی خدا اور رسول کی ہر بات کو بے چوں و چرا ماننا اور کرنا اور اس کی رضا اور خوشی دیکھنا اور پانا ۔

"شریعت کے احکام کے ساتھ ہمارا بالکل وہ مذہب ہو جانا چاہئے جو عاشق کا معشوق کے ساتھ اور مملوک یا غلام کا اپنے مالک کے ساتھ ہوتا ہے ۔ کسی نے ایک غلام خریدا اور اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے' کہا جو آپ مقرر کریں' پھر پوچھا کہ تو کیا کھایا کرتا ہے' کہا جو آپ کھلائیں اس طرح لباس کے متعلق سوال کیا تو جواب دیا جو آپ پہنائیں" ۔

غرض غلامی کی حقیقت ہی یہ ہے کہ مالک و مولیٰ کے حکم و مرضی کے سامنے اپنی خواہش و مرضی کو فنا کر دینا ۔ جب مجازی غلامی کا یہ اقتضاء ہے۔

" تو کیا خدا کے ساتھ جو علاقہ ہے وہ غلامی نہیں' بلکہ اگر غور کرو تو خدا کے ساتھ تو ہم کو حقیقی غلامی کا تعلق ہے انسانی غلامی سے تو انسان آزاد بھی ہو سکتا ہے برخلاف خدا کی غلامی کے کہ اس کا طوق ہماری گردن سے کبھی نہیں نکل سکتا کیونکہ اس غلامی سے آزادی کی یہی صورت ہے' کہ نعوذ باللہ ہم بندے نہ رہیں اور خدا نہ رہے " ۔

انسان کی آفرنیش کا مدعا عبدیت ہے ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۔

"پس معلوم ہوا کہ دنیا میں اس کو جس بات کے حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے' وہ یہی عبدیت کی حالت ہے' یعنی دنیا میں انسان کواس لئے بھیجا ہے کہ وہ اوامر و نواہی کو پورا کر کے عبدیت حاصل کرے ۔ کیونکہ جب تک اس عالم

---

(۱) الرفیق ص ۱۳۲ ۔ ۱۲

میں نہ آیا تھا، محض روح تھا، اور روح بوجہ مجرد ہونے کے نہ قیام پر قادر نہ قعود پر نہ رکوع پر نہ سجود پر" - (۱)

اوامر و نواہی کا تعلق ہی زیادہ تر افعال و اعمال سے ہے، خواہ وہ اصطلاحی عبادات ہوں یا معاملات و معاشرت و اخلاق سب کو پورا کرنا ہی عبدیت یا بندگی ہے - لہٰذا کمال عبدیت کی ترقی جو "موقوف ہے ان عبادات خاصہ پر وہ اس جسمانی و نفسانی دنیا میں آئے بغیر ممکن ہی نہ تھی -

علیٰ ہذا عبد کی حیثیت سے ہم کو اوامر و نواہی کے اسرار و مصالح معلوم کرنے کا بھی نہ حق ہے، نہ اس کی فکر میں پڑنا چاہیئے، بس جو کچھ حکم ہو بے چوں و چرا ماننا اور پورا کرنا اور اسی کو عین حکمت و مصلحت جاننا چاہیئے -

"بلکہ میں کہتا ہوں اگر خلاف مصلحت بھی ہو تب بھی ہم کو دم مارنے کی گنجائش نہیں - کیونکہ ہم عبد یا غلام ہیں - بلکہ اس نیت کی بھی مجال نہیں کہ یہ ہمارے لئے مصلحت ہے - آخر ہم ہیں کیا چیز، کچھ بھی نہیں -

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطافست

زبان تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت از کار تو

وحدۃ الوجود سے بھی اصل میں عبدیت ہی کا حال و کمال مطلوب ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات و احکام کے سامنے نہ صرف دنیا اور نفس کی خواہشات فنا ہو جائیں، بلکہ اس حال کا اتنا غلبہ ہو جائے، کہ حق کے مقابلہ میں اپنا یا خلق کا وجود سرے سے نظر نہ آئے -

"یہی وہ کیفیت ہے جس کو اہل فن نے وحدۃ الوجود کہا ہے - یہ معنی نہیں جو

---

(۱) الرفیق ص ۱۵۹ - ۱۲

عوام میں مشہور ہیں کہ میں بھی خدا تو بھی خدا اور در و دیوار بھی خدا' یہ بالکل غلط ہے - اور بعضے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی بالکل موجود ہی نہیں - یہ بھی بالکل غلط اور قرآن و حدیث کے بالکل خلاف ہے - ارشاد خداوندی ہے کہ اللہ خالق کل شئی وھو علی کل شئی وکیل -

"حقیقت میں یہ مسئلہ حالی ہے قالی نہیں- وہ حال یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی ذات پیش نظر ہوتی ہے تو دوسروں کا اور اپنا وجود کالعدم معلوم ہوتا ہے بالکل ایسی مثال ہے کہ اگر ایک شخص کسی خیال میں منہمک ہو' تو اس کو دوسری چیزوں کی طرف مطلق التفات نہیں ہوتا - اگر کوئی آواز دیتا ہے ' تو وہ سنتا نہیں' بلکہ بعض اوقات اس قدر انہماک ہوتا ہے' کہ کوئی سر کے پاس آکر آواز دے (یا کھڑا ہو جائے) تو بھی مطلق خبر نہیں ہوتی - اس کیفیت میں وہ محاورہ میں مجازا کہہ سکتا ہے کہ لاموجود الا الا مر الفلانی" - (۱)

قرب نوافل : غرض تصوف کی اصطلاح میں وہی وحدۃ الوجود ہے' وہی وحدۃ الشہود ہے' وہی فنا ہے' وہی قرب ہے وہی وصال ہے جو شریعت کی اصطلاح میں عبدیت یا بندگی ہے - اور جس کو مشہور احادیث کے اتباع میں قرب و نوافل و قرب فرائض کے عنوانات سے صوفیہ نے تعبیر فرمایا ہے- جس کی تفصیل یہ ہے کہ

"جب بندہ ریاضت و مجاہدہ کرتا ہے' تو اس کے صفات رذیلہ اور شہوت و غضب کے دواعی یا محرکات زائل ہو جاتے ہیں اور نفس میں مرضیات سے محبت اور نامرضیات سے بغض کا ایک راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے' جس سے اعمال حسنہ و افعال محمودہ بے تکلف صادر ہوتے اور اعمال قبیحہ و افعال ذمیمہ قریب معدوم ہو جاتے ہیں ایسے شخص کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ فاذا اجبتہ کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصربہ ویدہ التی یبطش بھا ورجلہ التی

---

(۱) التکشف ص ۲۸ - ۱۲

یمشی بھا (رواہ البخاری) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کے کان اور آنکھ اور ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں - جن سے وہ سنتا' دیکھتا پکڑتا اور چلتا ہے"۔

جب وہ مرضی حق کے خلاف نہ کان سے کچھ سنتا ہے' نہ آنکھ سے دیکھتا ہے' نہ اس کے خلاف ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے' بلکہ جو کچھ بھی دیکھتا سنتا یا کرتا ہے' بالکلیہ حق تعالیٰ ہی کی مرضی اور حکم کے تابع رہ کر تو ظاہر ہے کہ اس کے کان آنکھ ہاتھ پاؤں اپنے کیا رہے عملاً خدا کے ہو گئے "ورنہ ظاہری معنی عقلاً و شرعاً محال ہیں' مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس کے اعضا و جوارح سے سارے افعال اللہ ہی کی مرضی کے موافق سرزد ہوتے ہیں" اس لئے یوں فرمایا کہ "گویا میں ہی اس کے اعضاء (یعنی کان آنکھ ہاتھ پاؤں) بن جاتا ہوں" -

"چونکہ مجازاً اس حدیث میں حق تعالیٰ کو آلہ اور عبد کو فاعل کہا گیا ہے اس لئے صوفیاء کرام نے اس کا اتباع کر کے یہ عنوان مقرر کیا ہے کہ بندہ فاعل اور حق تعالیٰ آلہ بن جاتے ہیں - اور چونکہ حدیث میں اس مرتبہ کا حصول تکثیر نوافل پر وارد ہے - اور مجاہدہ و ریاضت میں تکثیر نوافل لازم ہے خواہ نماز ہو یا روزہ یا کثرت مراقبات یا تقلیل شہوات' اس لئے صوفیہ حدیث کی پیروی میں اس مرتبہ کو قرب نوافل کہتے ہیں - اور چونکہ اس میں صفات و افعال رزیلہ کا ازالہ ہوتا ہے' اس لئے فناء صفات سے تعبیر کرتے ہیں" -

قرب فرائض: اس کا درجہ قرب نوافل سے بھی اعلیٰ ہے اور مطلب یہ کہ "عبد کی ہستی ایسی مضمحل ہو جائے کہ اپنی قدرت و ارادہ کو حق کی قدرت و ارادہ کے سامنے ذوقی طور پر کالعدم جاننے لگے اور افعال و اعمال میں محض بمنزلہ آلہ حق کے رہ جائے اور حق کی مستقل موثریت پیش نظر ہو جائے - چونکہ یہ اول سے اعلیٰ ہے کیونکہ اول میں صرف فنائے رذائل تھا فنائے اختیار نہ تھا - اس لئے اس سے اعلیٰ ہوا -

"اور حدیث میں تقرب بالفرائض کو تقرب بالنوافل سے اعلیٰ و افضل کہا گیا ہے - چنانچہ اس حدیث کا سب سے اول جز یہ ہے وما تقرب الی عبدی بشیی احب الی مما افترضت علیہ - اس لئے حدیث ہی کی موافقت میں صوفیہ اس کو قرب فرائض کہتے ہیں - اور چونکہ اس میں سالک کو اپنے ذاتی صفات قدرت و اختیار پر بھی نظر نہیں ہوتی' اس لئے اس کو فناء ذات سے تعبیر کرتے ہیں- (۱)

تفویض و دعا : خلاصہ سب کا وہی بندگی و غلامی یا عبدیت ہے کہ مالک کے سامنے ہم ہماری ذات و صفات کچھ بھی ہمارا نہیں سب اسی کی ملک ہیں' اور ہم نرے غلام - اسی عبدیت کا ایک اور عنوان تفویض ہے' اور بظاہر تفویض و دعا میں تعارض معلوم ہوتا ہے' اس کی مجددانہ تحقیق سنئے جو یاد رکھنے کے لائق ہے -

"کہ تفویض کے یہ معنی نہیں کہ مانگے نہیں' بلکہ عزم یہ رکھے کہ مانگنے پر بھی نہ ملا' تو اس پر بھی راضی رہوں گا - ورنہ مانگنے کا امر نہ فرمایا جاتا البتہ عین دعا یا مانگنے کے وقت بھی اس کا استحضار رہے کہ مانگنے پر بھی نہ ملا تو اس پر بھی دل سے راضی رہوں گا- یہ وہ مسئلہ ہے کہ بڑے بڑے فضلا کو شبہ ہو گیا کہ دعا و تفویض کیسے جمع ہوں - مگر میں کہتا ہوں کہ خوب مانگے اور خوب الحاح و زاری کر کے مانگے مانگنا ہرگز تفویض کے منافی نہیں" -

"اور ایک کام کی بات بیان کرتا ہوں جو یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عبدیت اس میں زیادہ ہے کہ یہ سمجھ کر مانگے کہ یہ چیز ضرور ہم کو ملے اور ضرور ہی دیں گے' کیونکہ یہ شان عبدیت کے لئے لازم اور مانگنے کے آداب میں ہے - آگے ان کو اختیار ہے' اگر بندہ کے لئے مصلحت و حکمت دیکھیں گے عطا فرمائیں گے - نیز مانگنے کا جب خود حق تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے تو نفس دعا یا مانگنے کو بھی

---

(۱) انکشف ص ۳۸ - ۱۲

مقصود سمجھو -

"تو مقصود دو ہوئے ایک وہ چیز جو مانگ رہے' دوسرے خود مانگنا - بلکہ نہ مانگنے میں اندیشہ ہے (ا)- اس لئے کہ حکم مانگنے کا تھا' جس میں استغنا سے کام لیا - بعض لوگ خود دعا کو تو مقصود سمجھتے ہیں' لیکن جس حاجت کی دعا مانگتے ہیں اس کو مقصود نہیں سمجھتے یہ غلطی ہے" -

اور درحقیقت بڑی غلطی - جس کو لوگ تفویض سمجھ بیٹھے ہیں' اس لئے کہ یہ استغنا ہے حق تعالیٰ کے سامنے جو عبدیت کے سراسر خلاف ہے -

"خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے بعد دعا میں یہ اضافہ فرمایا کرتے تھے غیر مودع ولا مستغنی عنہ ربنا یعنی ہم اس کھانے کو رخصت نہیں کرتے' نہ اس سے مستغنی ہیں - صدہا حدیثیں ہیں' جن میں حضور سے حاجتوں کا مانگنا ثابت ہے' تو ایسی چیز تفویض کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے' لہٰذا مانگنے کو تفویض کے خلاف سمجھنا سخت غلطی ہے گو اجتہادی غلطی ہے' جس کا سبب غلبہ حال ہے" -

دعا کے بجائے وظائف : لوگ حاجتوں اور مرادوں کے لئے دعا کے بجائے وظائف زیادہ پوچھتے ہیں اور ان کو زیادہ موثر جانتے ہیں' اس کی نسبت ایک ملفوظ بڑی دقیق تنبیہہ فرمائی - کسی نے بے روزگاری کی شکایت کی اور تعویذ مانگا تو فرمایا کہ

"روزگار کے لئے تعویذ نہیں ہوتا پڑھنے کے لئے بتا دیتا ہوں کہ یا باسط دو اوپر ستر مرتبہ پانچوں نمازوں کے بعد پڑھ لیا کرو' اسی سلسلہ میں فرمایا کہ آج کل لوگ وظائف کے پیچھے پڑے ہیں - اور اصل چیز یعنی دعا کو اختیار نہیں کرتے جو روح اور مغز ہے تمام عبادات کی - اور ایک کام کی بات بیان کرتا ہوں کہ

(ا) جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نہ مانگنے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں ۱۲

وظائف پڑھنے سے قلب میں ایک دعوے کی شان پیدا ہوتی ہے' کہ ہم ایک تدبیر کر رہے ہیں' بس ثمرہ گویا ہمارے قابو میں ہے اور دعا میں شان عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے' کہ اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں وہ چاہیں گے تو دیں گے "۔ (۱)

شان عبدیت : کا جن بزرگوں پر غلبہ ہوتا ہے' ان کا رنگ ہی عجیب ہوتا ہے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا رنگ یہی تھا ۔ ایک مرتبہ حضرت کی خدمت میں کوئی صاحب حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ

"کوئی ایسا وظیفہ بتا دیجئے کہ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو ۔ حضرت نے فرمایا آپ کا بڑا حوصلہ ہے ۔ ہم تو اس قابل بھی نہیں' کہ روضہ مبارک کے گنبد شریف کی زیارت نصیب ہو جائے ۔ اللہ اکبر کس قدر شکستگی و تواضع کا غلبہ تھا ۔ یہ سن کر ہماری آنکھیں کھل گئیں ۔ حضرت کی عجیب شان تھی' اس فن کے امام تھے ۔ ہر بات میں محققیت و حکمت کی شان ٹپکتی تھی ۔ ع ۔ ہر کجا پستی است آب انجارود ۔

پس وہاں تو مٹ جانے اور فنا ہو جانے کا سبق ملتا تھا ۔ یہ حالت تھی کہ اپنے ہر ہر خادم کو اپنے سے افضل سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ آنے والوں کے قدموں کی زیارت کو اپنے لئے ذریعہ نجات سمجھتا ہوں حضرت پر شان عبدیت کا غلبہ رہتا تھا" ۔ (۲)

شریعت و طریقت دونوں کا کمال مقصود بندگی و عبدیت ہی ہے' جس کو اوپر قرب رضا کہا گیا ہے' یعنی مرضیات نفس کو مرضیات حق میں فنا کر دینا اور اپنے اعمال کو بالکلیہ حق تعالیٰ کے احکام کے تابع کر دینا ۔ اس لئے اس وصول و قرب کا حصول اب صرف اسلام ہی کی راہ سے ممکن ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کے صحیح و

---

(۱) الافاضات الیومیہ ص ۲۰۴ ۔ ۱۲

(۲) ایضاً ص ۲۱۲ ۔ ۱۲

مستند احکام یا مرضیات کا علم کہیں اور موجود ہی نہیں - اور بے ان کے علم و اتباع کے اگر کوئی قرب و وصول ہو گا تو وہ ایسا ہی ہو گا' جیسے کوئی باغی یا چور کسی چور دروازہ سے بادشاہ کے خلوت خاص میں داخل ہو کر اپنے کو بادشاہ کے مقربین میں سمجھ بیٹھے - یا اس سے بڑھ کر اسی حقیقت کی تفہیم میں خود حضرت نے ایک لطیف قصہ سے مثال دی ہے کہ

وصول بلا رضا کی عجیب مثال : "اصل مقصود رضا ہے محض وصول مقصود نہیں یعنی جو وصول یا قرب حق تعالٰی کی رضا کے ساتھ نہ ہو وہ مقصود نہیں - وصول بلا رضا کی مثال ایسی ہے' کہ دہلی کے شاہی زمانہ کا واقعہ مشہور ہے کہ کوئی غریب دیہاتی دہلی آیا - اس کو شوق ہوا' کہ بادشاہ کو دیکھوں - ایک شخص ملے ان سے کہا کہ کوئی ایسا طریقہ بتلاؤ کہ بادشاہ کا دیدار کر لوں - انہوں نے کہا یہ کیا دشوار ہے کسی بھلے مانس کو پیٹ پاٹ دو وہ خود پکڑ کر دربار میں لے جائے گا' بس دیدار ہو جائے گا - دیہاتی نے کہا اجی بس تم سے زیادہ بھلا مانس کون ہو گا' اور یہ کہہ کر ان کو پیٹ دیا - وہ چونکہ معزز آدمی تھے بڑی بے عزتی ہوئی' اس لئے ان کو بڑا غصہ آیا' اور اس دیہاتی کو پکڑ کر خود دربار میں لے گئے- اس طرح اس کو بادشاہ کا دیدار ہو گیا - تو کیا کوئی ایسے دیدار کو مستحسن سمجھے گا' اس طرح تو ہر شخص ہی بادشاہ کا دیدار کر سکتا ہے "-

یہ تو سراسر مجرمانہ دیدار ہوا "دیدار وہی محمود ہے جو بادشاہ کی خوشی کے ساتھ ہو' اسی طرح وصول وہی مقصود ہے جو رضا کے ساتھ ہو" (1) - ایک وعظ میں اسی بحث کے سلسلہ میں کہ انسان کو عالم ارواح سے عالم اجسام میں لانے کا راز ہی یہ ہے کہ اس کو اتباع احکام یا اعمال کی راہ سے قرب رضا میں ترقی کی دولت نصیب ہو' اس کو واضح فرمایا ہے کہ قرب مقصود کا مدار تمامتر اعمال ہی پر ہے -

---

(۱) افاضات حصہ ہفتم ص ۱۰'۹ - ۱۲

اور اکثر اکابر صوفیہ کے ہاں عالم ارواح سے جدائی کی جو شکایت ہے جیسے مثنوی شریف کی اسی سے ابتدا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
واز جدائی ہا شکایت می کند

اس کو غلبہ حال پر محمول فرمایا ہے۔ اس وعظ میں مومن کی موت کو اصل زندگی اور خصوصًا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو اصل حیات یا ولادت ملکوتیہ قرار دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

یہ حیات دراصل موت ہے: "حیات وموت کے متعلق ایک لطیف نکتہ عرض کرتا ہوں۔ اب تک میں نے موت کا حیات ہونا ثابت کیا تھا اب حیات کا موت ہونا بتاتا ہوں۔ موت حقیقتہ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کو کہتے ہیں۔ جس طرح اس حیات ناسوتی کا انقطاع یعنی ولادت ملکوتیہ اس لئے موت ہے، کہ اس سے عالم ناسوت سے عالم ملکوت کی طرف انتقال ہوتا ہے، اس طرح ولادت ناسوتیہ بھی اس لئے ایک قسم کی موت ہے، کہ اس سے عالم ارواح سے عالم اجسام کی طرف انتقال ہوتا ہے، بلکہ اس کو موت کہنا زیادہ زیبا ہے۔ کیونکہ موت سے (جس کو عام طور سے موت کہا جاتا ہے) وطن اصلی کی طرف انتقال ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ وطن کی طرف جانا تو اصل مطلوب ہی ہوتا ہے۔ اس کو موت کہنا محض عرف ہے۔ ورنہ اصل موت تو یہی ہے کہ وطن اصلی کو چھوڑ کر وطن عارضی میں آ جائے، مگر چونکہ عام طور پر لوگ وطن اصلی سے غافل ہیں اس لئے اس حیات ناسوتیہ ہی کے انقطاع کو موت کہتے ہیں اور ولادت ناسوتیہ کو موت نہیں کہتے۔ مگر جس کی نظر وطن پر ہے وہ اس کے خلاف سمجھتا ہے۔

اس لئے حضرات صوفیہ اکثر

"وطن اصلی کو یاد کرتے، اور وہاں سے جدا ہونے پر تاسف کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا جامی اس وطن کا پتہ دیتے اور وہاں سے مفارقت پر رنج کرتے ہیں۔

چرا زان آشیان بیگانہ گشتی
چو دو نان چغد ایں ویرانہ گشتی

اصلی وطن عالم ارواح ہے جس کے سامنے یہ عالم ناسوت ویرانہ ہے - لہٰذا حزن اس کی جدائی پر ہونا چاہیئے نہ کہ یہاں سے جدا ہونے پر مولانا روم اس کو یاد کر کے فرماتے ہیں ؎

بشنو از نے چون حکایت می کند
واز جدائی ہا شکایت می کند

پھر یہ حیات کیوں عطا ہوئی : "جب یہ حیات بھی موت ہی ہے اور ہم اپنے اصل وطن عالم ارواح میں تھے' تو سوال یہ ہوتا ہے کہ وہاں سے نکال کر ہم کو یہاں کیوں بھیجا گیا - وہاں کی حیات یہاں سے افضل ہی تھی - اور یہاں سے زیادہ قرب بھی وہاں حاصل تھا -

"جواب یہ ہے کہ یہاں اعمال کے لئے بھیجا گیا' اور اس وجہ سے موجودہ حیات کو گزشتہ حیات پر ترجیح ہے - اس کو محققین نے سمجھا ہے' ورنہ مغلوب الحال تو یہی چاہتے ہیں کہ عالم ارواح ہی میں رہتے - کیونکہ بظاہر وہاں آرام بھی تھا اور قرب بھی تھا -

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس ہوس میں پھنسا دیا

وجہ یہ کہ خیال عادۃً فراق میں ہوتا ہے نہ کہ وصال و قرب میں - حضرت عارف جامی نے مثنوی کے ابتدائی اشعار کی شرح میں اس مضمون کو ایک خاص عنوان سے ادا کیا ہے -

حبذا روزیکے کہ پیش از روز و شب
فارغ از اندوہ و آزاد از طلب
متحد بودیم باشاہ وجود

حکم غیبت بکلی محو بود
نے زحق ممتاز و نے ازیکدگر
غرق در دریائے وحدت سر بسر
امتیاز علمی آمد درمیان
بے نشانے را نشانہا شد عیاں
واجب و ممکن زہم ممتاز شد
رسم و آئین دوئی آغاز شد

ان کا بھی وہی حاصل ہے، جو مثنوی کے ابتدائی اشعار کا کہ اس عالم کی تمنا ہے اور یہاں آنے پر تاسف۔

اس حیات سے بیزاری غلبہ حال ہے: اب آگے حضرت مجدد کی تجدید و تحقیق ملاحظہ ہو کہ۔

"یہ غلبہ حال ہے تحقیق نہیں، کیونکہ اس عالم کی تمنا کیوں ہے، اسی لئے تو کہ وہاں قرب تھا، (جیسا کہ متحد بودیم باشاہ جود وغیرہ سے ظاہر ہے) لیکن قرب کی حالت یہ ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ ہر درجہ کے آگے بھی درجات ہیں اور ظاہر ہے کہ قرب طبعًا محبوب ہے، تو اس کا ہر درجہ محبوب ہے۔ خصوصًا عشاق کو کہ وہ تو اگر یہ جان لیں کہ قرب کے اور بھی درجات ہیں، تو ان کو موجودہ حالت پر کبھی صبر نہیں ہو سکتا

نہ گویم کہ بر آب قادر نیند
کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

"غرض زیادت قرب سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب سمجھئے کہ اس عالم میں قرب تو تھا، مگر ایک خاص حد تک ہی تھا بڑھتا نہ تھا۔ کیونکہ عادت یہ ہے کہ قرب بڑھتا ہے جانبین کے تعلق سے۔ اور حق تعالٰی کی عادت یہ ہے کہ ان کو بندہ کے ساتھ تعلق اس وقت بڑھتا ہے جب بندہ کی

طرف سے طلب ہو - اور طلب کی حقیقت ہے عمل وہاں عمل تھا ہی نہیں' اس لئے قرب بڑھتا نہ تھا -

طلب سے ترقی : اس لئے عالم ارواح سے عالم اجسام میں بھیجا کہ طلب سے عمل پیدا ہو اور اس سے ترقی کا دروازہ کھلے - حدیث قدسی میں خود فرماتے ہیں کہ من تقرب الیّ شبر اتقربت الیہ ذراعا ومن تقرب الی ذرا عاتقربت الیہ باعا ومن اتان یمشی اتیتہ ھرولہ او کما قال کہ جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا' یا قریب ہوتا ہے' اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا (یا قریب) ہوتا ہوں' اور جو ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں دو ہاتھ بڑھتا ہوں -اور جو میری طرف چل کر آتا ہے اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں' سبحان اللہ کس قدر عنایت ہے کہ بندہ کی ذرا سی طلب پر کس قدر توجہ فرماتے ہیں -

مگر شرط وہی ہے کہ طلب و سعی کی ابتدا بندہ کی طرف سے ہو' جیسا کہ خود حدیث بالا سے واضح ہے -

"غرض مزید قرب کے لئے طلب اور طلب کے بعد سعی کی ضرورت ہے کیونکہ اللہ تعالٰی جسم تو ہیں نہیں جو نعوذ باللہ کسی مکان میں ہوں' کہ دوڑ کر انتقال مکانی کے ذریعہ مسافت کو طے کر لیا جائے اور اللہ میاں کی گود میں جا بیٹھیں - ان کے ساتھ قرب حاصل کرنا یہی ہے کہ ان کی رضا حاصل کی جائے کہ ان کو اپنے سے خوش کیا جائے' اور ان کی عنایات و توجہ کو اپنی طرف مائل کیا جائے - بس یہ ہے قرب حق کا حاصل -

"اور حق تعالٰی کی رضا و توجہ صرف ایک چیز پر منحصر ہے - وہ کیا اعمال صالحہ - جب بندہ اعمال صالحہ اختیار کرتا ہے' اس وقت حق تعالٰی کی توجہ اس پر منعطف ہوتی ہے - چنانچہ خود فرماتے ہیں ان الذین امنوا وعملو الصلحت اولئک جزاء ھم عند ربھم جنت علن تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا رضی اللہ عنھم و رضواعنہ - ذلک لمن خشیی ربہ - ان آیات میں رضا یا

قرب رضا کو ایمان و اعمال صالحہ پر ہی مرتب فرمایا ہے -

جب یہ سمجھ میں آ گیا کہ قرب کے معنی رضا ہیں اور رضا اعمال صالحہ پر موقوف ہے - اب اعمال کی دو قسمیں ہیں اعمال قلب اور اعمال قالب جو جوارح سے متعلق ہیں پھر اعمال قلب کی دو قسمیں ہیں ایک مکسوب ایک موہوب - مثلاً اصل محبت اصل خشیت' اصل شوق (یعنی انسان کے اندر ان چیزوں کی استعداد و صلاحیت) یہ تو موہوب قلبی اعمال ہیں' جن کو بڑھایا ذکر اور مراقبات و ریاضات وغیرہ سے جا سکتا ہے ' جو قلب کے اعمال مکسوبہ ہیں -

"اور ظاہر ہے کہ اصل اعمال قلبیہ وہی ہیں جن میں اکتساب و اختیار کو دخل ہو - باقی اعمال موہوبہ کو اعمال کہنا مجاز ہے اور وہ قرب بھی جس کو قصد سے حاصل کیا جا سکتا ہے' ایسے ہی اعمال سے حاصل ہوتا ہے ' جو اختیاری ہیں پس عالم ارواح میں قالب کے اعمال سے تو مطلقاً محرومی تھی' (کیونکہ وہاں قالب یا جسم تھا ہی نہیں) اور ایسے اعمال قلب سے بھی تھی جن کا مدار کسب و اختیار پر ہے - کیونکہ آلات اکتساب ہی سرے سے موجود نہ تھے -

"اس لئے قرب تو وہاں بے شک تھا' مگر ایک حد پر رکا ہوا تھا' جس سے آگے ترقی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہاں اعمال پر قدرت ہی نہ تھی سو محققین کو تو عالم ارواح کے تصور سے بے چینی ہوتی ہے کہ وہاں کیا خاک چین تھا- آرام و راحت تو یہاں ہے کہ رات دن جتنی ترقی چاہو اعمال کے ذریعہ کر سکتے ہو - کوئی اس کے لئے حد ہی نہیں کسی درجہ پر پہنچ کر ترقی بند نہیں ہوتی - عاشق کو بھلا اس پر کہاں چین آ سکتا ہے کہ محبوب سامنے ہو اور یہ کہہ دے کہ خبردار آگے نہ بڑھنا - وہ تو چاہتا ہے کہ محبوب سے لپٹ جاؤں - بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ وہ مجھ سے لپٹ جائے -

اس ترقی کا دنیوی کمال : بندہ تو اپنے اعمال سے خدا کو لپٹ سکتا یا اس کا قرب حاصل کر سکتا ہے' لیکن یہ تڑپ پورے ہونے کی کیا شکل ہو سکتی ہے' کہ

خدا بندہ سے لپٹ جائے - اس کی عجیب تشریح فرمائی ہے کہ

"لپٹنے میں ہوتا کیا ہے یہی تو ہوتا ہے، کہ محبوب عاشق کو غایت قرب کے ساتھ اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے - سو قرب تو اوپر (نحن اقرب الیہ من حبل الورید وغیرہ سے) ثابت ہو چکا - باقی احاطہ سو وہ بھی موجود ہے - خود حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان اللہ بکل شیئی محیط یہ بڑی تسلی کی بات ہے، ان جذبات کو اہل عشق خوب سمجھتے ہیں گو مجازی ہی ہوں، نیز تقربت الیہ بھی اس معنی پر دال ہے، بلکہ آیت سے بھی زیادہ دال ہے - کیونکہ آیت تو احاطہ تکوینی کو بھی شامل ہے اور حدیث نص ہے - کیونکہ قرب بھی رضا ہے، گو اس میں احاطہ کی تصریح نہیں - تو آیت سے احاطہ لیا جائے اور حدیث سے رضا کو تو مجموعہ مدعا میں نص ہو گیا - بہرحال حق تعالیٰ آپ کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہیں - اس قرب میں تو پہلے ہی سے قریب ہیں - اعمال کے بعد پھر دوسرا قرب میسر ہو جاتا ہے، جس کا ادراک ذاتی طور پر آپ کو بھی ہو سکتا ہے -

"بہرحال یہ تعلق تو ادھر سے ہوا اور آپ کی طرف سے تعلق یہ ہے کہ

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی
شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

یعنی ہمیشہ احکام الٰہی پر نظر رکھی جائے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہوں - پھر تو جانبین سے قرب کی وہ کیفیت ہو گی، جس کو اردو کا شاعر کہتا ہے -

آرزو یہ ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے
تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے"

اخروی کمال : جب یہ جانبین کا قرب اس دنیا میں حاصل ہو سکتا ہے، تو پھر سوال ہوتا ہے کہ آخرت کے لئے کیا رہا؟ جواب یہ ہے کہ

"ظہور تام اس قرب کا اور اس سے کامل تمتع آخرت ہی میں ہو گا - یعنی دنیا میں آکر عبد و حق کے درمیان جو قرب ہو جاتا ہے، گو یہ عالم ارواح کے

مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے، تاہم یہ کمی رہ جاتی ہے کہ اس سے کامل تسلی نہیں ہوتی، اور آخرت میں پوری تسلی ہو جائے گی - یعنی ہر شخص کو اس کی تمنا کے موافق انکشاف میسر ہو گا - کیونکہ تمنا کے موافق تحمل عطا ہو جائے گا -

"مگر یہ ضرور ہے کہ تمنا استعداد سے زیادہ نہ ہو گی - اور یہی راز ہو گا درجات قرب میں تفاوت کا، کہ جس کی استعداد کا جتنا مقتضا ہو گا اتنا قرب اس کو عطا ہو جائے گا، اور اس وجہ سے اس کو تسلی ہو جائے گی اور دنیا میں بوجہ حجابات کے کچھ پردہ رہتا ہے، جس سے تمنا کے موافق انکشاف نہیں ہوتا ، اس لئے تسلی میں کمی رہتی ہے "-

ایک غلط فہمی: اس سلسلہ میں بعض صوفیہ کی ایک غلط فہمی کا ازالہ فرمایا گیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ آخرت میں بھی رویت یا دید حق کی تڑپ ہی تڑپ ہو گی، نہ حور ہوں گی نہ قصور، بس ارنی ارنی کی بیتابی ہو گی - یعنی کامل تسلی وہاں بھی نہ ہو گی -

"گو عشاق کی ایسی غلطی بھی معاف ہے -

گر خطا گوید و راخاطی مگوئے
ورشود پر خون شہیذ اورا امشوئے

ان پر ملامت نہ کرنا چاہئے - البتہ رد جائز ہے - اور اصل میں یہ ان کی کشفی غلطی ہے ، کہ ان کو اس سے آگے مکشوف نہیں ہوا - ممکن ہے کہ بعض عشاق کی یہ حالت وہاں کسی وقت ہو مگر تجلی سے بہت جلد ان کی تسلی کر دی جائے گی - چونکہ ان لوگوں کو اس تسلی کی اطلاع نہیں اس لئے سمجھ لیا کہ جنت میں جا کر بھی بے تابی ختم نہ ہو گی -

"پھر اسی غلطی کی تائید ایک قیاس سے ہو گئی، کہ جنت کی حالت کہ یہاں کی حالت پر قیاس کر لیا - یہاں کی حالت تو یہ ہے کہ محبوب کا حسن بالفعل غیر متناہی ہے، اور ہمارا عشق بھی بایں معنی غیر متناہی کہ کسی حد پر قرار نہیں - بس وہ حال ہے کہ

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

سو سمجھے یہ کہ محبوب کا حسن تو آخرت میں بھی غیرمتناہی ہو گا' اور ہمارے عشق کو کسی حد پر قرار ہے نہیں تو پھر وہاں بھی چین کیسے آئے گا۔

"میں کہتا ہوں کہ وہاں چین اس طرح آ جائے گا' کہ محبوب کا حسن تو غیر متناہی رہے گا مگر تمہارا عشق متناہی ہو جائے گا' یعنی ایک حد پر ٹھہر جائے گا۔ اور جتنا قرب تمہاری استعداد کا مقتضا ہے' وہ میسر آ جائے گا' اس لئے ہر شخص کو آسودگی ہو جائے گی۔ خوب سمجھ لو کہ جنت میں بے چینی ہرگز نہ ہو گی وہاں سب کو چین آ جائے گا۔ بے چینی یہیں تک ہے۔

"بہرحال دنیا میں ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ اعمال کے ذریعہ ترقی حاصل کریں"۔ (۱)

تصوف بے عملی کا نہیں کمال عمل کا نام ہے: جس دین کی رو سے انسان کی تخلیق کا مقصد اور ترقی کا مدار ہی تمامتر اعمال ہوں' بلکہ جس نے ایمان کی روشنی و رہنمائی میں سارے اعمال صالحہ کو عین عبادت قرار دے دیا ہو۔ پھر ان اعمال صالحہ سے نماز روزہ وغیرہ کے عرفی عبادات ہی مراد نہ ہوں بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے سارے معاملات' اخلاق و معاشرت' حکومت و سیاست' جہاد و قتال' امن و صلح' تہذیب و تمدن غرض پوری عملی زندگی کے جزئی سے جزئی اعمال اس کے دائرہ میں داخل ہوں اور معمولی سے معمولی نشست و برخاست' اکل و شرب تک کے آداب و احکام اس کی رہنمائی سے محروم نہ ہوں اور تصوف نام ہو اسی دین کے درجہ کمال کا تو ایسے تصوف کے معنیٰ ایمان کے ساتھ کمال عمل کے سوا ہو ہی کیا سکتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس کمال عمل تصوف کو اس کے

---

(۱) الورد الفرنجی ص ۷۰ - ۱۲

غیر محقق معتقدین و منکرین دونوں نے مسائل زندگی سے فرار و بیزاری رہبانیت و خانقاہ نشینی باور کرا رکھا ہے۔

استخفاف عمل کی غلطی : معتقدین نے تو عشق و محبت، قرب و معیت، وجودیت و عینیت وغیرہ کی فنی اصطلاحات کے معنی بزعم خود خدا جانے کیا کیا قرار دے لئے کہ معاملات و معاشرت اور اخلاق کے دینی احکام و اعمال کا ذکر ہی کیا صوم و صلوٰۃ وغیرہ عبادات تک کا ان کے قلب میں استخفاف پیدا ہو گیا پھر بعض بزرگوں کے ہاں کسی غلبہ حال یا عذر خاص کی بناء پر اعمال کے اہتمام میں اگر کچھ کمی دیکھی تو اس حال یا عذر کو تو سمجھے نہیں، الٹے حیلہ جو نفس کے فریب میں آ کر اس مغلوبیت و معذوری ہی کو عین کمال سمجھ لیا، جس کی نقالی میں دین و دنیا دونوں سے مارے گئے۔

دوسری طرف اسی طرح کے اپنے پرائے غیر محقق منکرین نے ایسی باتوں سے بدگمان ہو کر خود تصوف کو سراپا بے عملی، رہبانیت و خانقاہ نشینی یا صبر و توکل، ترک و تجرد، زہد و قناعت، تحمل و تواضع وغیرہ کو پست ہمتی کی تعلیمات اور بزدلانہ سلبی اخلاق کا مجموعہ سمجھ کر سرے سے انکار کر دیا۔ یا اسلامی تصوف کو بھی جوگیوں اور اشراقیوں، ہندوؤں اور نو فلاطونیوں کی طرح، بلکہ انہیں سے ماخوذ و مستفاد نرے گیان و دھیان کا کوئی نظام یا سریت (مسٹسزم) کا کوئی فلسفہ قرار دے کر داد تحقیق دی۔

پھر عشق و محبت، قرب و وصال، وجودیت، و مشہودیت، عینیت و غیریت کے سے مسائل و مضامین تصوف کی بڑی بڑی کتابوں اور بڑے بڑے صوفیہ کے کلام میں اس کثرت و شدت سے داخل و پیوست ہیں، کہ ظاہر بین نگاہوں میں، احکام و اعمال کے بجائے تصوف تمامتر نام ان ہی چیزوں کا ہو گیا۔ نیز جن گوناگوں دقیق و فلسفیانہ عنوانات اور نوبنو رنگین و شاعرانہ تعبیرات سے ان مضامین کو بیان کیا جاتا

ہے' وہ اور بھی بظاہر کتاب و سنت یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم کی عملی و اجتماعی حیات کے برعکس ایک خالص نظری شاعری و فلسفہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کو عملی زندگی سے کوئی سروکار نظر نہیں آتا۔

لہٰذا ان مضامین سے متعلق حضرت جامع المجددین علیہ الرحمتہ کی تجدیدات و تحقیقات کو اوپر جو ذرا شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا' وہ ان تہ بتہہ پیدا ہونے والی غلطیوں کے ازالہ' اور اسلامی تصوف سے ان چیزوں کے صحیح تعلق کی فہم کے لئے ازبس ضروری تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عشق و محبت قرب و معیت' وحدۃ الوجود و حدۃ الشہود' سب دراصل ایک ہی معنون' ایک ہی حقیقت یعنی عبدیت کی (جو خالص کتاب و سنت کا نچوڑ ہے) تعبیر و تفہیم کے مختلف عنوانات و اسالیب یا فنی اصطلاحات ہیں۔ اور تقریب فہم کے لئے نئی نئی تعبیرات و عنوانات یا اصلاحات دینی و دنیوی کس علم و فن میں مناسب وقت و موافق حاجت اختیار اور وضع نہیں کرلی جاتی ہیں۔

اصل مدعا عبدیت ہے جو عمل و اطاعت کا کمال ہے: ورنہ بڑا منشا و مدعا ان سب عنوانات و اصطلاحات کا عبدورب کے اسی ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون والے منصوص تعلق عبادت و عبدیت یا بندگی و سرا فگندگی کو واضح کرنا اور عملی زندگی میں اس کو پیوست کرنا ہے۔ تاکہ حق تعالیٰ سے ہمارا وہی تعلق پیدا ہو جائے' جو کسی ہمہ وقت کمربستہ و بے عذر غلام کو اپنے مالک سے ہوتا ہے۔ نیز ذات و صفات' احاطت ومعیت قرب و اقربیت کی معرفت سے کانک تراہ فان لم تکن تراہ فھو یراک " کا وہ احسانی رنگ پیدا ہو جائے' جو کس غلام کو اپنے مالک کی عین حضوری و پیشی میں حاصل ہوتا ہے' کہ اس کے چھوٹے بڑے احکام سے سرمو تجاوز نہیں کرتا اور یہی عمل واطاعت کا کمال ہے۔

کمال عبدیت کمال تسلیم و رضا کو مستلزم ہے: مالک بھی کیسا جو ہر طرح "کمال و جمال و نوال" کا مالک و جامع ہے' جس کے ساتھ نہ صرف خشک

غلامانہ بلکہ عاشقانہ وابستگی بھی لازم ہے - اگر عبدیت و بندگی کا یہ تعلق عشق و محبت کے جذب و شوق سے بالکل خالی اور نرا مملوکانہ و مجبورانہ نوعیت کا ہو، تو بری بھلی طرح احکام کی عملی اطاعت تو ہو گی، لیکن قلبی رضا کا رضاکارانہ علاقہ مفقود ہو گا، اور "ہرچہ از دوست می رسد نیکوست" کا مقام تسلیم و رضا نصیب نہ ہو گا - بلکہ طبیعت کے ناموافق احکام میں الٹے بد دلی و شکایت کا خطرہ رہے گا اسی لئے "حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب رحمتہ اللہ علیہ جب تک حبی و عشقی تعلق کا رنگ کچھ نہ ہو مراقبہ توحید کی اجازت نہیں مرحمت فرمایا کرتے تھے کہ ہر خیر و شر رنج و راحت کو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے دیکھ کر خلاف طبع ناقابل تحمل باتوں میں شکایت و ناشکری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے" - کمال عبدیت و بندگی کے ساتھ کمال تسلیم و رضا کا تو یہ عالم ہونا چاہیئے کہ

ناخوش تو خوش بود برجان من
دل فدائے یار دل رنجان من
نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی
فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

حضرات صحابہؓ کی عملی زندگی میں خدا و رسول کی محبت نے یہی عاشقانہ رنگ تو غالب کر دیا تھا، جس کی بدولت احکام کے سامنے جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے - نہ تیر سے ڈرتے تھے نہ تلوار سے - نہ اہل و عیال کی محبت مزاحم اتباع و اطاعت ہوتی تھی، نہ وطن و دیار کا انس مانع غربت و ہجرت ہوتا تھا -

عشق و محبت وجودیت و شہودیت سب کا بڑا مقصود وہی عبدیت کی عملی زندگی اور اس کے کمال یعنی مقام احسان و رضا کا حصول ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی کا وجود نظر میں رہ جائے، نہ اپنے نفع و ضرر کا پاس - ہر حال و خیال پر احکام کی اطاعت و فرمانبرداری غالب ہو -

سلوک و تربیت

احکام و اعمال کی اطاعت میں لگے رہنا یہی بندگی عبدیت یا سرا فگندگی ہے جو اسلام کے لفظی معنی ہیں اور یہی اسلامی تصوف کی روح ہے اور اسی کی تربیت حضرت مجدد وقت کا سارا سلوک ہے کہ کتاب و سنت کے اتباع اور شریعت کے احکام و اعمال اصول و فروع میں اختیار بھر کوتاہی نہ ہو - تربیتہ السالک کے ہزاروں صفحات اور بے شمار مکتوبات کا محور و مرکز یہی نقطہ ہے -

لیکن خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ اعمال سے مقصود عمل، عمل کا شوروغل ہرگز نہیں جو آج کل مچایا جاتا ہے - اور جس سے مراد حیوانی یا طفلانہ و مجنونانہ اور مشرکانہ عمل و حرکت ہے - جس طرح بچوں کی نظر سن رشد کی مستقل یا نسبتہً "اعلیٰ وابقیٰ" حیات پر نہیں ہوتی، اور اگر والدین و اولیاء کی خیر خواہانہ و دانشمندانہ رہنمائی ان کی دستگیر نہ ہو تو سارا وقت بچپن کے کھیل کود کھانے پینے اور اس کے لئے لڑائی جھگڑے کے عمل و حرکت میں گنوا دیں - یا جس طرح چرند و پرند یا حیوانات کے پیش نظر کوئی جانا بوجھا مستقبل اور بلند تر مقصد زندگی نہیں ہوتا - بس صبح سے شام تک اندھی جبلیت کے تحت کھانے پینے توالد و تناسل کی دوڑ دھوپ یا باصطلاح حاضر کشمکش حیات و تنازع للبقا کے عمل و حرکت میں فنا رہ کر مر جاتے ہیں - یا پھر یہ کہ کسی کو ڈھیلا مار دیا، کسی کو گالی دے دی، یعنی کوئی معقول مطلب و مدعا کسی عمل و حرکت کا بھی نہ ہو گا، جیسا دیوانوں کا حال ہوتا ہے -

مشرکانہ عمل و حرکت : ایک اور اسی قسم کے عمل و حرکت کی ذرا دقیق و مغالطہ آمیز شکل مشرکوں کے اعمال و افعال کی ہے، جنھوں نے کائنات وانسان کے اصل خالق سے اپنے علم و عمل کا رشتہ توڑ لیا ہے - اور مذہب ہی کے نام سے کوئی آتش پرستی کو مذہب بنا کر اس کے افعال واعمال میں گم ہے - کوئی

آفتاب پرستی کی دھن میں لگا ہے' کسی نے کائنات ہی میں سے شجر و حجر حیوان و انسان جاندار و بے جان مخلوقات کو دیبی دیوتا بنا کر اپنی زندگی و بندگی کا محور بنا رکھا ہے - اس سے بھی دقیق تر اور زیادہ پر مغالطہ یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ کے شرک کی وہ جدید ترین و تازہ ترین صورت ہے' جس نے بالکلیہ کفر و انکار اور لا دینی کی راہ سے زور پکڑا ہے' جس کو معبود حقیقی کی بندگی و فرمانبرداری سے بغاوت و سرکشی کی سزا یہ ملی ہے کہ انسان نے اپنے ہی جیسے انسان کو رب بنا کر اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں - کوئی کسی کی اشتراکیت و اشتمالیت کی دعوت کے پیچھے دیوانہ وار بے تحاشا بھاگا چلا جا رہا ہے! کوئی جمہوریت و عمومیت کے نعروں و جیکاروں سے بیہوش ہوا جا رہا ہے کوئی آمریت و فسطائیت کے داعی کی آواز پر جان دے رہا ہے' اس طرح ساری دنیا میں انسان نے خدا سے منہ موڑ کر کسی نہ کسی انسان ہی کو اپنے سعی و عمل کا محور و مرجع بنا لیا ہے - (ا) پھر مشرکانہ مزاج و سرشت کا جیسا خاصہ و لازمہ ہے' کہ جہاں ایک خدا کی خدائی سے قدم باہر نکالا تو پھر چھوٹے بڑے دیبی دیوتاؤں کے آگے بندگیوں اور سرا فگندگیوں کا سلسلہ کسی حد و شمار پر رک نہیں سکتا - یہی رنگ اس جدید لادینی یعنی انسان کو انسان کا رب بنا دینے والے شرک کا ہے کہ چھوٹے بڑے سینکڑوں ہزاروں خداؤں (لیڈروں' اڈیٹروں پلیڈروں کی) دیوانہ وار بندگی سے چارہ نہیں' اور ہر چھوٹا بڑا خدا اپنے ان مخبوط بندوں سے جان و مال عزت و آبرو کی بڑی سے بڑی نذر و قربانی' انتہائی درندگی و بے رحمی کے ساتھ وصول کرنے میں دریغ نہیں کرتا - کیا پرانے مشرکوں کے مشرکانہ مذاہب کے پرانے دیوتاؤں نے بھی اپنے پجاریوں سے

(ا) زیادہ حسرت و غم مسلمانوں کے حال پر ہے' کہ جن کے سپرد ان طوفانوں میں انسانی بیڑے کی ناخدائی تھی انہوں نے خود اپنے بیڑے کو کہیں اتا ترک کے حوالہ کر رکھا ہے' کہیں جناح و جواہر لال کے ١٢

جان و مال کی اتنی مہیب بھینٹ مانگی اور پائی ہو گی' جتنی جنگ عظیم اور اس سے بڑھ کر جنگ اعظم یعنی نئے مشرکوں کے نئے (ماڈرن) دیوتاؤں نے وصول کی - یا جتنی خود ہمارے گھر ہندوستان و پاکستان کے یہ نئے دیوتا 15 اگست کی حریت و آزادی کے بعد مہینوں سے روزانہ جنون و دیوانگی و وحشت و درندگی کی انتہائی آزادیوں اور شرمناکیوں کے ساتھ وصول کر رہے ہیں! -

خدا کا دامن چھوٹ جائے تو پھر شیطان انسان کو پاگل ہی بنا چھوڑتا ہے (یتخبطہ الشیطان من المس) گویا انسان ایک فٹ بال ہے' جو حرکت و عمل میں تو مسلسل ہے' لیکن ہر حرکت نام ہے کسی نہ کسی کھلاڑی (لیڈر) کی پاؤں کی ٹھوکر کا - قرآن مجید نے مشرکانہ عمل و حیات کی اس آوارگی و سرگردانی کی ہلاکتوں کا پانی بلیغ ترین تمثیل میں عجیب نقشہ کھینچا ہے کہ توحید کی بلندی سے گر کر مشرک کا حال یہ ہوتا ہے کہ "جیسے کوئی آسمان سے گرا ہو' جس کی بوٹیاں یا تو راستہ ہی میں مردار خوار پرندوں نے نوچ ڈالی ہوں یا پھر ہوا نے اس کو کسی دور دراز جگہ جا ٹپکا ہو (1) - آج کل مردار خوار گدھوں کی جگہ طرح طرح کے سیاسی و اجتماعی معاشی و معاشرتی داعیوں اور ان کی دعوتوں (آئیڈیا لوجیوں) نے لے رکھی ہے - جن میں سے ہر ایک جسم انسانیت کی بوٹیاں نوچ نوچ کر اپنا اپنا پیٹ بھرنا چاہتی ہے - یا پھر انسان کو حقیقی و ابدی زندگی اور اس کے اسباب حیات و عمل سے اتنا دور جا ٹپکا ہے' کہ اب بازگشت عملاً ناممکن ہو رہی ہے اور ابدی ہلاکت سامنے ہے -

عمل سے مراد عمل صالح ہے : بہرحال زندگی اور عمل کی جو تفسیر اب اخباروں اور رسالوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سنی سنائی اور پڑھی پڑھائی جا رہی ہے' اس کی اس مختصر تشریح کا مدعا فقط یہ ہے کہ اسلام یا اسلامی تصوف کی

---

(۱) من یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق - ۱۲

تعلیمات کی رو سے انسان جس عمل کے لئے پیدا کیا گیا ہے' اس سے عمل عمل کے شور وغل کی یہ ہلاکت آفرین آوارگی یا سو فسطاینہ سرگردانی قطعًا مقصود نہیں۔ اس کے مقابلہ میں تو بدنام خانقاہی بے عملی کی موت ہی عین حیات ہے۔ مراد وہ عمل صالح ہے' جو غیر یقینی علم کی اس آوارگی و سرگردانی سے نکال کر بلا رنگ و نسل' ملک و قوم کی تفریق یا بلاغنی و فقیر بورزوا اور پولتاری کی تقسیم کے ساری انسانیت کو اس کے الٰہ واحد خالق سموات و الارض کے بخشے ہوئے کلمہ توحید اور ایمانی علم و یقین کی یک جہتی یا حنیفیت سے نصیب ہوتا ہے۔ (وجہت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما نا من المشرکین) سموات و ارض کے اس خالق و عالم (یعلم ما فی السموات والارض) کے غیر مشکوک و محیط کل علم و ہدایت کے قبول کا نام ایمان اور اس ایمان کے مطابق عمل و حرکت کا نام اسلام کی تعلیم و شریعت میں عمل صالح ہے۔

عمل صالح کی تکمیل ہی تصوف ہے: لیکن شریعت اسلام جس طرح صرف صوم و صلوٰۃ کے احکام و اعمال کا نام نہیں' اسی طرح اس کا تصوف نرے گیان دھیان یا اذکار و اشغال ریاضات و مراقبات کا نام نہیں۔ وہ نام ہے انفرادی و اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں سے متعلق اعمال و احکام کا۔ اور حضرت جامع المجددین کی تجدید دین کا جس طرح بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ عبادات و ریاضات' معاملات و معاشرات کے سارے شعبوں کو جامع و حاوی ہے' اسی طرح حضرت کی تجدید تصوف کا ماحصل شریعت ہی کے ان تمام ظاہری و باطنی اعمال و احکام کی صاحب شریعت کی ہدایات و ارشادات کے مطابق اصلاح و تکمیل ہے البتہ جس طرح شریعت کے ایک شعبہ فقہ کو خاص تعلق ظاہر و قالب کے اعمال و احکام سے ہے' اسی طرح شریعت ہی کے ایک دوسرے شعبہ تصوف کو باطن یا قلب کے اعمال و احکام یا اخلاق باطنہ سے خاص تعلق ہے۔ لیکن اعمال باطن کی اصلاح و

تکمیل کے لیئے اعمال ظاہر کی اصلاح و تکمیل نہ صرف ضروری بلکہ مقدم (۱) ہے۔

بہشتی زیور کی بنیادی اہمیت: اسی لیئے حضرت علیہ الرحمتہ کے تجدیدی و اصلاحی نظام تعلیم میں بہشتی زیور و بہشتی گوہر کے فقہی مجموعہ کو بنیادی جگہ حاصل ہے، جس میں نہ صرف دیانات و معاملات کے ضروری ضروری فقہی مسائل جمع فرمائے گئے ہیں، بلکہ فقہ کی عام و متداول کتابوں کے خلاف معاشرات کے بھی ضروری ضروری اصول و مسائل کا اضافہ فرمایا گیا، اور اخلاق و تصوف کو بھی شریک فرما دیا گیا ہے تاکہ شریعت و طریقت کی دوئی یا دوری کی غلط فہمی عملاً دور ہو - پھر اسی نہج کی دوسری کتاب تعلیم الدین میں دیانات و معاملات و معاشرات کے احکام و مسائل کے اجمال کے ساتھ تصوف کے مسائل کی نسبتہ زیادہ تفصیل فرمائی گئی ہے۔

تعلیم و تربیت: ــ متعلق حضرت کا سارا تقریری و تحریری سرمایہ تجدید درحقیقت انہیں دو کی تفصیل و تشریح ہے۔ خاص تصوف و سلوک پر قصد السبیل کے نام سے جو رسالہ تحریر فرمایا گیا ہے، اور جو خصوصیت کے ساتھ ان طالبین و سالکین کے لئے ہے، جو درویشی کی "راہ" یا طریقت کا قصد و ارادہ کریں - اس کی تسہیل کے ایک ضمیمہ میں ان باتوں کو بیان فرمایا گیا ہے جن کا سالک کے لئے کرنا یا نہ کرنا ضروری ہے جس کی ابتدائی دفعات ہی یہ ہیں کہ

> (۱) بہشتی زیور کے (معہ بہشتی گوہر جس میں خاص مردوں کے احکام ہیں) گیارہ حصے اول سے آخر تک ایک ایک حرف کر کے پڑھنے یا سننے پڑیں گے (۲) اپنی سب حالتیں بہشتی زیور کے موافق رکھنا پڑیں گی (۳) جو کام کرنا ہو اور اس کا جائز و ناجائز ہونا معلوم نہ ہو، کرنے سے پہلے سچے عالموں سے پوچھنا پڑے گا، اور ان کے بتلانے کے موافق عمل کرنا ہو گا"۔

---

(۱) بلکہ وہ اعمال باطن انہیں اعمال ظاہر کی اصلاح و تکمیل کا دوسرا نام یا اس کے لوازم میں سے ہیں۔ سید سلیمان

جن باتوں کا کرنا یا چھوڑنا ضروری ہے' ان میں بھی اس قسم کے اعمال صراحتہً مذکور ہیں مثلاً لڑکیوں کا حصہ نہ دینا' اہل حکومت و ریاست کا غربا پر ظلم کرنا' جھوٹی نالش کرنا رشوت کی آمدنی کھانا ۔ جھوٹ بولنا' تجارت میں دغا کرنا' بدون سخت مجبوری کے ناجائز نوکری کرنا یا جائز نوکری میں کام خراب کرنا وغیرہ ۔

اس کے علاوہ مکتوبات وغیرہ میں اس کی بکثرت تاکید ملتی ہے ۔ کسی صاحب نے صوفیانہ محاورہ میں عرض کیا کہ "کیا آپ براہ کرم میرے لئے کچھ عنایت نہیں فرما سکتے؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ ۔

"اس طریق میں دو چیزیں ہیں اعمال اور احوال ۔ اعمال مقصود اور اختیاری ہیں احوال غیر مقصود اور غیر اختیاری ہیں ۔ اگر احوال پیدا نہ ہوں تو مقصود میں خلل نہیں' اور کبھی پیدا ہوں تو اعمال ہی سے پیدا ہوتے ہیں ۔ پس ہر حیثیت سے اعمال میں مشغول ہونا ضروری ہے" ۔

کیسی الٹی بات ہے کہ عام طور سے لوگ تصوف کا مقصود احوال ہی کو سمجھتے اور انہیں کے خواہاں رہتے ہیں ۔ "اکثر طالبین کی یہی غلطی ہے کہ احوال کے طالب رہتے ہیں ۔ اور اعمال کا اہتمام نہیں کرتے' لیکن حضرت مجدد کا تجدید فرمودہ خالص اسلامی تصوف خالص عمل ہی عمل ہے یعنی دن رات شریعت کے موافق کام یا اعمال میں لگے رہنا ۔ اس لئے احوال کو تصوف سمجھنے کی غلطی کے ازالہ کے ساتھ ارشاد ہے کہ

"اس کے بعد نمبر عمل کا ہے اور عمل دو قسم کے ہیں' ظاہر اور باطن ۔ اول فقہ میں مذکور ہیں اور بہشتی زیور و بہشتی گوہر اس کے لئے کافی ہیں ۔ ثانی کتب سلوک میں مذکور ہیں اور رسالہ تبلیغ دین اور میرے مواعظ اس کے لئے کافی ہیں (1) ۔

---

(۱) النور بابت صفر ۱۳۴۴ھ ص ۱۲ ۔ ۱۳

حقوق عباد کی اہمیت : انسانی اعمال کی اگر تحلیل کی جائے' خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی سیاسی ہوں یا معاشی' تمدنی ہوں یا تہذیبی سب کا تعلق بالاخر کسی نہ کسی طرح انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض یا حقوق عباد سے ضرور ہو گا۔ اور دنیا کے سارے فتنے اور فساد بندگان خدا کے ان حقوق ہی کی ناشناسی' ان کی عدم ادائی یا ان میں کوتاہی سے پیدا ہوتے ہیں ' ان کی نسبت قصد السبیل کے دوسرے ہی صفحہ پر دوسری ہدایت ملاحظہ ہو کہ

" درویشی میں قدم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سب گناہوں سے توبہ کرے .... اور اگر اس کے ذمہ لوگوں کے کچھ حقوق ہوں تو ان کو ادا کرنے کی فکر میں لگ جائے - یا حق والوں سے معاف کرائے - کیونکہ بدون اس کے کہ حق والوں کے حق سے ہلکا ہو اگر عمر بھر میں محنت و مشقت کرے گا ہرگز ہرگز اللہ تک نہ پہنچے گا "۔

نسبت باطنی کی علامت : تصوف میں جس کو نسبت باطنی کہا جاتا ہے' اسی قصد السبیل صفحہ ۲۸ پر اس کی علامت بھی یہ پڑھئے کہ

"علامت نسبت باطن کے حاصل ہونے کی دو ہیں ایک یہ کہ اللہ کی یاد دل میں ایسی جم جائے کہ کسی دم دل سے دور نہ ہو - دوسرے یہ کہ اللہ کے حکموں پر چلنے کی طرف' چاہے وہ احکام ایسے ہوں' جن میں اللہ نے اپنی عبادت کے طریقے بتلائے ہیں'۔اور چاہے وہ احکام ہوں جن میں بندوں کو آپس میں معاملہ کرنے کے طریقہ بتلائے ہیں اور چاہے وہ احکام ہوں جن میں بات چیت کا طریقہ بتلایا ہے اور چاہے وہ احکام ہوں جن میں نشست و برخاست اور تمام کاموں کا طریقہ بتلایا ہے' ان سب حکموں کی طرف ایسی رغبت ہو جائے اور جس سے منع فرمایا ہے ان باتوں سے ایسی نفرت ہو جائے' جیسی کہ ان چیزوں کی طرف رغبت ہوتی ہے' جو اپنے جی کو اچھی معلوم ہوتی ہیں' اور جیسی ان چیزوں

سے نفرت ہوتی ہے، جو اپنے جی کو بری معلوم ہوتی ہیں (1) - اور اس کی سب عادتیں مطابق قرآن شریف کے ہو جاویں " -

اعمال کے بغیر خدارسی ناممکن ہے: یہ ہے اسلام کے تجدیدی و صحیح تصوف کا لب و لباب کہ وہ نام ہے "قرآن شریف کے موافق سارے اعمال میں کمال کا - البتہ ان اعمال میں جس طرح فقہ کا خاص موضوع اعمال ظاہرہ ہیں - تصوف کا خاص موضوع اعمال باطنہ ہیں (مگر وہی اعمال ظاہرہ کے تقدم و لزوم کی شرط کے ساتھ) یعنی بغیر ظاہر و جوارح کے اعمال کے محض باطن و قلب کے اعمال و احوال میں کوئی شخص " عمر بھی محنت و مشقت کرے گا ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ تک نہ پہنچے گا " - نہ اسلامی تصوف کے معنی میں صوفی ہو گا اس لئے کہ اسلامی تصوف کی رو سے

"اصل مقصود حق تعالیٰ کا راضی کرنا ہے - جس کا ذریعہ ہے شریعت کے حکموں پر پورے طور سے چلنا - ان حکموں میں بعضے متعلق ظاہر کے ہیں، جیسے نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ (عبادات) اور جیسے نکاح و طلاق، ادائے حقوق زوجین وغیرہ (دیانات) جیسے لین دین، و پیروی مقدمات و شہادت و وصیت و تقسیم ترکہ وغیرہ (معاملات) اور جیسے سلام و کلام و طعام و قیام و قعود مہمانی و میزبانی وغیرہ (معاشرات) ان مسائل کو علم فقہ کہتے ہیں - اور بعضے متعلق باطن کے ہیں، جیسے خدا سے محبت رکھنا، خدا سے ڈرنا، خدا کو یاد رکھنا- دنیا سے محبت کم کرنا، خدا کی مشیت پر راضی رہنا، حرص نہ کرنا، عبادت میں دل کا حاضر رکھنا، دین کے کاموں کو اخلاص سے کرنا کسی کو حقیر نہ سمجھنا، خود پسندی نہ ہونا، غصہ کو ضبط کرنا وغیرہ

---

(۱) جیسا کہ قرآن پاک کی حسب ذیل آیت ہے کہ حبب الیکم الایمان و زینہ فی قلوبکم و کرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان - یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں ایمان کو محبوب و مزین بنا دیا اور کفر اور اللہ کی نافرمانی اور گناہ کی نفرت پیدا کر دی- سید سلیمان -

ان اخلاق کو سلوک کہتے ہیں -

احکام باطن پر بھی عمل فرض ہے : "اور مثل احکام ظاہری کے ان احکام باطن پر عمل کرنا فرض و واجب ہے نیز ان باطنی خرابیوں سے اکثر ظاہری اعمال میں خرابی آ جاتی ہے - جیسے محبت حق کی کمی سے نماز میں سستی ہو گئی یا جلدی جلدی بلا تعدیل ارکان پڑھ لی - یا بخل سے زکوٰۃ و حج کی ہمت نہ ہوئی - یا کبر و غلبہ غضب سے کسی پر ظلم ہو گیا' حقوق تلف ہو گئے - و مثل ذلک -

"اور اگر ان ظاہری اعمال میں احتیاط کی بھی جاوے' تب بھی جب تک نفس کی اصلاح نہیں ہوتی وہ احتیاط چند روز سے زیادہ نہیں چلتی" -

لہٰذا نفس و باطن کی اصلاح نہ صرف اعمال باطنہ کے لئے ضرور ہے' بلکہ اعمال ظاہرہ کو کمال و دوام کے ساتھ ادا کرنے کے لئے بھی لازم ہے -

پیر کی ضرورت : " لیکن باطنی خرابیاں ذرا سمجھ میں کم آتی ہیں' اور جو سمجھ میں آتی ہیں ان کی درستی کا طریقہ کم معلوم ہوتا ہے' اور جو معلوم ہوتا ہے نفس کی کشاکش سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے ان ضرورتوں سے پیر کامل کو تجویز کیا جاتا ہے' کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے اور ان کا علاج و تدبیر بھی بتلاتا ہے 'اور نفس کے اندر درستی کی استعداد اور ان معالجات میں سہولت اور تدبیرات میں قوت پیدا ہونے کے لئے کچھ اشغال و اذکار کی بھی تعلیم کرتا ہے اور ذکر بذات خود بھی عبادت ہے -

سالک کے دو کام : پس سالک کو دو کام کرنے پڑتے ہیں ایک ضروری یعنی ظاہری و باطنی احکام شرعیہ کی پابندی اور دوسرا مستحب یعنی کثرت ذکر - پابندی احکام سے خدا تعالیٰ کی رضا اور کثرت ذکر سے زیادت رضا و قرب حاصل ہوتا ہے - یہ ہے خلاصہ سلوک کے طریق و مقصود کا" -

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی تصوف و درویشی کا خلاصہ اللہ تعالیٰ کی رضا

جوئی ہے' جس کا انحصار ظاہری و باطنی اعمال کی پوری پوری پابندی ہے - اور ان اعمال کے دو درجے ہیں ایک فرائض و واجبات کا جن کی پابندی ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے' لہٰذا اس درجہ کے تصوف یا درویشی کا حصول بھی لازمًا ہر مسلمان پر فرض ہے جس کا نام ولایت عامہ ہے - دوسرا درجہ وہی کثرت ذکر یا زیادت رضا و قرب کا ہے -

"جس میں ظاہر کو نفل عبادتوں میں اور باطن یعنی دل کو اللہ کی یاد میں ہمیشہ مشغول رکھے کسی دم غافل نہ ہو - یہ درجہ مستحب ہے! اور لوگ اسی کو فقیری کہتے ہیں -

لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ

ناجائز درویشی : "اگر اس دوسرے درجہ میں مشغول ہونے کے سبب پہلے درجہ کی باتوں میں سے کوئی ضروری بات چھوٹ جائے یا ان میں کسی قسم کا نقصان پڑ جائے' تو پھر اس دوسرے درجہ میں مشغول ہونا منع اور ناجائز ہے - جیسے بعض جاہل کرتے ہیں کہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر درویشی کا دم بھرتے ہیں -

اسی طرح بہت سے جاہل اذکار و اشغال و مراقبات و ریاضات یا احوال کو درویشی و ولایت کا اصل مقصود جانتے ہیں - یہ نرا جہل ہے - مقصود صرف ظاہر و باطن کے اعمال ہیں - باقی متعارف اذکار و اشغال یا ریاضات و مراقبات محض اصلاح اعمال کی تدابیر ہیں - اور احوال محض ثمرات غیر لازمہ ہیں یعنی ایسے ثمرات' جن کا مرتب ہونا ضروری نہیں' نہ ان کا حصول ضروری و مقصود ہے"

رسمی بیعت ضروری نہیں : پیری و مریدی یا بیعت کو بھی بہتوں نے جو درویشی کے لئے لازم یا خالی بیعت ہی کو کافی سمجھ رکھا ہے یہ سراسر جہل ہے - پیری و مریدی کی اصل غرض ظاہری و باطنی اعمال کی اصلاح خصوصًا نفسانی امراض کا علاج ہے - اگر پیر و مرید دونوں کی جانب سے اصلاح و علاج کا اہتمام پوری طرح ہو' تو نفس رسمی بیعت قطعًا ضروری نہیں - البتہ جیسے آدمی جسمانی بیماریوں

میں تابہ امکان بہتر سے بہتر حاذق و شفیق معالج و طبیب کو تلاش کر کے اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسی طرح باطنی و نفسانی بیماریوں کے معالج یا شیخ میں بھی اس کا اہتمام لازم ہے۔ اسی لئے شیخ کامل کی پہچان معلوم کر لینا البتہ ضروری ہے۔

شیخ کامل کی پہچان : " (۱) بقدر ضرورت دین کا علم رکھتا ہو (۲) عقائد و اعمال و اخلاق میں شرع کا پابند ہو (۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو کمال کا دعوے نہ کرتا ہو کہ یہ بھی دنیا کا ایک شعبہ ہے (۴) کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔ (۵) اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں (۶) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم و دیندار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں (۷) اس سے جو لوگ بیعت ہیں ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو (۸) وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو۔ اور ان کی بری بات سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے (۹) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو (۱۰) خود بھی ذاکر و شاغل ہو کہ بدون عمل یا عزم عمل تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ نہ دیکھے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی سے نہیں۔ اصل میں یہ نفسانی تصرف ہے، جو مشق سے بڑھ جاتا ہے۔ غیر متقی بلکہ غیر مسلم بھی کر سکتا ہے، اور اس سے چنداں نفع بھی نہیں، کیونکہ اس کا اثر باقی نہیں رہتا۔ صرف غبی مرید کے لئے جو ذکر سے بالکل متاثر نہ ہوتا ہو چند روز تک شیخ کے اس عمل سے اس میں قبول آثار ذکر کا ایک گونہ تاثر و انفعال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ خواہ مخواہ لوٹ پوٹ ہی ہو جائے" (۱)۔

---

(۱) تبویب تربیتہ السالک ص ۱۰۔ ۱۲

شریعت و طریقت اور معرفت و حقیقت: کی تفسیر بھی اس سلسلہ میں کچھ مختصراً سن لینی چاہئے ۔ کسی سائل کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

"شریعت نام ہے' احکام تکلیفیہ کے مجموعہ کا' جس میں اعمال ظاہری و باطنی سب آگئے اور متقدمین کی اصطلاح میں لفظ فقہ کو اس کا مرادف سمجھتے تھے ۔ جیسے امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے معرفۃ النفس مالہا وما علیہا پھر متاخرین کی اصطلاح میں ظاہری اعمال سے متعلق شریعت کا جو جزء تھا اس کا نام فقہ ہو گیا ۔ اور باطنی اعمال سے متعلق دوسرے جزء کا نام تصوف ہو گیا (۱) ۔

ان اعمال باطنی کے طریقوں کو طریقت کہتے ہیں ۔ پھر ان اعمال باطنی کی درستی سے قلب میں جو جلا و صفا پیدا ہوتا ہے' اس سے قلب پر بعض حقائق کونیہ متعلقہ اعیان و اعراض بالخصوص اعمال حسنہ و سیئہ و حقائق الٰہیہ صفانیہ و ذاتیہ بالخصوص معاملات فیما بین اللہ وبین العبد منکشف ہوتے ہیں ۔ ان مکشوفات کو حقیقت کہتے ہیں' اور انکشاف کو معرفت اور صاحب انکشاف کو محقق و عارف کہتے ہیں ۔

"پس یہ سب امور متعلق شریعت ہی کے ہیں ۔ اور عوام میں جو یہ شائع ہوگیا ہے کہ شریعت صرف احکام ظاہرہ کے جزء کو کہنے لگے ہیں' یہ اصطلاح کسی اہل علم سے منقول نہیں ۔ اور عوام میں اس کا منشا بھی صحیح نہیں کہ وہ اعتقاد ہے ظاہر و باطن کی تنافی کا واللہ اعلم ۔ (۱)

---

(۱) لیکن یہ دونوں باہم متضاد نہیں' بلکہ ثانی اول ہی کی اصلاح و تکمیل کا نام ہے' خاکسار کا ایک شعر ہے جس میں حضرت کے اس تجدید کی تمثیل ہے ۔

اب تو مینوشی ہے عین شرع برفتوائے شیخ
اب وہی ہوگا فقیہ شہر جو مینوش ہے

(۱) تبویب تربیتہ السالک ص ۱۱ ۔ ۱۲

ولایت عامہ و خاصہ : غرض شریعت یا اس کے دونوں قسم کے ظاہری و باطنی اعمال کے ہی جمع و اہتمام کا نام تصوف ہے - فرائض و واجبات کی حد تک ان دونوں کے جمع و اہتمام کو اصطلاح میں ولایت عامہ کہتے ہیں - جس کا حصول ہر مومن پر فرض ہے - دوسرا درجہ فرائض و واجبات کے تقدم و لزوم کے ساتھ نوافل و مستجاب خصوصاً ذکر کثیر کے اہتمام کا ہے - یعنی " اذکر اللہ ذکر اکثیرا " اور یذکرون اللہ قیاما و قعودا وعلی جنوبھم " وغیرہ آیات و احادیث کے مطابق زندگی کے تمام حرکات و سکنات' نشست و برخاست میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور دھیان یا ذکر و استحضار سے خالی و غافل نہ ہو - سارے اعمال میں احسان عبادت کی کیفیت پیدا ہو جائے - جو کچھ بھی ہم کریں اس طرح کریں گویا اللہ تعالیٰ کو ہم سامنے دیکھ رہے ہیں - کیونکہ اگر ہم نہ بھی دیکھیں تو وہ تو بہرحال ہم کو دیکھ رہے ہیں - یہ درجہ ولایت خاصہ کا ہے - اور خصوصیت کے ساتھ ولایت و بزرگی سے یہی درجہ مراد لیا جاتا ہے - قرب و حضور وغیرہ بھی اسی کی تعبیرات ہیں -

سالک و مرید نام ہے کمال دین کی اس راہ کے رہ رو وطالب کا اور پیر و شیخ اس راہ کا رہبر ہے - سلوک کی حقیقت ان دونوں درجوں کے ظاہری و باطنی اعمال میں سرگرمی اور ان کی اصلاح و درستی ہے - " تصوف کی حقیت ہے تعمیرا لظاہر و الباطن ظاہر کا درست کرنا یہ ہے کہ اقوال و افعال سب شریعت کے موافق ہوں اور باطن کی درستی یہ کہ قلب کی حالت درست ہو" (الرفیق ص ۱۲۰) مرید اس سرگرمی و عمل اور اصلاح کا ارادہ و عہد کرتا ہے اور پیر اپنے تجربہ و بصیرت سے علماً و عملاً اس کی اعانت و رہنمائی کا وعدہ کرتا' اور ظاہر و باطن کی تمام عملی بیماریوں کی دیکھ بھال رکھتا اور حاذق و شفیق طبیب کی طرح ان کا علاج کرتا ہے -

مریض روح کے مرض کا تعدیہ : جس طرح جسم کا مریض ذاتی و جماعتی وظائف حیات کماحقہ بجا نہیں لا سکتا' بلکہ اکثر ان کی بجا آوری میں زیادت مرض کا اندیشہ ہوتا' اور مرض کی نوعیت متعدی ہو تو عملی زندگی میں شریک ہو کر

اپنے ہی لئے نہیں ساری جماعت کے لئے خطرہ بن جاتا ہے - اسی طرح قلب و نفس یا روح کے مریض سے دینی اعمال و فرائض کے حقوق صحیح طور پر نہیں ادا ہو سکتے' بلکہ نفس کے امراض اکثر جسم کے امراض سے بھی زیادہ متعدی ہوتے ہیں - جن کے تعدیہ و فساد سے انفرادی و اجتماعی سارا نظام ہی مختل ہو جاتا ہے -اور جس طرح بجائے خود کوئی صالح سے صالح غذا بھی امراض میں الٹے مرض کو بڑھاتی ہے' اور معکوس اثر پیدا کرتی ہے - اسی طرح باطنی امراض کی موجودگی میں ظاہری اعمال صالحہ بھی بہت سی صورتوں میں محض بس ظاہری یا ریائی ہوتے ہیں اور بے جان یا نام نہاد دین داروں سے الٹے بے دینی بلکہ دین فروشی کے مفاسد و امراض دق کے مریض کی طرح خود مریض کے رہے سہے دین کو بھی گھلا گھلا ختم کر دیتے ہیں اور وبا کی طرح جماعت میں پھیل جاتے ہیں -

جسمانی چھوٹی بڑی بیماریوں کے لئے' تو آدمی طبیبوں اور ڈاکٹروں کے پاس بھاگا بھاگا پھرتا ہے - گلی گلی ان کے لئے شفا خانے اور دواخانے کھولے جاتے ہیں - مرض ذرا سنگین ہو تو مریض کو گھر بار سے دور "اسپتال" میں رکھا جاتا ہے تاکہ باقاعدہ و بروقت دوا و غذا پرہیز و احتیاط کی پوری پابندی و نگرانی ہو سکے - متعدی امراض کے مریضوں کو خصوصًا جداگانہ سب سے الگ تھلگ دور دراز آبادی سے باہر اسپتالوں میں رکھا جاتا ہے جو ان کے اور دوسرے دونوں کے لئے مفید و ضروری خیال کیا جاتا ہے -

روحانی و باطنی علاج سے توحش : لیکن کتنی ستم ظریفی ہے کہ نفسانی و روحانی یا باطنی و قلبی بیماریوں کے علاج کا نام لیا جائے تو لوگ بھوچکے ہو کر منہ تکنے لگتے ہیں ! گویا نہ سرے سے یہ بیماریاں ہیں نہ ان کا علاج ضروری ہے - نہ قرآن کی اس آیت فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا میں قلوب کی بیماریوں کا ذکر ہے' نہ الا من اتی الله بقلب سلیم میں قلب کی سلامتی و صحت مامور و طلب ہے' نہ حدیث کی کتابوں میں یہ حدیث ہے کہ "جسم میں ایک مضغہ ہے اگر وہ صحیح و

درست ہوا تو سارا جسم درست ہے وہ خراب ہوا تو سارا جسم خراب ہوا آگاہ رہو کہ وہ قلب ہے"۔

خانقاہ امراض روحانی کا شفاخانہ ہے: پھر اگر کہیں امراض قلب کے کسی خاص اسپتال و شفاخانہ یعنی خانقاہ کا نام لے دیا گیا تو دیکھا کہ بہت سے اچھے اچھے ذی علم و مخلص دینداروں کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ اصلاح قلب و باطن سے اس عام و عالمگیر اجنبیت و غفلت کی بدولت یہ نہیں کہ دینداروں کا دین بھی ظاہری علم و عمل کے باوجود بے جان و نیم جان رہتا ہے' بلکہ جہل بالائے جہل یہ ہے کہ خود اپنی بیماری و علاج سے بے فکر ہو کر دوسروں بلکہ ساری دنیا کے معالج و مصلح بن جاتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ایسی ہر اصلاح اصلاح سے بڑھ کر طرح طرح کے مفاسد اور گوناگوں بے اعتدالیوں کا منبع ہو جاتی ہے۔ اور اکثر صورتوں میں سراپا فتنہ و فساد!

حضرت جامع المجددین کی تجدید تصوف میں سب سے زیادہ اہمیت اعمال خصوصاً اعمال قلب کو حاصل ہے' اور سارا سلوک حضرت کا ظاہر و باطن کے اعمال کی پوری جامعیت کے ساتھ تربیت و تہذیب ہے۔ اگر جدید اصطلاح میں کہا جائے' تو اصلاح نفس کے اس فن کو حضرت نے نفسیاتی طور پر اتنا سائنٹیفک یا مرتب و منضبط فرما دیا ہے' کہ کسی سالک کے لئے راہ میں کوئی پیچ و خم باقی نہیں رہ گیا۔ ہر راہ رو بے خطر شاہ راہ پر پڑ کر منزل مقصود کو پا سکتا ہے۔

کلیدی و بنیادی اصول: اس فن کے کل تین ہیں (۱) مقصود و غیر مقصود کی تمیز (۲) اختیاری و غیر اختیاری کی تمیز اور (۳) طبعی و عقلی (یا اعتقلوی) کی تمیز منزل مقصود صرف رضائے حق ہے اور اس کے وصول و حصول کا راستہ ظاہر و باطن یا قلب و قالب کے اختیاری اور عقلی یعنی شریعت کے تکلیفی اعمال کا اتباع ہے۔ بالعموم لوگوں نے اختیاری اعمال کے بجائے غیر اختیاری احوال کو مقصود بنا

اور بتا کر اور ان کے حصول کے لئے غیر معمولی مجاہدات و ریاضات کی مشقت میں پڑ اور ڈال کر سیدھے سادھے راستہ کو پر پیچ کر دیا ہے - ایسے ہی کسی غیر اختیاری کی فکر سے پریشان حال اوراز خود گرفتار مشقت طالب کو تحریر فرمایا کہ

"خود مشقت میں پڑنے کا شوق ہو تو اس کا علاج ہی نہیں - باقی راستہ بالکل صاف ہے کہ غیر اختیاری کی فکر میں نہ پڑیں اختیاری میں ہمت سے کام لیں اگر کوتاہی ہو جائے ماضی کا استغفار سے تدارک کر کے مستقبل کی تجدید ہمت سے کام لینے لگیں اور استعمال ہمت کے ساتھ دعا کا بھی التزام رکھیں اور بہت لجاجت کے ساتھ" -

ماضی و مستقبل کی حسرت و فکر: اور کدو کاوش میں بھی اعتدال لازم ہے - مثلاً

"اعمال صالحہ کے فوت ہونے کا عوام جس قدر چاہئیں قلق کریں ان کو مفید ہے - لیکن سالکین زیادہ اس کا بھی قلق نہ کریں - بلکہ تھوڑی دیر رنج کر لیں پھر جی بھر کے توبہ کر لیں - اور ماضی کی فکر میں نہ پڑیں کہ ہائے یہ کام کیوں فوت ہوا - ہر وقت یہ شغل سالک کو مضر ہے - کیونکہ یہ فکر تعلق مع اللہ کی ترقی میں حجاب ہے - راز یہ ہے کہ تعلق مع اللہ بڑھتا ہے نشاط قلب سے اور قلق نشاط کو کم کر دیتا ہے (۱)-

اسی لئے تفصیلی علاج و ریاضت کو اہل تحقیق نے خصوصاً اس زمانہ کے قوائے و حالات کے لحاظ سے پسند نہیں فرمایا کیونکہ اس میں قلب و اخلاق کے ایک ایک مرض کے الگ الگ بالتفصیل معالجہ و ازالہ کی ادھیڑبن میں پڑ جاتا ہے، جس کی بدولت

---

(۱) اشرف السوانح حصہ دوم ص ۲۰۰ - ۱۲

(۲) اشرف المسائل ص ۲۴ - ۱۲

(۳) منہم اشرفہم مرشدی حکیم الامتہ علیہ الرحمتہ ۱۲

" ہر وقت تین سوہان روح تیار رہتے ہیں ' ماضی کی حسرت' حال کے شبہات اور مستقبل کا خوف - جب محققین مجددین فی الطریق نے (ومنهم مرشدی الحاج امداد الله رحمته الله علیه) دیکھا بلکہ حق تعالٰی نے ان کو دکھلایا کہ اس طریق میں بوجہ تعب شدید اور ثمرہ تربیت کے حصول میں زمان مدید بعض اوقات اس مشہور مصرعہ کا مصداق ہو جاتا ہے - ع

تا تو یمن میرسی من بخدامی رسم

"پھر اہل زمانہ کے قویٰ ضعیف' ہمتیں قاصر ان سب امور پر نظر کر کے بالہام حق ایک دوسرا طریق تربیت کا اختیار فرمایا وہ یہ کہ سب ماضی مستقبل حجاب عن الحق ہے - حق تعالٰی نے ہم کو اپنے مشاہدہ کے لئے پیدا کیا ہے' نہ کہ ماضی و مستقبل کے مطالعہ کے لئے - مولانا رومی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ "ماضی و مستقبلت پردہ خداست (1) - .

اور اہل زمانہ کی قوتوں کے ضعف اور ہمتوں کے قصور ہی کی بناء پر -

"ہمارے حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب طالبین سے اتنے حالات معلوم کرتے تھے کہ فرصت کتنی ہے' آمدنی کتنی ہے' صحت کیسی ہے تعلقات کیا کیا ہیں - قوت کتنی ہے - کیونکہ قوت سے زیادہ کام نہیں بتانا چاہئے -

خستگاں راچو طلب بود قوت نبود
گر تو بیداد کنی شرط مروت نبود

تفاوت تربیت کے اعتبار سے چار طبقات : اور ہمارے حضرت حکیم الامت نے تو اپنے نہایت حکیمانہ سائنٹیفک طرز میں لوگوں کے حالات و مصروفیات ضعف و قوت اور قصور ہمت کو ملاحظہ فرما کر تعلیم و تربیت میں حسب حال تفاوت

---

(۱) اشرف المسائل ص ۴۷ - ۱۲

(۲) ایضا ص ۴۴ - ۱۲

کو ملحوظ رکھنے کے لئے طالبین و سالکین کو چار طبقات میں تقسیم فرما دیا ہے "(۱) ایک وہ عامی جو کمانے اور بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے سے بے فکر ہے (۲) دوسرا وہ عامی جو کمانے اور بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے (۳) تیسرا وہ عالم جو دنیا کے کاموں سے خالی ہے (۴) چوتھا وہ عالم جو روزگار کے کام میں لگا ہوا ہے" ان میں سے ہر ایک کا دستور العمل الگ الگ تجویز فرمایا گیا ہے جس کی تفصیل قصد السبیل میں ملاحظہ ہو - خلاصہ یہ ہے کہ

" قرب کو مقصود سمجھے اور جو طریق اس کے لئے موضوع ہے، یعنی بعد تصحیح عقائد کے اعمال اختیاریہ، جس وقت میں جو عمل ہو خواہ ظاہری صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ خواہ باطنی جیسے خوف و رجا شکر و صبر وغیرہ - اور ذکر و فکر کہ وہ بھی عمل کرنے کی فرد ہے، اکثر اوقات بس اس میں مشغول رہے اور جو اسباب بعد کے ہیں یعنی معصیت ظاہری یا باطنی اس سے مجتنب رہے -

"نہ اس کی ضرورت کہ اسباب قرب میں ملکہ پیدا کرنے کی فکر کرے، نہ اس کی حاجت کہ اسباب بعد کے مادہ کو منقطع کرے - بس امور اختیار میں یہ جس میں کوتاہی ہو جائے اس کو مضر و مہتم بالشان سمجھے اور اس کی اصلاح کرے - باقی امور غیر اختیاریہ کے وجود و عدم پر التفات ہی نہ کرے - اصلاح میں بھی زیادہ کدوکاوش نہ کرے - مثلاً اگر کسی ضروری عمل میں خلل واقع ہو گیا اس کی قضا کر لے - اگر کوئی امر منکر صادر ہو گیا، اس سے استغفار کر لے - اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاوے - اس کے پیچھے نہ پڑ جاوے کہ ہائے یہ کام مجھ سے کیوں فوت ہوا یا یہ کام مجھ سے کیوں صادر ہوا -

"یہ غلو و مبالغہ ہے، جس سے کتاب و سنت نے منع فرمایا ہے (۱) لا تغلوا فی دینکم (۲) من شاق شاق اللہ علیہ (۳) سددوا وقاربوا و استقیموا فلن تحصوا (۴) من غلبہ النوم فلیر قد لا تفریط فی النوم فانما التفریط فی

الیقظہ - حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں - ع

سخت گیرد جہاں بہ مرد مان سخت کوش" (۱)

سلوک مسنون: غرض وہی کہ اصل مقصود یعنی رضائے حق کا طالب رہے اور ناراضی سے ہارب -

"جس امر کو رضا میں دخل ہو' جس کا انحصار واجب و مستحب ماموزات میں ہے' ان پر عمل رکھے - اگر فوت ہو جاوے قضا کر لے - اس سے بڑھ کر دین کی کیا آسانی ہوگی - قال اللہ تعالی ماجعل علیکم فی الدین من حرج (دین میں کوئی تنگی و دشواری اللہ نے نہیں رکھی ہے) اسی طرح جس امر میں حق تعالی کی ناراضی کو دخل ہو' جس کا انحصار منہیات میں ہے' ان سے اجتناب رکھے' اگر صدور ہو جاوے استغفار کر لے -

"نہ اپنے کو خواص میں سمجھے کہ عام آدمیوں کے احوال سے گھبراوے - نہ ثمرات کا عاجلہ میں اور نہ مراتب علیا کا آجلہ میں طالب رہے بس اس کی دعا کرتا رہے کہ اللہ تعالی دنیا میں اعمال کی توفیق اور آخرت میں جنت عطا فرما دیں۔

---

(۱) اشرف المسائل ص ۴۸' ۴۷ - ۱۲

اور دوزخ سے نجات بخشیں - بس ہو گیا سلوک مسنون" (۱)-

اختیاری و غیر اختیاری کاگر: واقعی اگر آدمی ایک اس اختیاری و غیر اختیاری کے گر کو ہی گرہ باندھ لے تو دین ہی نہیں کمال دین یا اسلامی تصوف و سلوک بھی کتنا صاف و آسان ہو جاتا اور راستہ کیسی سرعت اور بے فکری کے ساتھ طے ہوسکتا ہے - حد اس بے فکری کی یہ ہے' کہ قرب و رضا جو عین مطلوب و مقصود ہے' اس کے حصول کی فکر بھی مقصود نہیں - کیونکہ وہ اختیار میں نہیں - اختیار میں سعی و طلب باعمل ہے' اس لئے بس فکر کی چیز طلب و عمل ہے نہ کہ ثمرات و نتائج یا وصول وحصول (۲)

روح سلوک: اہل طریق کے ہاں مقرر و مسلم ہے کہ طلب مقصود ہے وصول مقصود نہیں - شرح یہ ہے کہ مقصود کے حصول کا قلب میں تقاضا نہ رکھے کہ یہ بھی حجاب ہے - کیونکہ اس تقاضے سے تشویش ہوتی ہے اور تشویش برہم زن جمعیت و تفویض ہے - اور جمعیت و تفویض ہی شرط وصول ہے - اس کو خوب راسخ کر لیا جائے کہ روح سلوک ہے -

---

(۱) اشرف المسائل ص ۴۹ - ۱۲

(۲) حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا شعر ہے -

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہے

پر تجھ کو چاہیے کہ لگا دو گی ہے

اور اس طلب و تگ و دو کا ہر قدم منزل مقصود ہے' اسی کو خاکسار نے اس شعر میں ادا کرنا چاہا

منزل مقصود ہے راہ طلب کا ہر قدم

وہ سر منزل ہے جو اب تک رہ منزل میں ہے -

سید سلیمان

"پورا کامل بجز انبیاء کے اور کوئی نہیں اور وہ بھی اپنے کو کامل نہیں سمجھتے سب کو اپنے نقص نظر آتے ہیں، خواہ حقیقی ہوں یا اضافی .... لہٰذا کمال کی توقع ہی چھوڑنا واجب ہے ہاں سعی کمال کی توقع بلکہ عزم واجب ہے .... اُس کی مثال وہ مریض ہے، جس کی تندرستی سے تو مایوسی ہو، لیکن فکر صحت اور تدبیر کا ترک جائز نہیں سمجھا جاتا - اور نجات بلکہ قرب بھی کمال پر موقوف نہیں، فکر تکمیل پر موعود ہے"۔

حاصل آید یا نہ آید. آرزوے می کنم

یابم اورا یا نیابم جستجوے می کنم

یہی نہیں بلکہ سعی و طلب کا حق ادا کرنے کے بعد بھی اگر کامیابی نہ ہو، تو حضرت مجدد تھانوی علیہ الرحمتہ کے نزدیک انشاء اللہ دہرا اجر عطا ہو گا -

"ایک صاحب نے دریافت کیا کہ اگر دو شخصوں نے کسی نیک کام کرنے کا ارادہ کیا اور کوشش بھی کی، مگر ایک دینی کوشش میں کامیاب ہوا اور دوسرا ناکام رہا تو ثواب دونوں کو برابر ملے گا یا کم و بیش - مثلاً دو شخصوں نے کلام مجید سیکھنا شروع کیا ایک تو اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا یعنی تلاوت پر قادر ہو گیا، اس کے بعد برابر تلاوت کرتا رہا اور دوسروں کو بھی پڑھاتا رہا - اور دوسرا بوجہ اپنے ضعف یا مرض یا غباوت وغیرہ کے ناکام رہا، مگر ساری عمر اس کوشش اور سیکھنے میں گزار دی" -

"حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ دونوں کو ثواب برابر ملے گا، بلکہ عجب نہیں ناکام کا اجر جس نے کوشش میں کمی نہیں کی کامیاب سے بڑھ جائے، چنانچہ حدیث میں ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الماهر بالقران مع السفرة الكرام البررة والذی يقرء القران و يتتعتع فيه وهو عليه شاق له اجران متفق علیہ اس کے بعد حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہم سے لگاؤ کس کو ہے - بس اس کی قدر ہے - لہٰذا کام میں لگا رہنا چاہئے

- اگرچہ ساری عمر بھی کامیابی نہ ہو (افاضات حصہ ہفتم ص ۱۴)

احضار قلب کی حقیقت: "ان لوگوں سے پوچھو جو عمل کرتے ہیں (کہ ان کو کیسی آسانی اور اطمینان نصیب ہوتا ہے) ان سے نہ پوچھو جو ہر کام کو بدون عمل ہی کے دشوار کہہ دیتے ہیں - مولانا محمد یعقوب رحمتہ اللہ علیہ (حضرت کے استاد) نے ایک بار اس کی یہ حقیقت فرمائی کہ نماز ایک مرکب فعل ہے، جس کے مختلف اجزا ہیں، قیام و قعود، رکوع و سجود اور قرات و اذکار وغیرہ - پس احضار قلب یہ ہے کہ نماز کے اعمال و اقوال کو محض یاد سے ادا نہ کرو، بلکہ ارادہ و توجہ سے ادا کرو کہ اب زبان سے یہ نکال رہا ہوں، اور اب رکوع میں جاتا ہوں اب سجدہ کر رہا ہوں - ہر ہر فعل اور ہر ہر لفظ پر جدید ارادہ کرو اس طرح احضار قلب حاصل ہو جائے گا - مولانا کے اس ارشاد کی تائید ایک حدیث (۱) سے بھی ہوتی ہے کہ من صلی رکعتیں مقبلا علیھما بقلبہ اس میں علیھما کی ضمیر کا مرجع رکعتیں یعنی صلوۃ ہے - حاصل یہ ہوا کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے، اور وہ مرکب ہے تو اس پر توجہ و اقبال وہی ہے، جو مولانا نے فرمایا - یہ تو امر اختیاری ہے، اس کو تو ہمت و عمل سے حاصل کرنا چاہئے"-

"ایک ہے حضور قلب یہ اختیاری نہیں یعنی اس کا وہ درجہ اختیاری نہیں، جس کی عموماً سالکین کو طمع ہوتی ہے، ورنہ حضور کا جو درجہ احضار کا مطاوع یا تابع ہے وہ تو اختیاری ہے - اس حضور سے زائد کے لئے صرف دعا کرنا چاہئے - اسی طرح ذوق و شوق وغیرہ غیر اختیاری ہیں، ان کے لئے بھی دعا ہی کرنا چاہئے - مجاہدہ وغیرہ اس کی تدبیر نہیں - جیسا کہ حدیث میں بھی ان کے لئے

---

(۱) راقم ہذا کے نزدیک تو خود قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے "حتی تعلموا ما تقولون" کہ زبان سے جو کچھ کہہ رہے ہو (ما تقولون) اس کو علم کے ساتھ یا جان جان کر کہو (حتی تعلمون) بعض اہل علم نے اس سے استدلال کیا ہے معنی و مطلب سمجھ کر پڑھے۔

صرف دعا آئی ہے - اللھم انی اسلک شوقا الی لقائک سو مجاہدہ وغیرہ حصول شوق کی غرض سے نہ کرو، نہ شیخ سے اس کے حصول کی تدبیر پوچھو، نہ اس سے یہ شکایت کرو کہ ہمارے اندر شوق پیدا نہیں ہوا - اس کے لئے محض دعا کرو" - (۱)

یہ اختیاری و غیر اختیاری کا مغالطہ اتنا عام ہے کہ اچھے اچھے اس میں تفریق و تمیز نہیں کرتے - اس لئے حضرت علیہ الرحمتہ نے اس راہ سے پیدا ہونے والے مغالطات کو گوناگوں عنوانات سے رفع فرمایا ہے - ایک مستقل مکتوب میں ارشاد ہے کہ

طریق سلوک کے دو خاص موانع : "منجملہ موانع طریق سلوک کے دو امر خاص ہیں، جن کا وقوع اس قدر کثیر ہے کہ شاید ہی کوئی سالک ان میں مبتلا ہونے سے بچا ہو، بلکہ اہل علم بھی ان میں مبتلا ہیں - ایک یہ کہ بعض امور غیر اختیاریہ کی فکر میں پڑ جاتے ہیں، جیسے ذوق و شوق، استغراق و لذت، یکسوئی و رفع خطرات، سوزش و انجذاب اور عشق طبعی وغیرہ ان چیزوں کو ذکر و شغل اور مجاہدات کے ثمرات سمجھ جاتے ہیں - ان کے حاصل نہ ہونے کو حرمان سمجھتے ہیں، جیسے قبض و ہجوم خطرات اور دل نہ لگنا یا کسی آدمی و مال کی طبعی محبت یا شہوت یا غضب طبعی کا غلبہ یا قلب میں رقت نہ ہونا یا رونا نہ آنا یا کسی دنیوی غم کا یا خوف کا غلبہ وغیرہ کہ ان چیزوں کو طریق کے لئے مضر اور مقصود سے مانع سمجھتے ہیں، اور ان کے زائل نہ ہونے کو اللہ تعالی سے بعد کا موجب سمجھتے ہیں -

---

یہ اختصار ہوتا تو تعقلون وغیرہ کا لفظ زیادہ واضح ہوتا، یہاں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ معقول (ماتعقلون) کا علم ہوتا رہے، اور "مقول" یعنی جو کچھ زبان سے کہا جاتا ہے، وہ الفاظ ہی ہیں - واللہ اعلم بالصواب

(۲) اشرف المسائل ص ۹۵، ۹۴ - ۱۲

اور مشترک ان دونوں میں یہ ہے کہ امور غیر اختیاریہ کی تحصیل یا ازالہ کے درپے ہوتے ہیں' جن میں متعدد مفاسد ہیں - ایک اعتقادی مفسدہ یہ ہے کہ در پردہ وہ اس میں حق تعالٰی کے ارشاد لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کی مزاجمت و مقابلہ ہے - کیونکہ قدرت و اختیار کا تعلق ضدین سے ہوتا ہے تو جس چیز کا حاصل کرنا اختیار میں نہیں' اس کا زائل کرنا بھی اختیار میں نہیں - اور سالک نے جب ان کے حصول و زوال پر مقصود کو موقوف سمجھا' تو گویا یہ اعتقاد رکھا کہ مقصود یا مامور بہ کا وسعت و قدرت میں ہونا شرط نہیں' جو لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کی صریح مخالفت ہوئی اور یہ کتنی بڑی غلطی ہے -

"دوسرا عملی مفسدہ یہ ہے کہ جب یہ امور اختیاری نہیں تو کوشش کرنے سے نہ حاصل ہوں گے نہ زائل ہوں گے' ناکامی سے روز بروز پریشانی بڑھے گی - اس مسلسل پریشانی سے کبھی آدمی بیمار ہو جاتا ہے' جس سے بہت سے اوزاد و طاعات سے محروم رہتا ہے - دوسرے پریشانی و غم کے غلبہ سے بعض اوقات اخلاق میں تنگی ہو جاتی ہے - جس سے دوسروں کو اذیت پہنچتی ہے - بعض اوقات غم و فکر کے غلبہ سے اہل و عیال وغیرہ کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی ہونے لگتی ہے اور معصیت تک نوبت پہنچ جاتی ہے کبھی پریشانی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ مقصود سے مایوس ہو کر خود کشی کر لیتا ہے اور خسر الدنیا والاخرۃ کا مصداق بنتا ہے - کبھی مایوس ہو کر اعمال و طاعات کو بیکار سمجھ کر چھوڑ بیٹھتا ہے' اور بطالت و تعطل محض کی نوبت آ جاتی ہے - کبھی شیخ سے بداعتقاد ہو جاتا ہے کہ مقصود کا راستہ خود انہی کو نہیں معلوم کبھی حق تعالٰی سے ناراض ہو جاتا ہے کہ ہم اتنی کوشش و مجاہدہ کر رہے ہیں مگر کامیابی نہیں ہوتی خدا جانے وہ تمام وعدے کہاں گئے "والذین جاھدو افینا لنھدینھم سبلنا اور من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا -

"غرض یہ نمونہ ہے ان مفاسد کا جن میں کوئی مضرت بدنی و نفسی ہے کوئی مضرت دینی ہے معصیت یا کفر - اس وجہ سے میں نے تمہید کی اول سطر میں

دونوں امر (غیر اختیاری کے تحصیل و ازالہ) کو طریق سلوک کا مانع کہا ہے - اور اہل طریق نے ہر زمانہ میں ان موانع کا معالجہ حسب استعداد طالبین فرمایا ہے - ان ہی معالجات میں وہ بھی ہیں جو اس زمانہ کی حالت و استعداد کے موافق وقتاً فوقتاً تربیہ السالک کا جزو بنتے رہتے ہیں (۱) -

جس طرح بہت سے لوگ غیر اختیاری باتوں کے پیچھے پڑ کر طرح طرح کے مفاسد کا شکار ہوتے ہیں' اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر اختیار اور ہمت و ارادہ سے کام نہ لے کر اور غیر محقق پیروں کے ہاتھ میں پڑ کر دین و دنیا کے جیسے جیسے مفاسد اور پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں اس کا اندازہ کسی کے درج ذیل خط سے فرمائیے -

"میں چھ برس سے مختلف قسم کی بیماریوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوں' علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بیماریوں کا سبب کثرت معاصی ہے - غلط کاری و گناہ نے میری حالت تباہ کر دی - خداوند قدوس سے ہدایت چاہتا ہوں لیکن نہیں ہوتی - چھ برس پہلے سلسلہ قادریہ میں مرید ہوا' لیکن پیر کی بدکرداری سے بیزار ہو کر بیعت توڑ دی اس کے بعد خود انہیں گناہوں میں ملوث ہو گیا - اب نماز روزہ کا بھی پابند نہیں ایمان صحیح ہے ' لیکن عمل سے دور ہوں - یہ بھی تندرستی نہ ہونے کی وجہ سے ہے - آپ خداوند عالم سے میرے لئے دعائے خیر کیجئے یا کوئی تجویز بتا دیجئے تاکہ مصائب سے چھٹکارا ہو - میں گناہ کو گناہ سمجھتا ہوں - توبہ و استغفار پڑھتا ہوں' اور چاہتا ہوں کہ معاصی سے چھٹکارا ہو' لیکن کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوتی" -

جواب میں ارشاد ہوا کہ

---

(۱) النور صفر ۱۳۵۸ھ ص ۱۲

"ایسی کوئی تجویز مجھ کو کیا کسی کو بھی معلوم نہیں کہ افعال اختیاریہ بدون استعمال اختیار کے صادر ہونے لگیں - باقی شاید تصرف کے موثر ہونے کا وسوسہ ہو تو اول تو مجھ کو اس میں کلام ہے' لیکن اگر یہ کلام مسلم نہ ہو تو یہ واجب التسلیم ہے کہ میں اس کمال سے معرا ہوں" -

لوگوں میں یہ بڑا مرض ہے کہ دنیا کے کاموں میں تو خوب جان توڑ کر کوشش کرتے ہیں' اور اختیار بھر کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے لیکن دین میں ہمت و اختیار سے کام لینے کے بجائے نری دعا سے کام نکالنا چاہتے ہیں -

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ جب بمبئی تشریف لے گئے تو ایک سوداگر نے عرض کیا کہ حضور دعا فرمائیں کہ خدا تعالیٰ مجھ کو حج نصیب کرے - آپ نے فرمایا کہ ایک شرط سے دعا کروں گا جس دن جہاز چلے اس دن پورا اختیار مجھ کو اپنے نفس پر دے دو کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں تم کو بٹھلا دوں - جب تک یہ نہ ہو صرف میری دعا سے کیا کام چل سکتا ہے' کیونکہ جب تک تم قصد نہ کرو گے دنیا کے کاروبار نہ چھوڑو گے' نہ وہ خود کم ہوں گے تو صرف میری دعا حج کیونکر کرا دے گی' خود کعبہ تو تم تک آنے سے رہا اور جن کو یہ شرف نصیب ہو بھی گیا' حج کرنے کے لئے ان کو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا" -

"خیال کیجئے کہ ابو طالب جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں' اور بہت بڑے محب کہ جس موقع پر تمام قریش نے مخالفت کی اور دشمن ہو گئے اور اس موقع پر ابو طالب نے آپ کا ساتھ دیا اور ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے بہت محبت تھی اور آپ نے بے حد کوشش ان کے مسلمان ہونے کی فرمائی - لیکن محض اس وجہ سے کہ انہوں نے خود ارادہ نہیں کیا حضور کی کوشش و محبت کچھ بھی کام نہ آئی - اس پر حضور کو بہت رنج ہوا ' یہ آیت نازل ہوئی انک لا تھدی من اجبت ولکن اللہ یھدی من یشاء (الرفیق ص ۵۳)

بس وہی جیسا کہ تسہیل الطریق کے مکتوب میں سارے طریق اور مکمل دستور العمل کو دو سطروں میں فرما دیا کہ

"غیر اختیاری کی فکر میں نہ پڑے - اختیاری میں ہمت سے کام لیں اگر کوتاہی ہو جائے ماضی کا تدارک استغفار سے کر کے مستقبل میں پھر تجدید ہمت سے کام لینے لگیں - اور استعمال ہمت کے ساتھ دعا کا بھی التزام رکھیں اور بہت لجاجت کے ساتھ" -

کسی مولوی صاحب کے جواب میں "دو ہی جملوں میں تمام تصوف کی حقیقت و روح "بیان فرما دی تھی کہ" اس طریق میں افعال مقصود ہیں انفعالات مقصود نہیں (الافاضات الیومیہ ص ۱۰۶)

سبحان اللہ مقصود وغیر مقصود اور اختیاری و غیر اختیاری سب کا عطر ان دو جملوں میں کھنچ گیا!

ریاضت سے رذائل کا استیصال نہیں ہوتا: اسی طرح طبعی امور بھی غیر اختیاری ہیں - لوگ ان کے استیصال و ازالہ کی فکر میں پڑ کر وقت و قوت کو بھی ضائع کرتے اور ناکامی کا ملال و پریشانی مفت خریدتے ہیں - مثلاً یہ چاہتے ہیں مجاہدہ و ریاضت سے بری باتوں کا میلان ہی طبیعت سے نیست و نابود ہو جائے - اخلاق ذمیمہ کی جڑ ہی کٹ جائے - حالانکہ

"ریاضت سے اخلاق ذمیمہ کے اصول کا ازالہ نہیں ہوتا' بلکہ ان کی تہذیب ہو جاتی ہے - جس کا حاصل یہ ہے کہ ان اصول کے آثار کا امالہ ہو جاتا ہے -' یعنی ان کا مصرف یا استعمال بدل جاتا ہے - مثلاً کسی شخص میں بخل و غضب موجودہ ہو تو ریاضت سے اس کی جڑ نہیں جاتی کہ سرے سے غضب و بخل ہی نہ رہے' بلکہ اس طرح اس کی تہذیب ہو جاتی ہے کہ پہلے مواقع خیر میں بخل کرتا تھا اور نیک بندوں پر غصہ کرتا تھا - اب نامشروع جگہ بخل کرے گا اور مبغوضان الٰہی اور اپنے نفس پر غصہ کرے گا تو اس طرح (اخلاق ذمیمہ) بعد کے بجائے

قرب کے اسباب بن گئے - (ھکذا قال مرشد الحاج امداد اللہ رحمہ اللہ)

"اس سے اس اختلاف کا بھی فیصلہ ہو گیا کہ ریاضت سے تبدیل اخلاق ہو سکتی ہے یا نہیں - معلوم ہو گیا کہ تبدیل اصول تو نہیں ہو سکتی حدیث میں ہے اذ سمعتم برجل زال عن جبلہ فلا تصدقوہ - البتہ آثار و مصارف یا استعمالات بدل سکتے ہیں - اس لئے مجاہدہ و ریاضت کا حکم ہے" - (۱)

نفس کسی معصیت یا بداخلاقی کا طبعی رجحان و تقاضا جب تک اس کے مقتضی پر عمل نہ ہو نہ معصیت ہے، نہ بد اخلاقی - انسان مکلف صرف اس کا ہے کہ

" اخلاق رذیلہ کے مقتضیات پر عمل نہ کرے - رہا یہ کہ اقتضاء ات زائل ہو جائیں، اس کا نہ انسان مکلف ہے نہ بسہولت میسر ہو سکتا ہے" -

البتہ ریاضت و مجاہدہ سے نفس اتنا مہذب و شائستہ ہو جاتا ہے، کہ آسانی سے قابو میں آ جاتا ہے - جس کی مثال حضرت یہ دیا کرتے ہیں کہ جیسے تربیت یافتہ شائستہ گھوڑا بھی کبھی کبھی شوخی کرتا ہے، لیکن آسانی سے رام ہو جاتا ہے -

مگر لوگ بالعموم چاہتے یہی ہیں کہ طبعی و نفسانی اقتضاء ات سرے سے فنا ہو جائیں مثلاً ایک طالب نے لکھا کہ میری تمنا ہے کہ شبے نہ آئیں تحریر فرمایا کہ

"کل کو یہ تمنا کرنا کہ بخار نہ آئے اس سے پہلے یہ تحریر فرما چکے تھے کہ بلا اختیار شبہہ آنا خدا رسول کو سچا سمجھنے کے منافی نہیں" (اشرف السوانح ص ۱۲۲ دوم)

کسی نے امارد کی طرف میلان کی شکایت کی - تھے صاحب ہمت اختیاری علاج میں کوتاہی بالکل نہ تھی، جس کی طرف اس قسم کے میلان ہوتا لکھتے ہیں کہ "اس سے بلا ضرورت نہ کلام کرتا ہوں، نہ بالقصد دیکھتا ہوں، اور ضرورت کے وقت بھی حتی الوسع نظر نیچی رکھتا ہوں، اس سے تقاضائے نفس کمزور پڑ جاتا حتیٰ کہ قریب

---

(۱) انکشف ص ۷۹ - ۱۲

قریب معدوم ہو جاتا ہے ۔ مگر اصل مرض جاتا نہیں " یعنی وہی طبعی میلان یا نفسانی تقاضا بالکلیہ فنا نہ ہونے یا مادہ کے عدم استیصال کی شکایت ہے ۔ جواب میں ارشاد ہے کہ.

"مادہ کے استیصال کی کوئی تدبیر نہیں ۔ موسمی بخار کا نسخہ پینے کا بعد کیا پھر آئندہ فصل میں بخار نہ ہو گا ۔ وہ کونسی تدبیر ہے کہ صفرا ہی پیدا نہ ہو اور اگر ایسا کیا جائے تو بہت سے منافع جو خلط صفرا سے متعلق ہیں فوت ہو جائیں گے ۔ .اس طرح مادہ شہوانی میں بہت سے منافع ہیں" ۔ (النور رمضان ۴۷ھ)

اسی طرح ایک اور طالب نے خواہش نفسانی سے نجات پانے کا علاج پوچھا تحریر فرمایا کہ کل کو حرام غذا سے توبہ کر کے دعا کر تاکہ بھوک ہی سے نجات ہو جائے" ۔

طبعی و عقلی میں فرق : نہ کرنے سے بھی سالک کیسی کیسی غلطیوں کا شکار ہو جاتے ہیں ایک طالب نے لکھا کہ حضور کے ساتھ غلبہ محبت کا آج کل یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ دل میں سوائے آپ کی محبت کے اور کوئی محبت نہیں ...... اللہ تعالیٰ کی محبت بھی کم محسوس کرتا ہوں ۔ جواب میں تحریر فرمایا کہ

"صحیح نہیں حق تعالیٰ کی محبت میں شان عقلیت غالب ہوتی ہے اور ہم جنس کی محبت میں شان طبیعت غالب ہوتی ہے ۔ اور سرسری نظر میں محبت عقلی محبت طبعی کے سامنے ضعیف و مضمحل معلوم ہوتی ہے ۔ حالانکہ امر بالعکس ہے ۔ چنانچہ اس محبوب طبعی سے نعوذ باللہ حق تعالیٰ کی شان کے خلاف کوئی قولی یا فعلی معاملہ ہو تو وہی محبوب فوراً مبغوض ہو جائے جس سے ثابت ہوا کہ دراصل حق تعالیٰ ہی کی محبت غالب ہے" ۔ (۱)

کلام مجید و حدیث سے گریہ و بکا کی فضیلت معلوم ہوتی، مگر بعضے طبعاً رقیق

---

(۱) اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۳۷ ۔ ۱۴

القلب ہوتے ہیں بات بات پر رونا آتا ہے اور بعضوں میں طبعًا رقت قلب نہیں ہوتی، لیکن یہ کیسی دقیق بات فرمائی کہ اگر ایسے شخص کو اپنی اس حالت پر عقلاً تاسف ہو، تو وہ بھی دراصل رونا ہی ہے۔

"ایک مولوی صاحب نے عرض کیا کہ یبکون ویزید هم خشوعا جو فرمایا گیا ہے کیا اس سے قصداً رونا مراد ہے فرمایا کہ اس میں بکا کی صرف فضیلت مذکور ہے، اس کا امر نہیں، اس لئے قصداً رونا مراد نہیں۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ جس کو رونا نہیں آتا۔ فرمایا اس کو بھی آتا ہے۔ عرض کیا کہاں آتا ہے۔ فرمایا رونا نہ آنے پر افسوس ہونا بھی رونا ہی ہے"۔ (۱)

بڑوں کی ایک بڑی غلط فہمی: حد یہ ہے کہ عموماً بڑے بڑے لوگ اس کو بڑا مطلوب اور کمال سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں اتنی محویت و فنائیت پیدا ہو جائے کہ بھولنا بھی چاہیں تو نہ بھولیں اور غیر اللہ کا سرے سے کبھی کوئی خیال ہی دل میں نہ آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ عام انسانی طبیعت و فطرت کے صرف خلاف ہی نہیں، بلکہ حضرت مجدد تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے کیسی مجددانہ تنبیہہ فرمائی ہے کہ یہ دراصل اختیار کی دولت کے بجائے، جس پر انسان کی ساری انسانی فضیلت و تخلیقی حکمت کا مدار ہے اضطرار کی تمنا کرنا ہے۔

"ایک صاحب نے لکھا کہ عرصہ سے اس کی طلب ہے کہ ذکر حق قلب میں ایسا پیوست ہو جائے کہ بھولنے کی کوشش بھی کروں تو نہ بھول سکوں اور غیر کا حضور قلب میں ناممکن ہو جائے۔ جواب میں تحریر فرمایا کہ یہ تو مجھ کو بھی نصیب نہیں نہ اس کا جی چاہتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مختار نہ رہوں گا، مضطر ہو جاؤں گا"۔

---

(۱) الافاضات ص ۲۰۷۔ ۱۲

اس کے بعد انہیں صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز کے مکتوبات کے حوالہ سے لکھا کہ

"وہ تحریر فرماتے ہیں کہ باطنی امراض کا سردار ماسوائے حق کے ساتھ دل کی گرفتاری ہے - اور گرفتار نہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ ماسوا کو کلی طور پر فراموش کر دے اور تمام چیزوں سے بے خبر ہو جائے حتیٰ کہ اگر تکلف سے بھی چیزوں کو یاد کرے تو یاد نہ آئیں، حتیٰ کہ ماسوائے حق کا خطور قلب پر ناممکن ہو جائے - اس معیار پر نظر کرتا ہوں تو اپنے کو کورا پاتا ہوں - الحمد للہ ثم جذر قلب میں تو ماسواء کا گزر نہیں، مگر حوالی قلب میں غیر کا حضور بھی ہے اور یاد بھی ہے" -

اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ

اہل مقام کا غلبہ حال : "اکثر اہل مقام پر بھی کچھ وقت حال کا غلبہ ہوتا ہے، تو اس وقت مسائل کی تعبیر میں بھی جوش کا اثر ہوتا ہے میرے نزدیک عنوان تیز ہے، مگر مضمون وہی ہے، جو نصوص سے مستفاد ہوتا ہے - میں اس کو ایک اور سہل عنوان سے تعبیر کرتا ہوں، جو حضرت مجدد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے کلام کی قریب تفسیر ہے - اور مشہور تعبیر سے قدرے واضح ہے وہ یہ کہ گرفتاری سے مراد مطلقاً تعلق نہیں کیونکہ تعلق مغلوب مذموم نہیں - بلکہ ایسا تعلق مراد ہے کہ محل تعلق کے بعد یا فوت سے قلب پر ایسا اثر ہو کہ اس کے تصور و حسرت میں مشغول ہو جائے اور اس مشغولی سے طاعات میں قلت و ضعف آ جائے - اور اگر یہ نوبت نہ پہنچے تو محض حزن کا اثر مانع نہیں - کیا حضرت یعقوب علیہ السلام کے حزن شدید کا کوئی انکار کر سکتا ہے - اور کیا ان کی حالت کو کوئی مانع عن الحق کہہ سکتا ہے" - (۱)

---

(۱) اشرف السوانح حصہ دوم ص ۱۵۱، ۱۵۰ - ۱۲

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یاد و تعلق کے غلبہ یا عدم غفلت کے معنی یہ ہیں کہ غیر اللہ کی یاد و تعلقات اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی پیروی اور طاعات کی بجا آوری میں کوئی کمی و کمزوری نہ پیدا کرنے پائیں - وہی کہ جہاں تک کہ ہمارے افعال کا تعلق ہے کوئی فعل مرضی حق کے خلاف نہ صادر ہو -

تربیہ السالک

مقصود و غیر مقصود' اختیاری و غیر اختیاری' طبعی و عقلی (اعتقادی) افعال و انفعال' نفس کا تقاضا اور اس کے مقتضی پر عمل - یہ امور و کلیات اگرچہ بجائے خود دینی زندگی اور خدا طلبی کی بڑی سے بڑی مشکلات کا بے خطا حل ہیں اور راستہ کے بڑے بڑے پہاڑ بھی ان کے ڈئنامیٹ سے اڑ جاتے ہیں - تاہم ان اصول و کلیات کا صحیح استعمال اور جزئیات پر ان کا صحیح انطباق ہر کس و ناکس کا کام نہیں اس کے لئے انسانی نفسیات (سائیکالوجی) سے غیر معمولی مناسبت - نفس بشری کے دقائق و مکائد کی معرفت' تشخیص مرض کی حذاقت' مرض کے متشابہ علامات کی بصیرت اور سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی اعانت اور ایمانی فراست درکار ہے - یہ چیزیں حضرت جامع المجددین میں جس درجہ کمال پر جمع تھیں اس کو صرف خدا کی دین ہی کہا جا سکتا ہے - کسی طور پر نہ اس درجہ کا حصول آسان نظر آتا ہے' نہ نری کتابوں سے کام چلتا ہے - یہ کوئی خوش اعتقادی کا دعویٰ نہیں' بلکہ کوئی غیرمعتقد بھی بشرطیکہ انسانی نفسیات اور امراض باطنہ کا کچھ مبصر ہو تو حضرت کی طب باطنی کے مطبوعہ مطب (تربیہ السالک) کے جو ہزاروں صفحات موجود ہیں ان میں سے سو دو سو کے مطالعہ سے بھی خواہ حضرت کے کمالات باطنی کا معتقد ہو نہ ہو' لیکن امراض باطنی کی تشخیص اور کمال معالجہ کا قدم قدم پر معتقد ہونا پڑے گا - احقر نے تو ایک مرتبہ جسارت کر کے یہ سوال ہی پیش کر دیا تھا کہ "حضرت کے علوم پر بے حد تعجب ہوتا ہے کاش اس میں کچھ کسب کو دخل ہوتا' کتابوں میں تو یہ چیزیں ملتی نہیں" جواب عارف روم کی ایک تمثیل میں یوں عطا ہوا کہ

وہبی علوم کی مثال: "یہ سب آپ کی محبت و حسن ظن ہے - اب اس تعجب کی وجہ عرض کرتا ہوں - وہ یہ ہے کہ ان علوم کے اس نادان کی طرف ظاہرا منسوب ہونے پر نظر گئی تو تعجب لازم ہے' اور اگر نظر کو آگے بڑھایا

جائے تو کچھ صندوق نظر آئیں گے جن سے یہ کلام نکلتے ہیں' اور ان صندوقوں سے اوپر ایک دریا نظر آئے گا تو تعجب رفع ہو جائے گا - البتہ انعام الٰہی اس وقت بھی محل شکر ہو گا' وہ انعام ان صندوقوں کے ساتھ اتصال ہے - جس کی مختصر حکایت یہ ہے -

سینہ را صندوق سرہا کردہ
وندران مخزون گہر ہا کردہ
ربط داری سینہ رابا سینہ
ربطہ این آئینہ با آئینہ
نقش این آئینہ دردیگر پدید
کر دی ازصنع بخود اے رب مجید
آب از جوئے بجوئے می رود
باز یکسو گشتہ در دریا رود (۱)

کبھی کبھی اس حقیقت کو یوں بھی ظاہر فرمایا کرتے تھے کہ "طالب کی برکت سے حق تعالیٰ عین وقت پر بات دل میں ڈال دیا کرتے ہیں' پہلے سے مجھ کو علم نہیں ہوتا' طلب و رسد کا عام قانون قدرت بھی اسی کو مقتضی ہے - ع -

تانہ گرید طفل کے جو شد لبن

امراض باطنہ کا فن طب : تاہم دینی و باطنی امراض بھی امراض ظاہری کی طرح بہرحال امراض ہی ہیں ' اس لئے جس طرح ظاہری و جسمانی امراض اور ان کے معالجہ کا ایک باقاعدہ ادر سائنسی علم و فن مدون ہو سکتا تھا اور ہوا' اسی طرح باطنی و روحانی امراض اور ان کے معالجہ کی بھی ایک حیثیت خالص علم و فن

---

(۱) النور شعبان ۵۸ - ۱۲

کی ہے جس کو ہر شخص اپنی مناسبت و صلاحیت کے بقدر حاصل کر سکتا ہے ۔ اور جس طرح طبیب یا معالج کا بذات خود بدپرہیز ہونا اس کی فن دانی کے منافی نہیں' اسی طرح حضرت علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ شیخ (یعنی امراض باطنہ کے طبیب یا مرض دان) کا بذات خود ولی و متقی ہونا لازم نہیں' البتہ اس کے بغیر تعلیم و تربیت میں برکت نہیں ہوتی ۔ جیسے اکثر دیکھا اور سنا کہ حریص و طماع جسمانی اطباء کو بھی باوجود فنی مہارت کے دست شفا نصیب نہیں ہوتا ۔ تو روحانی معالج کا مخلص و متقی ہونا تو بدرجہ اولیٰ اہم و الزم ہے ۔

اس کی تدوین و تجدید : غرض جہاں تک نفس اس علم و فن کا تعلق ہے' اس کے اصول و مبادی کتاب و سنت اور سلف سے جو کچھ معلوم و منقول چلے آتے تھے حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے ان کو بہت بڑی حد تک ایک فن کی شکل میں مرتب فرمایا' لیکن اس میں اب اسی قدر ترمیم و تعدیل کی حاجت تھی' جتنی اس زمانہ میں ابن سینا کی طبی تحقیقات میں ۔ الحمد للہ کہ حضرت جامع المجددین علیہ الرحمہ کے ہاتھوں تجدید دین کی یہ خدمت بھی بوجہ اتم و اکمل پوری فرمائی گئی ۔ یوں تو حضرت کی جامعیت کا مقام کچھ ایسا غیر معمولی ہے کہ

زفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

حضرت کا خاص کمال : لیکن اگر یہ سوال ہو کہ جامعیت کمالات کے باوجود حضرت کا سب سے بڑا اور خاص کمال کیا تھا' تو راقم احقر کا علم و فہم میں اس کا جواب تربیۃ السالک ہے ۔ اس باب میں حضرت کا موہوب و مکسوب درجہ کمال بس اہل نظر کے دیکھنے اور سمجھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ دین داری و خدا طلبی کے سارے نشیب و فراز نکال کر ایسی صاف و استوار شاہ راہ بنا دی ہے کہ ہر شخص بے کھٹکے اس پر چلا جا سکتا ہے ۔ اگر کوئی اس شاہ راہ سے گزرا ہوا خصوصًا

حضرت کی دستگیری کے ساتھ گزرا ہوا رفیق دستگیر دستیاب ہو جائے تو کہنا ہی کیا! ورنہ نا اہلوں کے ہاتھ میں پڑنے کے بجائے خود حضرت کے مرتب فرمودہ نصاب و دستور العمل کو پورا کر کے یعنی وہی بقدر ضرورت احکام دین کے تمام ابواب (دیانات' معاملات اخلاق و معاشرت) کا علم حاصل کر کے جس کو خود حضرت ہی نے بہشتی زیور (مع بہشتی گوہر) اور تعلیم الدین میں پورا فرما دیا ہے' اس کے بعد کم سے کم چالیس پچاس حضرت ہی کے مواعظ اور قصد السبیل کا مطالعہ کرے بلکہ کچھ نہ کچھ برابر مطالعہ کرتا رہے' اور احقر کے تجربہ میں ملفوظات کا بھی کچھ نہ کچھ مطالعہ بے حد نافع ہے (بلکہ جن کو حضرت سے کوئی سابقہ مناسبت و معرفت نہیں حاصل ان کے لئے مقدم ہے) باقی امراض کی تشخیص و معالجہ کے لئے تربیتہ السالک کے ہزاروں صفحات کے مطب کا استقلال و تکرار کے ساتھ برابر مطالعہ میں رکھنا کافی ہے (سب سے بڑا مرتب و مطبوعہ مجموعہ (ا) بتویب تربیتہ السالک قریبا تیرہ سو صفحات کا ہے) انشاء اللہ اس سے راستہ کھلتا جائے گا - بس چلتے رہنا شرط ہے - باقی کوئی محروم چلنا ہی نہ چاہے تو "چہ سود از رہبر کامل" -

نااہل یا نام کے مشائخ سے تو ہر حال میں دور ہی رہنا لازم ہے لیکن اہلیت کے لئے صرف اتنا معیار کافی ہے کہ احکام کے ضروری علم کے ساتھ اعمال صالحہ کی فکر و اہتمام رکھتا ہو' اور اپنے سے زیادہ راہ شناس ہو - پھر یہ اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ میرے لئے یہی سب سے بڑا شیخ یا مربی و پیر ہے - اس سے رسمی بیعت بھی ضروری نہیں ' البتہ "اطلاع و اتباع لازم ہے یعنی اپنے حال و مرض کی شیخ کو برابر اطلاع اور دوا و پرہیز میں اس کا پورا اتباع کرتا رہے -

ایک اور تنبیہہ: اس موقع پر ضروری ہے کہ سعی تو ہو کامل صحت و شفا

(ا) لیکن یہ مجموعہ صرف تیس سال (۱۳۲۰ھ ۱۳۵۰ھ) کا ہے - اب احسن انفع ترتیب کے ساتھ کامل مجموعہ کی طباعت واشاعت کی ضرورت ہے ۱۲

کی' لیکن نہ اس کے لئے بے صبری و عجلت ہونا چاہئے - نہ رفتار صحت کی سستی سے مایوسی - کیونکہ ظاہری امراض کی طرح باطنی امراض میں بھی صحت و شفا کی مقدار کا مدار بہت کچھ مرض کی نوعیت اور اس کی شدت و مدت پر ہے - دق کے تیسرے درجہ کا مریض اگر کسی طبیب کے علاج سے اتنا ہی شفا یاب ہو جائے کہ پلنگ پر پڑے پڑے دس بیس سال زندگی کی سانسیں اور لیتا رہے' تو معالج کی کمال حذاقت اور علاج کی کامیابی میں کیا کلام ہو سکتا ہے -

یہ خالی مثال نہیں بلکہ ظاہری و باطنی گوناگوں عویص و شدید' مہلک و مزمن دینی امراض کے راقم السطور مریض کا ذاتی حال و تجربہ ہے کہ اس کی بد حالی و بد اعمالی دق کے تیسرے درجہ کے بھی آخری درجہ تک پہنچ چکی تھی - ظاہر و باطن کے دونوں پھیپھڑے سڑ چکے تھے (اس میں تواضع و مبالغہ قطعاً نہیں) اس لئے اگر وہ نام کا ایمان و اسلام بھی قبر تک سلامت لے جا سکے' تو سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالٰی نے محض اپنے فضل سے بس حضرت کے تعلق ہی کی لاج رکھ لی! اور آج بھی اپنا سرمایہ "احب الصالحین ولست منہم" کے سوا کچھ نہیں' جو کچھ بھی سہارا ہے' وہ "بدان را بہ نیکاں بہ بخشد کریم" کے محض رحم و کرم کا - اس لئے کہا کرتا ہوں کہ اگر احقر کے حال سے کوئی حضرت کے کمال میں شک کرے گا' تو بڑا فریب اور بڑی محرومی خریدے گا حتیٰ کہ آخر آخر میں وصال سے چند ماہ قبل (بیعت کا تعلق نہ ہونے کے باوجود) جو اجازت بیعت عطا فرما دی تھی' وہ بھی اب سمجھ میں آ رہا ہے کہ دوسروں کی نہیں بلکہ دراصل زیادہ تر خود احقر کی اصلاح کے لئے تھی - بالکل اسی طرح جیسے چور کو چوکیدار بنا دیا جائے کہ شاید اس کی شرم سے چوری سے باز آ جائے - مدت تک اس اجازت کے معاملہ میں بڑا خلجان رہا' آخر جب خود حضرت ہی کا یہ ارشاد کہیں نظر سے گزرا کہ بعض دفعہ اجازت خود مجاز کی اصلاح کی مصلحت سے دے دی جاتی ہے' تب جا کر حضرت حکیم الامت کی یہ حکمت احقر کے حق میں سمجھ میں آئی - واللہ اعلم -

سب سے جامع و کامل تجدیدی خدمت : خیر یہ تو ایک بڑی غلط فہمی کے ازالہ کے لئے جملہ معترضہ تھا ۔ اصل میں کہنا یہ ہے کہ ظاہری و جسمانی امراض کے باقاعدہ علاج و معالجہ کی روز افزوں اہمیت کے ساتھ باطنی و روحانی امراض کے علاج و معالجہ' بلکہ ان کو سرے سے امراض سمجھنے میں جس درجہ جہل و غفلت ہے' اس کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ دین اور خصوصًا کمال دین یعنی تصوف و سلوک میں حضرت مجدد وقت علیہ الرحمہ کی سب سے جامع و کامل تجدیدی خدمت یہی ہے ۔ کہ باطنی طب کو بھی حضرت نے وقت کے مزاج و مذاق کے موافق باقاعدہ مکمل و مدون فن بنا دیا ۔ اور صرف نظری طور پر نہیں' بلکہ عملی رہنماء اور نسخہ نویس تک کے لئے ہزاروں صفحات کا مطبوعہ مطب اللہ تعالیٰ بنے مریضوں اور مایوسوں کے لئے محفوظ فرما دیا جو اس عالمگیر دور غفلت میں بالکل غیبی نصرت ہے ۔ حد اس غفلت کی یہ ہے کہ مشائخ تک نے اس حقیقت کو بھلا دیا ہے کہ ان کی اصل حیثیت امراض قلب کے طبیب کی ہے' اور پیر و مرید کا اصل تعلق معالج و مریض کا ہے ۔

شیخ کی حیثیت معالج کی : اور خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ قلب و باطن کے امراض کو بھی امراض ہی قرار دینا یہ محض تجدید ہی ہے ۔ کوئی تجدد یا نئی بات قطعًا نہیں ۔ پہلے بھی معلوم ہو چکا ہے کہ خود کتاب و سنت قرآن و حدیث کے نصوص میں بھی قلب و باطن کے فسادات کو امراض قرار دیا گیا ہے ۔ اور تصوف میں تو محققین صوفیہ اور حد یہ ہے کہ حضرت شیخ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ تک نے تحریر فرمایا ہے کہ شیخ (پیر) کے لئے لابدیہ ہے کہ جہاں اس میں دین انبیاء کا سا اور سیاست ملوک کی سی ہو وہاں تدبیر اطباء کی سی ہو ۔ لیکن آج عوام کیا خواص بھی حضرت شیخ ابن عربی کو محض وحدۃ الوجود کا امام جانتے اور اسی پر سر دھنتے ہیں ۔ اور ملوکانہ سیاست یا مریدوں کی تادیب و مواخذہ روک ٹوک کو بھی اسی طرح پیر کے فرائض سے خارج (بلکہ بعضوں کے نزدیک سرے سے غیر نافع) سمجھ لیا گیا

ہے جس طرح امراض قلب کے طبیبانہ علاج و تدابیر کو - یہ بھی حضرت جامع المجددین کا تجدیدی کارنامہ ہے کہ طبیبانہ تدابیر کے ساتھ ملوکانہ سیاست کو بھی از سر نو تعلیم و تربیت کے لئے حسب ضرورت لازم قرار دیا - باقی خود حضرت شیخ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کی اس باب میں حکیمانہ و مدبرانہ تحقیق و ہدایت بالفاظ پڑھنے کے لائق ہے - آداب الشیخ و المرید کے نام سے ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے' اس میں ارشاد ہے کہ

" فلا بدان یکون عند الشیخ دین الانبیاء و تدبیر الاطباء و سیاسہ الملوک وحینیذ یقال لہ الاستاد ویجب علی الشیخ ان لا یقبل مرید احتی یختبرہ (یعنی شیخ کے لئے لازم ہے کہ اس میں دین انبیاء کا سا ہو ' اور تدبیر اطباء کی سی اور سیاست بادشاہوں کی سی ' تب کہا جائے گا کہ اب یہ استاد ہے - اور شیخ پر واجب ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک مرید نہ کرے' جب تک پہلے اس کا امتحان نہ کر لے)

"اور یواقیت میں ہے - عن ابراھیم الدسونی لو ان الفقیہ اتی العبادۃ والمامورات الشرعیہ بغیر علہ کما امرہ اللہ تعالی استغنی عن الشیخ و لکنہ اتی العبادات بعلل و امراض فلذاک احستاج الی طبیب یداویہ حتی یحصل لہ الشفاء (یعنی اگر فقیہ کی عبادت اور احکام شریعت کی بجا آوری میں کوئی علت یا بیماری نہ لاحق ہوا کرتی' اور ان کو اسی طرح بجا لاتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو وہ بیشک شیخ یا پیر سے بے نیاز ہو سکتا تھا لیکن اس کی عبادات میں گونا گوں بیماریاں اور امراض پائے جاتے ہیں تو لازما وہ ایسے طبیب کا محتاج ہے جو اس کا علاج کرے تاکہ شفا حاصل ہو" -

پیر و مرید کی حیثیت طبیب و مریض کی : "ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ان اکابر کا اصل مقصود نفس کی اصلاح اور مامورات شریعت کا اخلاص کے ساتھ بجا لانا اور منہیات سے احتراز کرنا تھا' اور شیخ و مرید میں مریض

و طبیب کا سا تعلق تھا - اور اصلاح ایک مستقل فن تھا جیسا کہ تدبیر الاطباء سے سمجھ میں آتا ہے - اور مشیخت کا دعوے اس وقت سچا تسلیم کیا جاتا تھا جب کہ شیخ علل و امراض اور ان کے معالجات کے طریقوں سے بخوبی واقف و ماہر ہو اور مرید کو ان باتوں کی تعلیم اور ان پر کاربند کرتا ہو' اور بوقت ضرورت سیاست سے بھی کام لیتا ہو' مریدوں کو مطلق العنان نہ چھوڑتا ہو -

لیکن "آہستہ آہستہ ایسا انقلاب ہوا کہ یہ فن قریب قریب مردہ ہو گیا عوام تو کیا خواص بلکہ اخص الخواص جو مسند ارشاد پر متمکن ہوتے ہیں' ان میں بھی اکثر اس فن کی حقیقت سے ناواقف ہو گئے ہیں - جب طبیب ہی بیمار ہو یا اصول فن کے موافق علاج نہ کرتا ہو تو پھر بیماروں کے اچھے ہونے کی کیا صورت -

"بس مشائخ کے ہاں بھی ارشاد و تربیت کا انحصار صرف اذکار و اشغال کی تعلیم میں ہو گیا - اپنا فرض انہوں نے اس تعلیم کو سمجھا اور طالبین ان کی پابندی اور ان پر جو کیفیات و احوال طاری ہوتے ہیں انہیں کو وصول الی اللہ سمجھا - خواہ باطن کبر و حسد و ریا وغیرہ رذائل و اخلاق مذمومہ سے ملوث ہو - حالانکہ کیفیات کا حصول عند اللہ مقبولیت کی دلیل نہیں' کیونکہ یہ خاص تدبیرات سے فاسقوں بلکہ کافروں کو بھی حاصل ہو جاتی ہیں" -

یہ سب اقتباسات بتویب تربیتہ السالک کی تمہید سے ماخوذ ہیں' جو حضرت مولانا وصی اللہ صاحب مدظلہ نے تحریر فرمائی ہے اور جن میں اقتباسات بالا کے بعد حرف حرف صحیح تحریر فرمایا گیا کہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ

"طریق مردہ کے احیاء کے لئے ہمیشہ انبیاء علماء و مجددین کو قائم فرماتے رہے ہیں - اسی عادت مستمرہ کے موافق اس زمانہ میں بھی علماء و مشائخ کو قائم فرمایا- منجملہ ان کے حضرت مجدد الملت محی السنۃ قاطع البدعت سیدی و مولائی شاہ محمد اشرف علی صاحب مدظلہ العالی بلاشبہ اس صدی کے مجدد اور غزالی وقت و حکیم

الامتہ ہیں - آپ کی شان تربیت وارشاد مشائخ متقدمین جیسی ہے - تصوف کی مبہم و مجمل حقیقت قرنون کے بعد ایسی صاف اور منقح و مفصل کر دی ہے کہ حقیقت کے سمجھنے میں کسی قسم کا خفا باقی نہیں رہا ہے -

"یوں یہ مضامین آپ کی قریب قریب سب کتابوں میں ملتے ہیں - مگر تربیتہ السالک اس موضوع میں خصوصیت کے ساتھ بے نظیر کتاب ہے' جو فن اصلاح و تربیت کا بیش بہا خزانہ ہے - آج تک فن تربیت میں کوئی کتاب ایسی مدون و مرتب نہیں ہوئی' جس میں تربیت کے اصول و فروع مدون ہوں - ہر قسم کے حالات جو سالکین کو پیش آتے ہیں اور ان کے متعلق جو تحقیقات حضرت مدظلہ نے فرمائی ہے اسی طرح اعمال و حالات کے متعلق سوالات اور جوابات کا اس میں کافی ذخیرہ ہے' کہ فہیم آدمی کو اس کے مطالعہ سے کافی مناسبت اس فن سے ہوسکتی ہے' اور فن کی حقیقت خوب منقح ہو سکتی ہے - مزید یہ کہ ہر قسم کے ایسے مسائل و تحقیقات اس میں اتنے موجود ہیں' جو کم و بیش ہر شخص کے حالات پر منطبق ہو جاتے ہیں' جس سے اپنے اپنے حال کے اچھے برے ہونے کی کافی اطلاع ہو جاتی ہے" -

تربیتہ السالک کی مرید سے زیادہ پیر کو ضرورت : اور راقم احقر کے نزدیک تو طالبین و مریدین سے زیادہ تربیہ السالک کا ذخیرہ حضرات مشائخ و مرشدین کے حرز جان بنانے کا ہے (بشرطیکہ معاصریت و جماعتی عصبیت حاجب نہ ہو) تو انشاء اللہ نہ صرف وہ ارشاد و ہدایت' اصلاح و تربیت کے حقوق کما حقہا ادا فرما سکیں گے' بلکہ اعمال و اخلاق' ظاہر و باطن کے اعتبار سے مسلمان مسلمان بن جائیں گے - اس لئے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں پر حضرات مشائخ کا کچھ نہ کچھ اثر باقی ہے' جس سے کام لے کر ان کی اور اپنی دونوں کی دنیا و آخرت کو سنوارا جا سکتا ہے - مگر اب اس میں غفلت و تاخیر کی ایک آن بھی گنجائش نہیں' اس لئے کہ حضرات علماء و مشائخ کی اپنے اصل فرائض منصبی سے بے پروائی کی

بدولت مسلمانوں کے ساتھ ان کا رہا سہا تعلق و اثر بھی بس رخصت ہی ہو رہا ہے!۔ الا ان یاتی اللہ با مرمن عندہ۔

تربیہ السالک کے اس ذخیرہ سے کچھ معتدبہ افادی و استفادی بصیرت حاصل کرنے کے لئے تو ہزار پانچ سو صفحوں کا مطالعہ کرنا اور کچھ عرصہ تک برابر کرتے رہنا نہایت ضروری ہے ۔ خصوصاً اگر حضرت کے سلسلہ کے کسی اچھے تربیت یافتہ بزرگ کی رہنمائی میسر ہو سکے تو سبحان اللہ' اس لئے کہ جس طرح خالی جغرافیوں' سفر ناموں یا کتابی گائیڈوں (رہنماؤں) سے ظاہری و جسمانی سفر کے سارے نشیب و فراز کی بصیرت ہونا دشوار ہے' اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ باطنی و روحانی مسافر کے لئے بلا کسی کا ہاتھ پکڑے ہوئے بے خطر منزل رسی دشوار ہے ۔ باقی اس مجموعہ کی نفس افادی و استفادی نوعیت کا اندازہ کرنے کے لئے سو دو سو صفحات کا پڑھ لینا بھی انشاء اللہ منصف مزاج کے لئے کافی ہو گا' اور ایک سرسری اندازہ کے لئے چند نمونے پیش بھی کئے جاتے ہیں "۔

ایمان کی سلامتی : دین کا سب سے گراں اور انمول سرمایہ ایمان ہے ' لیکن اس دورِ دجل و فتن کی ساری زندگی سب سے زیادہ ایمان ہی کی دشمن ہے ۔ اس کے علوم عقلیہ و فلسفیہ سے بڑھ کر اس کی عام تعلیم و تہذیب' سیاست و حکومت تمدن و معیشت' اخلاق و معاشرت غرض ہر ہر چیز دق کے جراثیم کی طرح اندر ہی اندر اور اکثر غیر شعوری طور پر بے خبری ہی میں ایمان کو ضعیف و مضمحل کرتے کرتے بالآخر فنا یا زندہ درگور کرکے رہتی ہے ۔ بچے کھچے خالص دینی گھرانے اور خالص دینی تعلیم گاہیں تک ان ایمان کش اثرات کی دست برد سے محفوظ نہیں ۔

اسی طرح کا ایک بالکل دینی گھرانے کا پرورش یافتہ اور دینی تعلیم گاہ کا تعلیم یافتہ فرزند دینی تعلیم سے فارغ ہوتے ہوتے ایمان سے عملاً فارغ ہو چکا تھا ۔ پھر کچھ انہیں اثرات کی برکت سے انگریزی پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا' اور مغربی

عقلیات و فلسفیات کے مطالعہ نے دامن پکڑ لیا - پھر کیا تھا' کڑوا کریلا نیم چڑھا! عملی فراغت تو ایمان سے حاصل ہو ہی چکی تھی' اب دعوائے عقلیت و فلسفیت کے کبر و غرور کے ساتھ علمی وساوس و شکوک نے بھی چھاپہ مارا - اور رہے سہے ایمان کو خیر باد کہہ کر تشکیک وارتیابیت یالاادریت کو کمال دانش سمجھ لیا' جو وقت کے عقلائے مغرب کا مقبول عام مذہب تھا - بات یہ ہے کہ عقل اگر کچھ بھی بجا ہے تو عقلی علوم (خصوصًا علوم جدیدہ) کی تحقیقات و دلائل کی راہ سے صریح کفر و انکار کی تو گنجائش نکلتی نہیں - لیکن دعوائے علم و عقل کا کبر و غرور (ا) اپنی کچھ نہ کچھ تشفی چاہتا ہے' اس لئے یہ پڑی عدم دعوئے کا دعوے کرکے بھی ارتیابیت ولاادریت کے مدعی بن جاتے ہیں - جو دراصل کفر و انکار کا محض ایک پردہ ہے - ورنہ نفسیاتی طور پر انسان کسی امر میں بھی خالص شک و تذبذب کے مقام پر قیام کر ہی نہیں سکتا' ذہنی ترازو کا کانٹا کسی نہ کسی ایک جانب قدرۃً جھکا رہتا ہے -

آپ بیتی : عبرت کے لئے عرض ہے کہ یہ سب آپ بیتی ہے - البتہ کم ہمتی کہئے یا عالم دین کہلانے کی شرم کہ باطن کے اس ام الامراض کو ظاہر بہت کم کیا جاتا تھا - اس حال میں بعض خارجی حالات (اور اب یہ اعتقاد ہے) کہ دراصل دین کے سچے اور پکے والدین کی دعاؤں نے بعض بزرگوں کے قدموں تک پہنچایا اور سب کی نظر توجہ نے اپنا اپنا کام فرمایا - لیکن یہاں خصوصیت سے کہنا یہ ہے' کہ راقم ہذا کا یہ مہلک باطنی مرض دراصل عقل و عقلیت ہی کا پیدا کردہ تھا' جس کا مداوا اس عہد کے حکیم الامتہ ہی کے پاس تھا' بلکہ دین کی ساری تاریخ میں عقل و حکمت اور منطق کا عملاً اور اتنا صحیح استعمال شاید ہی کسی اور نے کیا ہو اور

(ا) راقم ہذا نے تجربہ و تحقیق میں علم و عقل کے مدعیوں کے اباو انکار کا اصل منشا کبر وغرور ہی ہوتا ہے - بلکہ سچ یہ ہے کہ ایمان کے مقابلہ میں استدلال کی بنیاد ہی " ابی واستکبر " پر ہے ۱۲

اپنا تو کم و بیش پندرہ سال کا ذاتی تجربہ ہے، کہ گو علوم نقلیہ سے بہت کم مناسبت رہی تاہم نقلیات میں بھی جو شکوک و شبہات اٹھتے تھے وہ بھی زیادہ تر عقلیات ہی کے رنگ و اثر کے ۔ لیکن حضرت علیہ الرحمتہ کی منطق ان کی مسکت ہی نہیں ایسا شافی توڑ فرماتی تھی، کہ جس عمارت کی بنیاد چٹان پر یقین کرتا تھا تو وہ ریت پر کھڑی نکلتی تھی ۔

دولت ایمان کی گمشدگی : اس موقع پر آخر زمانہ کی ایک مکاتبت کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں، جب کہ یکایک عقل نے یہ سوجھایا کہ تو جو یہ سمجھا ہے، کہ ایمان کی گم شدہ دولت تجھ کو ان بزرگوں کی صحبت و صدقہ سے از سر نو واپس مل گئی ہے یہ سراسر خود فریبی ہے ۔ اس سراسیمگی میں پہلا عریضہ حضرت کی خدمت میں یہ تھا کہ

"میں تو حضرت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بالکل ہی ڈوب رہا ہوں اور دستگیری کا سخت محتاج ہوں ۔ کبھی کبھی اپنے ایمان میں شک تو ہوتا ہی رہتا تھا، لیکن اب تو بارہاعدم کا یقین ہونے لگتا ہے ۔ اور کوئی تاویل بن نہیں آتی، خصوصاً ایمان بالآخرت میں کہ کسی وقت بھی آخرت کے عذاب و ثواب کی فکر نہیں معلوم ہوتی، نہ جنت و جہنم کی ترغیبات و ترہیبات کا دل پر مطلق کوئی اثر محسوس ہوتا ہے ۔ پھر آخر یہ کس قسم کا ایمان ہے" ۔ !

"البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ پھر احکام یا اوامر و نواہی کا آخر کیوں خیال رہتا ہے (اب سمجھ میں آتا ہے)

"کہ طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہی ہے کہ جس بات کو اپنے اوپر عائد کر لیتا ہوں اس کے احکام و مقتضیات کو پورا ہی کر دینے کو جی چاہتا ہے ۔ خواہ بے یقینی و بے دلی ہی کے ساتھ ہو ۔ مثلاً اگر کسی سے نہ تو ملنے کا جی چاہتا ہو نہ ملنے کا کوئی نفع ہوتا ہم اگر محض مروۃً یا بے سوچے سمجھے محض زبان ہی سے نکل جائے کہ تم سے ملنے آؤں گا تو پھر بغیر پورا کئے چین نہیں آتا ۔ اور اگر وہ نہیں

ملنا تو خوشی ہوتی ہے کہ چلو وعدہ بھی پورا ہو گیا اور ملنا بھی نہیں پڑا -

"مجھ کو اپنی دینی پابندیاں بھی بظاہر کچھ اسی طرح کی معلوم ہوتی ہیں کہ لوگوں میں دیندار مشہور ہو گیا ہوں یا کسی وجہ سے اپنے اوپر دینداری عائد کر لی ہے' لٰہذا اس کی صورت پوری کر دینے کا جی چاہتا ہے - دوسرے لفظوں میں ایمان و یقین سے خالی ایک منافقانہ دینداری ہے - اور اکثر اپنے نفاق کا وہم نہیں یقین ہوتا رہتا ہے - یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آخرت کا خیال ایک احتمال عقلی کے درجہ میں ہے - اور جو کچھ کرتا ہوں وہ صرف احتمال ضرر کی بناء پر نہ کہ ایقان آخرت کی بنا پر" -

سوچئے تو سہی کہ یہ ساری منطق عقل ہی کی تو تھی جس نے ایمان سے بالکلیہ محرومی کے ایسے مقدمات و نتائج و مرتب کر کے سامنے رکھ دیئے' کہ بظاہر حضرت بھی ایسی حالت میں کیا علاج و تدبیر فرما سکتے ہیں - آگے اس عریضہ میں اتنا اور تھا کہ

"البتہ اتنا ضرور ہے کہ اپنی اس حالت کو پسند نہیں کرتا ہوں (1)' اور دل یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح کامل ایمان و اخلاص حاصل ہوتا' اور روزانہ اس کی دعا بھی کرتا رہتا ہوں - لیکن خواہش و دعا واقعہ تو بہرحال نہیں حضرت اپنے ظاہر و باطن دین و دنیا سب کی طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے .... کسی سے اپنا یہ حال کہتے بھی شرم معلوم ہوتی ہے - حضرت والا تک کہ خدمت میں مہینوں کے ارادہ کے بعد عرض کر رہا ہوں امید ہے کہ دعا اور دوا دونوں سے دستگیری فرمائیں گے" -

---

(۱) اس عبارت کو زیر خط حضرت نے فرمایا جس کی مصلحت آگے آتی ہے ۱۲

لکھنے کو دوا و دعا سب کے لئے لکھ دیا ۔ لیکن مایوسی جس طرح اپنے مرض سے تھی اسی طرح حضرت کی مہارت و حذاقت کے باوصف علاج سے بھی کہ آخر حضرت معدوم کو موجود کیسے کر دیں گے ۔ مگر حضرت کی ایمانی منطق و فراست نے مایوسی کے سارے دروازے بند فرما رکھے تھے ۔ جواب آیا تو بالکل خلاف توقع یعنی بجائے کوئی علاج تجویز فرمانے کے سرے سے مرض ہی کو معدوم و موہوم تجویز فرمایا گیا ۔ حیرت و مسرت کی حد نہ رہی ۔ معلوم ہوا کہ چھنی ہوئی دولت پھر کسی نے لا کر ہاتھ میں رکھ دی ' بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہو گا کہ جس دولت کو مسلوب سمجھ لیا گیا تھا' وہ دراصل صرف محجوب تھی ۔ ع ۔ یار در خانہ و ماگرد جہاں می گردم ۔ ارشاد ہوا کہ

اس دولت کی بازیافت : "خط ہی میں جواب موجود ہے' مگر غور نہیں فرمایا گیا ۔ وہ جواب خط کشیدہ عبارت میں مصرح ہے (یعنی البتہ اتنا ضرور ہے کہ اپنی اس حالت کو پسند نہیں کرتا ہوں) کیونکہ کوئی شخص جو (واقعتاً) خالی عن الایمان ہو' اس خلوعن الایمان کو ناپسند نہیں کرتا' بلکہ اتصاف بالایمان کو ناپسند کرتا ہے' اور متصفین بالایمان سے عداوت رکھتا ہے ۔ بس یہ کافی دلیل ہے ۔

اس کے بعد ظاہری امراض ہی کی طرح باطنی امراض کے بھی ایک اور اصول پر متنبہ فرمایا کہ طبیب یا معالج پر اعتماد ضروری ہے ۔

"اگر اس میں بھی ذہین شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو مریض کو بجائے اپنے فہم پر اعتماد کے طبیب پر اعتماد ضروری ہے ۔ سو اگر اسی ناکارہ کا یہ درجہ سمجھا جاتا ہے تو میری تشخیص کو صحیح سمجھا جائے یا اور کسی ماہر طبیب کو منتخب کیا جائے اور اس کی تقلید جامد اختیار کی جائے" ۔

عجیب مثال : فقدان ایمان کا وسوسہ تو بہرحال موجود ہی تھا' اس کا ازالہ کیسی عجیب و دقیق فراست ایمانی اور نفسیات شناسی کی ایک مثال سے فرمایا گیا کہ

"جس کیفیت کے آثار اپنے اندر محسوس ہوتے ہیں' وہ خلل دراصل قلب
میں نہیں ہے' بلکہ باہر کے وساوس ہیں کہ ان کا عکس قلب میں نظر آتا ہے جیسے
مکھی آئینہ کے اوپر بیٹھی ہوئی ہے اور اندر نظر آتی ہے - پس وہ حالت ہے

عذل العواذل حول قلب التائہ
وھوی الاحبۃ منہ فی سودائہ

اس عجیب و غریب مثال سے ایسی تشفی ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ آئینہ کے اوپر سے بھی مکھی اڑ گئی - مگر "ذہین شیطان" پسپا ہونے پر بھی ابھی مایوس نہیں ہوا اور ایک اعتراض یہ جڑ دیا کہ "کسی بات کا پسند یا ناپسند ہونا اس کے حصول یا عدم حصول کی دلیل کیسے ہے - مثلاً میں بیماری کو ناپسند کرتا ہوں تو کیا بیمار نہیں ہوں - چنانچہ دوسرے ہی عریضہ میں یہ وسوسہ بھی پیش کر دیا اور یہ بھی عرض کیا کہ "اس میں شک نہیں کہ میرا شیطان ذہین ضرور معلوم ہوتا ہے" جواب میں ارشاد فرمایا کہ

آپ کو خائف دیکھ کر ذہین بننے لگا' ورنہ واقع میں انہ لیس لہ سلطان علی الذین امنوا وعلی ربھم یتوکلون وان کید الشیطان کان ضعیفا" -

شیطان یورپین ہے : اور کیا خوب فرمایا کہ "وہ (یعنی شیطان) اس خاصیت میں یورپین ہے" - سبحان اللہ یہ یورپین شناسی بھی فراست ایمانی ہی کی دولت ہے' جو نہ یورپ گردی سے نصیب ہو سکتی ہے اور نہ وہاں کے علوم و فنون کی کتابیں چاٹنے سے آگے اس شیطانی کید کا اصل جواب سنئے کہ یہ

"یہ قیاس مع الفارق ہے - بیماری اضطراری چیز ہے بلا قصد طاری ہوتی ہے اس لئے ناگوار بھی ہوتی ہے اور ایمان و عدم ایمان دونوں اختیاری چیزیں ہیں - اگر کفر کو ناپسند کرے گا تو اس کو اختیار کیوں کرے گا اور بدون اختیار کئے اس

کا تحقق ہی نہ ہو گا"(۱)

شیطان کے مقابلہ میں ارسطو ومل کی منطق کام نہیں دیتی : اس جواب کو پڑھ کر اپنی حماقت پر شرمایا کہ لاحول ولا قوۃ اتنے عرصہ سے حضرت کا یہ اختیاری و غیر اختیاری کا اصول برابر سن اور پڑھ رہا ہوں - پھر بھی اتنی موٹی بات سمجھ میں نہ آئی - واقعی شیطان کی منطق بھی کیسی بودی ہوتی ہے' مگر ثابت ہوا کہ اس بودی منطق سے بھی عہدہ برا ہونے کے لئے ارسطو ومل کی منطق پڑھ لینا بالکل کام نہیں آتا اور حضرت بالکل سچ فرمایا کرتے تھے ۔

یار باید راہ راتنہا مرد
بے قلا وز اندرین صحرا مرد

ضعف اختیار : خود اس مسئلہ اختیار کی نسبت ایک دفعہ آج کل کے لوگوں کے عموماً اپنے خصوصاً قلبی و اعصابی ضعف کی بناء پر یہ خلجان و سوال پیدا ہوا کہ ایسے کمزور قلب و اعصاب والوں کا کیا اختیار بھی کمزور نہیں ہو جاتا' اور اس لئے جن امور کو بظاہر اختیاری خیال کیا جاتا ہے' وہ ان کے لئے سرے سے غیر اختیاری نہیں ہو جاتے - اس سلسلہ کی مکاتبت کو بھی حضرت نے " رسالہ التخفیف فی الاختیار الضعیف " سے موسوم فرما کر بوادرالنوادر (۱) میں شامل فرمایا ہے - راقم السطور کا پہلا عریضہ یہ تھا کہ

"حضرت یہ امور اختیار کا جو مسئلہ ہے' اس کی نسبت اکثر ایک وسوسہ یہ ہوا کرتا ہے خصوصاً اپنے حالات پر نظر کر کے کہ کیا جسمانی امراض خاص کر ضعف

---

(۱) النور رمضان المبارک ۱۱ھ اس سلسلہ کی مکاتبت کا نام حضرت نے اپنے مذاق کے موافق " **اقامتہ البرھان علی سلامتہ الایمان** " تجویز فرما کر اس کو ایک رسالہ کی صورت عطا فرما دی تھی ۱۲

(۱) یہ حضرت کی خاص خاص تحقیقات تجدیدات کا ایک ہزار سے زائد صفحات کا مجموعہ ہے' جو حضرت کے سلسلہ تالیفات کی آخری یادگار ہے - اور جو بہت سے بڑے ہی نادر علوم اور عجیب و غریب مضامین پر مشتمل ہے ۱۲

قلب و دماغ اور مسلسل خلاف طبع حالات کے پیش آتے رہنے سے یہ اختیار بھی ضعیف و مضمحل نہیں ہو جاتا - اور کیا پھر اس حد تک یہ اختیار امور غیر اختیاریہ میں داخل نہیں ہو جاتا ہے -

"نیز ارادہ و اختیار اور نیت میں کیا فرق سمجھوں - مثلاً اگر نماز میں خشوع و خضوع کی ہر وقت نیت رکھتا ہوں اور پھر بھی یہ اس درجہ تک کا حاصل نہیں ہوتا، جس کو حضرت امر اختیاری فرمایا کرتے ہیں ... نیت معتبر ہو گی -

جو اب حضرت نے خلاف معمول بڑا مفصل عطا فرمایا جو بوادر کے قریب دو صفحوں میں منقول ہے - اور طالب و سالک کے لئے بڑے نافع مضامین پر مشتمل ہے ارشاد ہوا کہ

خشوع کی تحقیق : "خشوع لغتہً مطلق سکون ہے، اور شرعاً سکون جوارح جس کی حقیقت ظاہر ہے ' اور سکون قلب ' جس کی حقیقت حرکت فکریہ کا انقطاع ہے - اور جس طرح سکون جوارح کی تکلیف بقدر قدرت ہے - مثلاً صحیح قوی سوی اس پر قادر ہے کہ نماز میں کوئی حرکت نماز کے علاوہ صادر نہ ہونے دے، وہ اس کا مکلف ہو گا - اور جو کسی درد میں مبتلا ہے غلبہ درد کے وقت اس پر قادر نہیں، جب درد اٹھے گا بے چین ہو کر پیچ و تاب کھائے گا، اس لئے وہ اس درجہ سکون کا مکلف نہ ہو گا - البتہ جب درد نہ ہو پھر وہ از سر نو اس سکون کا مکلف ہو گا۔

"اسی طرح سکون قلب کی تکلیف بقدر قدرت ہو گی - مثلاً جو شخص تشویش کے تمام اسباب سے محفوظ ہو، وہ حرکات فکریہ کے کلی انقطاع پر قادر ہے، اس لئے وہ اس کا مکلف ہو گا - اور جو تشویش کے اسباب میں مبتلا ہو، وہ ایسے جمع خاطر پر قادر نہیں، اس لئے وہ اس درجہ کا مکلف بھی نہ ہو گا - البتہ جتنا وقت تشویش سے سکون کا میسر ہو گا، یعنی وہ تشویش متخیلہ پر غالب نہ ہو اس وقت میں اس کا مکلف ہو گا" -

ذہنی و فکری حرکات کے قطع کرنے کی تدبیر: اس اصولی و کلی ارشاد کے بعد خاص طور سے اس کی جزئی تفصیل فرمائی گئی ہے' کہ ذہنی یا فکری حرکات کے قطع کرنے کی تدبیر کیا ہے - ظاہر ہے کہ طبیعت و تعلیم وغیرہ کے اختلاف کی بناء پر کوئی ایک ہی تدبیر سب کے لئے کارگر نہیں ہوسکتی - کس کے لئے کونسی تدبیر کارگر ہو گی اس کی تشخیص کوئی مبصر ہی کر سکتا ہے - خود صاحب معاملہ کو ایسی بصیرت شاذو نادر ہی حاصل ہوتی ہے' اس لئے ارشاد ہوا کہ

"اگر صاحب معاملہ کو ایسی بصیرت نہ ہو کسی مصلح حکیم تجربہ کار سے مشورہ کی حاجت ہے - کیونکہ یہ قطع فکر براہ راست حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کا طریق یہ ہے کہ اپنے قلب کو کسی محمود چیز کی طرف قصداً متوجہ کر دیا جائے' جو وضع صلوۃ کے خلاف نہ ہو - مثلاً ذات حق کی طرف متوجہ رہے اگر اس پر قادر نہ ہو تو یہ تصور کر لے کہ میں کعبہ حسنٰی کی طرف رخ کئے ہوئے ہوں - یا نماز میں جو اذکار و قرات کر رہا ہے اس کی طرف توجہ رکھے کہ میں یہ الفاظ پڑھ رہا ہوں یا ان کے معانی کی طرف توجہ رکھے چونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا - اس لئے یہ توجہ دوسرے خطرات کے آنے سے مانع ہو جائے گی -

"لیکن ہر شخص کی استعداد جدا ہے کسی کے لئے ایک تصور نافع ہے' دوسرے کے لئے دوسرا - بعض اوقات صاحب معاملہ عدم بصیرت و عدم تجربہ کی وجہ سے جس طریق کو اختیار کرتا ہے وہ اس کی طبیعت کے مناسب نہیں ہوتا' اس لئے بار بار کی ناکامی سے مایوس ہو کر اس غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خشوع اختیاری فعل نہیں' اور اس کا اہتمام بالکل چھوڑ بیٹھتا اور اس کی برکت سے محروم رہتا ہے -

"دوسری غلطی اس سے اشد یہ ہوتی ہے کہ تعین کے بعد جس طریق کو

اختیار کیا گیا ہے' اس میں کاوش زیادہ کرنے لگتا ہے' اور اس کا متوقع رہتا ہے کہ دوسرا کوئی خیال سرے سے نہ آنے پائے' اور اس کے لئے طبیعت پر زور ڈالتا ہے حتیٰ کہ نوبت کلال و ملال کی آتی ہے - جس کا نتیجہ وہی یاس - اس لئے کاوش کا ترک کرنا ضروری ہے - بس سرسری و معتدل توجہ کافی ہے - اگر اس توجہ کے ساتھ دوسرا کوئی خطرہ آ جائے وہ غیر اختیاری ہو گا اور مضر نہ ہو گا" -

اس کی مثال : کیسی عجیب و شافی اور حکیمانہ و نفسیاتی دی کہ "جیسے کسی خاص لفظ پر قصدا نظر کی جاوے تو یقینی بات ہے کہ وہ شعاعین بلا قصد دوسرے کلمات پر بھی پہنچ جاتی ہیں' مگر وہ نظر قصدی نہیں ہوتی" - لیکن جب تک بصیرت و تجربہ نہ ہو خالی اصول و کلیات سے کام چلتا نہیں - مثلا خود احقر ہی کو نماز میں حضور و توجہ پیدا کرنے کا سب سے قدرتی سہل و بہتر طریقہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بس جو کچھ پڑھا جائے اس کے معانی و مطالب کو سمجھ سمجھ کر پڑھا جائے - حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی فرمایا کرتے تھے کہ کچھ نہیں' تو ساری نماز میں جس وقت اهدنا الصراط المستقيم زبان سے نکلے تو اسی کے معنی پر توجہ ہو جایا کرے - کوشش کے باوجود اس میں بھی بہت کم کامیابی نصیب ہوتی تھی - آخر حضرت علیہ الرحمتہ ہی کی خدمت میں مکاتبت بالا کے سلسلہ کے دوسرے عریضہ میں عرض کیا کہ

"میں بطور خود تو نماز میں جو کچھ پڑھتا ہوں اس کے معنی پر متوجہ رہنے کی کوشش کرتا ہوں' مگر اس میں کامیابی اتنی کم ہوتی ہے کہ چاہتا ہوں کہ کم از کم جس وقت اهدنا الصراط المستقيم زبان سے ادا ہوتا ہے' اس معنی پر توجہ ہو' مگر اکثر اتنا بھی نہیں ہوتا..... بہرحال اب حضرت جو صورت تجویز فرمائیں - حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنے کی جو صورت حضرت نے لکھی ہے' اس کی کچھ تفصیل

کا محتاج ہوں"

یہ تفصیل و تحقیق قابل ملاحظہ ہے - نفسیات توجہ پر کتابیں پڑھنے اور لکھنے والے بھی ملاحظہ فرمائیں تحریر فرمایا کہ

"اس سوال سے اس لئے دل خوش ہوا کہ ایسا سوال علامت ہے کام کرنے کی اور جو شخص کام کرے گا اس کو یہ سوال پیش آئے گا .... اور خط سابق لکھتے وقت میرا دل چاہتا تھا کہ یہ سوال کیا جائے اور کیا جانے کی امید بھی تھی - اب جواب عرض کرتا ہوں -

"اصل میں جو توجہ خطرات کی قاطع ہے وہ دو قسم کی ہے - ایک مع الخوض اگرچہ اشیاء مختلفہ کی طرف ہو' دوسری شے واحد کی طرف اگرچہ بلاخوض ہو - اب جس شخص کو آیات و اذکار کے معانی بلا خوض کے ذہن میں آ جاتے ہوں' وہاں نہ خوض ہے' نہ جس چیز میں ' فکر سے کام لیا جاتا ہے' وہ شے واحد ہے' اس لئے توجہ کی کوئی قسم نہ پائی گئی' بس وہ قاطع خطرات بھی نہ ہو گی - بخلاف اس شخص کے جس کو سوچنے سے معنی یاد آتے ہیں اس شخص کی توجہ قاطع خطرات ہو گی' اس لئے آپ کو اس تدبیر میں کامیابی نہیں ہوتی کیونکر آپ کو خوض کی حاجت نہیں ہوتی -

"پس ایسے شخص کے لئے دوسری توجہ کی ضرورت ہو گی یعنی شے واحد کی طرف خواہ وہ شے واحد کچھ ہو ذات حق ہو'یا رویت حق للعبد یا نظر الی الکعبہ یا کچھ اور - اور جس توجہ الی الحق کی تفصیل آپ نے دریافت فرمائی ہے' وہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کا اجمالاً تصور رکھے' جس طریق سے بھی بے تکلف ذہن میں آ جائے' زیادہ کاوش کی حاجت نہیں' یا ان کے کسی فعل کا تصور رکھے مثلاً وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں -

شے واحد کی طرف توجہ کا خاص طریقہ: آگے اس شے واحد یا کسی ایک ہی چیز کی طرف توجہ کا وہ خاص طریقہ تحریر فرمایا ہے جو حضرت کا خود تجویز

فرمودہ تھا' جس کی نسبت ارشاد ہے کہ ۔

"توجہ الی الشی الواحد کا ایک طریق میں نے تجویز کیا ہے جو غائت درجہ سہل بھی ہے اور بے حد نافع بھی ثابت ہوا وہ یہ کہ اپنی تمام طاعات صلوٰۃ و تلاوت و ازکار بلکہ مباح افعال میں بھی اس کا تصور رکھے کہ یہ سب عنقریب حق تعالیٰ کے اجلاس میں پیش ہوں گے' تو ان میں کوئی ایسا اختیاری فعل نہ ہو کہ یہ پیشی کے قابل نہ ہو ۔ بس اتنا ہی تصور کافی ہے' ابتداء تو استحضار ضعیف ہو گا مگر ممارست کے بعد اس میں دوام پیدا ہو جائے گا ۔

طالب کی شیخ سے مناسبت کا نفع : حضرت کے ہاں بیعت اور انتخاب شیخ کے متعلق ایک بڑی نافع شرط یہ تھی کہ مرید یا طالب کو مرشد یا شیخ سے مناسبت ہو ۔ اس اعتبار سے اس تجویز کی نسبت ارشاد فرمایا کہ

"چونکہ یہ مجھ کو نافع ہوا اور کئی موقعوں پر آپ کی طبیعت کا تناسب اپنی طبیعت کے ساتھ مشاہدہ کر چکا ہوں ۔ امید ہے کہ آپ کے لئے بھی انشاء اللہ نافع ہو گا ۔ اور اس مبحث کے متعلق جو تنبیہات رقیمہ سابقہ میں عرض کر چکا ہوں' وہ سب اس میں ملحوظ رہیں واللہ الموفق امید ہے کہ سب اجزاء سوال پر بقدر ضرورت کلام ہو چکا ہے ۔ اگر کچھ رہ گیا ہو تو پھر متنبہ فرما دیا جائے فقط "

(۱)۔

"کارپاکان راقیاس از خود مگیر گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر" ۔ گو حضرت علیہ الرحمتہ کے ساتھ یہ تناسب طبیعت "محض شیر" اور "شیر" کے تناسب سے زیادہ نہ تھا تاہم حضرت کی غیر معمولی بصیرت و فراست اور توجہ و شفقت کی برکت سے اس کا بھی یہ اثر تھا کہ اپنے دینی و دنیوی مشکلات اور باطنی امراض میں سے جس کے لئے بھی جو حل یا علاج تجویز فرما دیتے' بالکل تیر بہدف ہوتا ۔ ایک عریضہ میں عرض کیا تھا کہ "حضرت کے ارشادات تو الحمد للہ میرے لئے ہمیشہ اور ہر معاملہ

---

(۱) بوادر النوادر ص ۹۵۷ و ص ۹۵۸ ۔ ۱۲

میں اکسیر ہی ثابت ہوتے ہیں" یہ اور بات ہے کہ دوا و پرہیز کا حق پورا ادا کرنے سے قاصر رہتا یا بہت سے امراض ایسے مزمن و مہلک درجہ تک پہنچ چکے تھے کہ ہلاکت سے بچ جانا ہی حضرت کی میسحائی تھی۔ حضرت کے محب و محبوب حضرت مجذوب (خواجہ عزیز الحسن رحمتہ اللہ علیہ) نے خوب ہی فرمایا ہے کہ۔

ترے محبوب کی یارب شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں

مقبولین و محبوبین کے ساتھ صوری مناسبت و شباہت بھی انشاء اللہ جاذب رحمت و حیلہ مغفرت ہو گی۔

خالی کتاب سے کام نہیں چلتا: اگرچہ کامل طور پر کارگر یا تیر بہدف تجویز و تشخیص تو کسی شیخ کامل یا طبیب حاذق ہی کی ہو سکتی ہے' اور محض اصول و کلیات جان لینے سے یا کتابیں پڑھ لینے سے کام نہیں چلتا۔ سب سے بڑا اور بظاہر سب سے آسان اصول اختیاری و غیر اختیاری کا ہے۔ حتیٰ کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا کہ جب یہ اصول معلوم ہو گیا تو شیخ کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت جو امر اختیاری ہے' اس کو "اپنے اختیار سے توکلاً علی اللہ ہمت کرکے ترک کروں گا۔ اور اگر غیر اختیاری ہے (مثلاً وساوس وغیرہ) تو اس کا مواخذہ نہیں" اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

"اگر کوئی شخص کہے کہ طبی کتابوں میں تمام اغذیہ و ادویہ کے منافی و مضار مصرحاً مذکور ہیں' جن کا مطالعہ کر کے ہر شخص مرض لاحق ہونے سے قبل کامل احتیاط کر سکتا ہے' اور جو کسی اتفاق سے مرض لاحق ہو جائے تو طبی کتابوں میں ہر مرض کی علامات دیکھ کر مرض کی تشخیص اور تدبیرات دیکھ کر مرض کا علاج کر سکتا ہے' پھر طبیب کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سو اس سوال کا جو جواب ہو گا اس ہی سے (امراض نفسانی و باطنی کے) اس سوال کا بھی حل ہو جائے گا"۔

خود اپنا سالہا سال کا تجربہ و تاثر تو احقر نے ایک عریضہ میں یہ عرض کیا تھا کہ

"سالہا سال سے حضرت والا کے قدموں سے تعلق کی سعادت حاصل ہے'
اور پھر ملفوظات و تربیت وغیرہ پڑھتا رہتا ہوں اور خود بھی اپنے امراض و احوال
وغیرہ عرض کرتا رہتا ہوں پھر بھی حضرت کے ہر جواب میں تازہ علم اور تازہ اثر
پاتا ہوں' اور اب تو یہ اعتقاد ہو گیا ہے کہ اگر حضرت کی ساری تصانیف حفظ کر
ڈالوں تب بھی حضرت کی ذات اور اس کی برکات سے استغنا نہیں ہو سکتا" ۔

غرض کوشش تو اس کی ہونی چاہیئے کہ ظاہری بیماریوں کی طرح باطنی بیماریوں کی تشخیص و علاج میں بھی کسی تجربہ کار و ماہر طبیب ہی کو مرجع بنا لے' جس کا تجربہ و مہارت کم از کم خود مریض سے زیادہ ہو - اور اپنے سے اس کو کامل سمجھ کر اعتماد کرے - لیکن اگر اتنا بھی کسی پر اطمینان نہ ہو تو پھر حضرت ہی کے مطب تربیۃ السالک کو مسلسل مطالعہ میں رکھے' جس میں ایک ہی مرض کی مختلف و متعدد تدابیر ملیں گی' ان میں سے اگر ایک سے نفع نہ ہو تو دوسری تیسری وغیرہ سے کام لے انشاء اللہ کوئی نہ کوئی ضرور کارگر ہو گی - مثلاً یہی نماز میں خشوع یا حضور قلب کے لئے اس مطب میں مختلف تجاویز ملیں گی -

نماز میں حضور قلب کی عام تدابیر: سب سے ادنیٰ اور عام یہ کہ جو کچھ نماز میں پڑھے اس کے ایک ایک لفظ کو علم و ارادہ کے ساتھ جان جان کر ادا کرے کہ اب "الحمد" کہہ رہا ہوں اب "للہ" کہہ رہا ہوں' اب "رب العالمین" کہہ رہا ہوں' اسی طرح رکوع و سجود قیام و قعود وغیرہ تمام جسمانی ارکان بھی جان جان کر ادا ہوں کہ اب رکوع میں ہوں' اب سجدہ میں ہوں - دوسرا درجہ یا طریقہ یہ ہے کہ معانی سمجھ سمجھ کر پڑھے - تیسرا طریقہ یہ ہے کہ مختلف آیات و اذکار' ارکان و حرکات کی طرف توجہ کرنے کے بجائے کسی شے واحد کی طرف متوجہ رہے ' خواہ وہ شے واحد ذات حق ہو یا رویت حق یا نظر الی الکعبہ یا کچھ اور ان میں

سے انشاء اللہ کوئی نہ کوئی ضرور نافع ہو گا -

ایک اور تجربہ : راقم احقر کے تجربہ میں بعضوں کے لئے ایک نافع صورت یہ بھی ہے کہ ان سب یا کئی مختلف طریقوں سے کام لے - یعنی کبھی الفاظ پر توجہ رہے - کبھی معنی پر کبھی رویت حق پر وقس علیٰ ہذا - تربیہ السالک وغیرہ میں تو کہیں اس صورت کی تصریح نہیں ملی' نہ حضرت کی حیات میں اس کا خیال آیا کہ خود عرض کرتا - البتہ ایک دفعہ کسی عریضہ میں یا زبانی عرض کیا تھا کہ کامل یکسوئی یا کسی ایک شے پر مسلسل توجہ میسر نہیں ہوتی' تو فرمایا تھا کہ "نہ ہوتی ہے ' نہ ہوگی" - اور فرمایا تھا کہ "ذہن .آدمی کی حرکت فکریہ بالکلیہ منقطع نہیں ہو سکتی ہے" اور احقر کے نزدیک ایک ہی شے پر بھی زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتی - نیز ملال و کلال بھی اس کے باعث ہوتا ہے - لہٰذا ایسے لوگوں کے لئے ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کبھی الفاظ پر توجہ رہے' کبھی معانی پر کبھی ذات حق پر کبھی رویت حق پر کبھی یہ کہ کعبہ سامنے ہے' کبھی یہ کہ مقام ابراہیم میں کھڑا نماز پڑھ رہا ہوں -

نماز میں کسی دوسری طاعات پر توجہ : چونکہ اختیار بھر نماز میں خشوع و حضور قلب مامور و مقصود ہے' اس لئے اس کی کسی قدر تفصیل مناسب محل تھی - ایک اور دقیق سوال اس باب میں یہ ہے کہ دوران نماز میں ایسی چیزوں کی طرف توجہ کا کیا حکم ہو گا' جو اگرچہ بجائے خود طاعت ہیں' لیکن نماز کے اجزاء و ارکان سے بہرحال خارج ہیں -

ایک دفعہ حضرت کی خدمت میں ایک طویل عریضہ قریباً چار صفحے کا تحریر کیا' جس میں زیادہ تر خانگی پریشانیوں کی تفصیل تھی - جواب بھی دو صفحے سے زائد میں مرحمت ہوا - یہاں صرف ابتداء کی چند سطریں جو مقصود سے متعلق ہیں منقول ہیں -

"جس ڈاک میں آپ کا خط تھا مجھ کو آج صبح دس بجے ملی سطحی نظر سے تو اس وقت دیکھ لیا تھا مگر تفصیلی مطالعہ کے لئے فرصت کا منتظر رہا، جو ڈاک پوری کر کے بارہ بجے میسر ہوئی - اس وقت سے عصر کے وقت تک جواب سوچتا رہا اور مختلف مسودات میں محو و اثبات کا سلسلہ جاری رہا - گو وہ سب تدبیرات بجائے خود نافع تھیں اور نافع ہونا ان کا یہی ہے کہ مقلل غم ہیں مزیل غم نہیں - مگر بدرجہ کفایت اس خاصیت کے مرتب ہونے میں کسی تدبیر پر شرح صدر نہ ہوتا تھا - آخر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور عین اقامت عصر کے وقت بے ساختہ قلب پر یہ دو شعر وارد ہوئے -

چنداں کہ گفتیم غم با طبیبان
درماں نہ کردند مسکین غریباں
ما حال دل را با یار گفتیم
نتوان نہفتن درد از طبیبان

اس مکتوب مبارک کا بھی یہ لقب تجویز فرما دیا گیا تھا "سلوۃ الکیئب بصحبۃ الحبیب" اور اسی لقب سے النور (۱) میں شائع ہوا تھا - اب اس کو پڑھ کر دل بھر آیا کہ اللہ اکبر حضرت کو اپنے اس ادنیٰ سے ادنیٰ اور نالائق سے نالائق کفش بردار کے حال پر بھی کتنی شفقت تھی اور "عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رئوف رحیم" کی شان کا کتنا عظیم الشان پر تو تھا - اسی طرح کے ایک اور عریضہ کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ "خط کیا ہے دل کو گھائل کرنے کو نشتر ہے" ایک اور ایسی ہی خانگی پریشانیوں کے عریضہ کے جواب میں یہاں تک تحریر فرمایا کہ "سفر سے معذور نہ ہوتا تو خود آجاتا"-

خیر یہ تو حضرت کا سراپا شفقت مکتوب اس وقت پڑھ کر قلب کی جو کیفیت

---

(۱) ذیقعدہ ۱۳۴۹ھ ص ۷ ۴ - ۱۲

ہوئی وہ اضطراراً قلم سے بھی ٹپک پڑی ۔ کہنا اصل میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ جب حضرت جیسے مبصر و حاذق کو بھی بعض امراض یا مریضوں کے متعلق اتنا غور فرمانا پڑتا تھا تو " بدیگران چہ رسد " یا ایسی حالت میں صرف کتابوں یا اصول و کلیات کے یاد کرنے سے آدمی خود اپنا علاج کہاں تک کر سکتا ہے ۔ حالانکہ حضرت کی بصیرت و حذاقت کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک دن میں تیس تیس چالیس چالیس خطوط کے جواب تحریر فرما دیتے تھے ۔ اور پھر جیسا کہ مکتوب بالا ہی سے معلوم ہو گیا کہ یہ جوابات بلا "کامل شرح صدر" محض قیاس یا اٹکل سے نہیں تحریر فرمائے جاتے تھے ۔

دوسری اصل بات زیر بحث مضمون سے متعلق یہ عرض کرنے کی ہے ، کہ جب حضرت " اقامت صلوٰۃ کے وقت " تک اس عریضہ کے جواب کو سوچتے رہے ، تو قدرۃً و سوسہ ہوتا ہے کہ غالباً نیت باندھنے کے بعد تک کچھ نہ کچھ اس فکر کا سلسلہ رہا ہوگا ، جو گویا تعلیم و تربیت کی ایک دینی خدمت ہی کی فکر اور اس لئے بذات خود بھی طاعت تھی ، لیکن نماز کے اجزاء سے تو بہرحال خارج تھی الحمد اللہ کہ اس کا جواب بھی جلد ہی اور النور (ا) ہی میں کسی اور طالب کے حال میں مل گیا ۔ سوال یہ تھا کہ

ایک طاعت میں دوسری طاعت : کسی طاعت میں غیر طاعت کا تو قصد نہ ہو ، مگر دوسری طاعت کا قصد ہو ، جیسے نماز کی حالت میں قصداً کسی شرعی مسئلہ کا مطالعہ کرنا یا کسی سفر طاعت (مثلاً حج) کا نظام قصداً سوچنا "۔

اب تحقیق ملاحظہ ہو ۔ کہ

" یہ مسئلہ دقیق ہے ۔ قواعد سے اس کے متعلق عرض کرتا ہوں ۔ اس وقت دو حدیثیں میری نظر میں ہیں ایک مرفوع جس میں یہ جز ہے ۔ من صلی رکعتین مقبلا علیھما بقلبہ ۔ دوسری موقوف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول جس میں یہ جزء ہے کہ انی اجھز جیشی و انافی الصلوۃ دونوں روایتوں کے مجموعے

سے اخلاص کے دو درجے مفہوم ہوئے ۔ ایک یہ کہ جس طاعت میں مشغولی ہے ' اس کے غیر کا قصداً استحضار بھی نہ ہو اگرچہ وہ بھی طاعت ہی ہو ۔ دوسرا درجہ یہ کہ دوسری طاعت کا استحضار ہو جائے ۔ اور ان دونوں میں یہ امر مشترک ہے کہ دوسری طاعت کا اس طاعت سے قصد نہیں ہے ۔ مثلاً نماز پڑھنے سے یہ غرض نہیں کہ نماز میں یکسوئی کے ساتھ تجہیز جیش کریں گے ۔

" پس حقیقت اخلاص تو دونوں میں یکساں ہے ۔ اس میں تشکیک (تفاوت) نہیں ۔ عوارض کے سبب دونوں میں تفاوت ہوگیا ہے ۔ ان میں درجہ اول اکمل اور دوسرا درجہ اگر بلا عذر ہے تو غیر اکمل ہے اور اگر عذر سے ہے تو وہ بھی اکمل ہے ۔ جیسے کہ عمرؓ کو ضرورت تھی ' اور اس کا معیار اجتہاد ہے ۔ میرے ذوق میں بصورت عذر خلاف خشوع بھی نہیں اگر ضرورت ہو "۔

زیادہ زور باطنی رذائل و فضائل پر : یوں تو حضرت جامع المجددین کی تمام دینی تجدیدات و اصلاحات کی طرح تربیتہ السالک بھی دینی تربیت کے کم و بیش تمام ابواب و احکام کو جامع و محیط ہے ۔ لیکن سلوک و تصوف کا چونکہ خاص تعلق اصلاح قلب و باطن سے ہے ' اور اس لئے قدرۃً اس میں اعمال و اخلاق باطنہ کے فضائل و رذائل کی تربیت و اصلاح پر زور و توجہ زیادہ ہے ۔ مثلاً صبر و شکر ' خوف و رجا ' تسلیم و رضا و توکل ' شوق و محبت ' صدق و اخلاص وغیرہ ۔ اور رذائل مثلاً کبر و جاہ ریا و نفاق ' عجب و غرور ' بغض و حسد ' بخل و حرص ' حب مال یا حب دنیا وغیرہ ۔

اکبر الرذائل : باطنی رذائل میں اکبر و اشد بلکہ کم و بیش تمام رذائل کی جڑ یا ام الرذائل کبر ہے ' جو ایک اعتبار سے کفر سے بھی اشد ہے اس لئے کہ کفر بھی

دراصل کبر ہی سے پیدا ہوا ہے ۔ خود قرآن مجید کی کثیر آیات اس کی شاہد ہیں مثلاً " قال الذین استکبروا انا بالذی امنتم بہ کافرون " ۔ (ا) ایمان کی دولت استکبار کے ساتھ مشکل ہی سے جمع ہوتی ہے ۔ ایمان وہی لاتے ہیں جن کے دل میں تواضع و تذلل ہو اور استکبار سے پاک ہوں " انمایو من با یاتنا الذین اذا ذکروا بما خرو اسجد اور سجوا بحمد ربھم و ھم لا یستکبرون " ۔ کافر تو کافر شیطان بھی شیطان استکبار ہی کی بدولت بنا " ابی واستکبر و کان من الکافرین " کبر نام ہے " اپنے کو صفات کمال میں دوسرے سے بڑھ کر سمجھنا " یہی اپنی بڑائی کا دعویٰ شیطان کی شیطنت کی بنیاد تھی کہ " انا خیر منہ " (کہ میں تو اس سے بڑھ کر ہوں) حدیث میں تو یہاں تک ہے کہ " جس کے دل میں رائی برابر بھی کبر ہوگا وہ جنت میں نہ داخل ہوگا " ۔ جو دراصل کلام مجید ہی کی ایک آیت کی تفسیر ہے جس میں ہے کہ " میری نشانیوں کو جھٹلانے اور ان کے مقابلہ میں استکبار کرنے والوں کے لئے نہ آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ جنت میں داخل ہوسکیں گے ' یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے " ۔ " ان الذین کذبوا بایاتنا واستکبروا عنها لا تفتح لهم ابواب السماء ولا یدخلون الجنة حتی یلج الجمل فی سم الخیاط "

قبول حق سے سب سے بڑا مانع تکبر ہی ہے : بات یہ ہے کہ جنت تو اہل حق کا مقام ہے اور " قبول حق میں سب سے بڑا مانع بقول حضرت علیہ الرحمتہ کے تکبر ہی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ

> " قبول حق اور رجوع عن الباطل سے بڑا سدراہ یہ امر ہے کہ انسان اپنے کو سب سے بڑا سمجھے ۔ اسی وجہ سے یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے تھے ۔ اگرچہ جانتے تھے کہ آپ پیغمبر برحق ہیں ——— حتی کہ

(ا) متکبرین نے مومنین سے کہا کہ تم جس بات پر ایمان لاتے ہو ہم قطعاً اس کے منکر ہی ہیں ۱۲

مشرکین سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب ہم تمہاری خبر لیں گے جب وہ رسول تشریف لے آئیں گے ۔ فلما جاء ھم ما عرفوا کفروا بہ لیکن جب آپ تشریف لائے تو آپ کے اتباع میں اپنی جاہ کا نقصان ہوتے دیکھ کر آپ کے ساتھ کفر کیا ۔ سمجھے کہ آج تو ہم احبار کہلاتے ہیں مقتدا شمار ہوتے ہیں ' اگر ایمان لے آئیں تو چھوٹے ہو جائیں گے ۔ اسی طرح رؤسا مکہ یہ کہتے تھے کہ لولا انزل ھذا القران علی رجل من القریتین عظیم اگر یہ کلام خدا کا کلام ہوتا تو کسی بڑے شخص پر کیوں نہیں نازل ہوا ۔ ایک یتیم پر کیوں نازل ہوا ۔ پھر آپ کے پاس تمول بھی نہ تھا ' اس لئے رؤساء مکہ کہتے تھے کہ کسی رئیس پر کیوں نازل نہ ہوا ۔ تو ان کو قبول حق سے یہی تکبر مانع تھا ۔

" اور اس کی بڑی مذمت آئی ہے ۔ حدیث میں ہے کہ رائی برابر بڑائی بھی جس کے قلب میں ہوگی وہ جنت میں نہ جائے گا ۔ اور اس مرض سے بہت کم لوگ خالی ہیں کم و بیش سب میں ہوتا ہے ۔ اس تکبر ہی نے شیطان کو جس نے آٹھ لاکھ برس عبادت کی تھی ایک پل میں مردود بنا دیا ------- تکبر ہی کی وجہ سے اس نے حضرت آدم کو سجدہ نہ کیا اور ملعون ہوا " ۔ (الرفیق ص ۸۵ ' ۸۶)

دیگر رذائل تکبر ہی کے انڈے بچے ہیں : تکبر کے علاوہ جتنے چھوٹے بڑے رذائل ہیں ' وہ زیادہ تر تکبر ہی کے انڈے بچے ہیں ۔ مثلاً عجب کیا ہے اپنے کسی کمال کو خدا کی عطاء کے بجائے خود اپنا کمال سمجھنا ۔ ریا کیا ہے لوگوں کی نظر میں اپنی بڑائی چاہنا حب جاہ کیا ہے لوگوں کی تسخیر اور ان سے اپنی تعظیم کا مطالبہ ۔ حب مال کا منشا بھی اکثر اپنی بڑائی کے سامان جمع کرنا ہوتا ہے ۔ حتی کہ بڑا آدمی نام ہی مالدار کا ہوگیا ہے ۔ نفاق کی باتیں بھی آدمی بارہا اپنی شان ہی کے لئے کرتا ہے بغض و حسد کا سبب بھی بیشتر یہی ہوتا ہے کہ اپنے مقابلہ میں دوسرے کی بڑائی نہیں دیکھ سکتے ۔ حرص و بخل کا بھی ایک بڑا منشا یہ ہوتا ہے کہ خود اپنی

شان و شوکت بڑھانے یا قائم رکھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ اندوزی کی فکر میں لگے رہتے ہیں ' اور مواقع خیر میں صرف مال سے دل تنگ ہوتا ہے۔

تصوف تو گویا نام ہی کبریا خودی کو مٹانے کا ہے: حضرات صوفیہ کے ہاں تو اس تکبر کے مٹانے پر اتنا زور ہے کہ تصوف نام ہی ہوگیا ہے اپنے کو مٹانے اور فنا کر دینے کا۔ خود حضرت فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں نے ایک بڑے صاحب علم سے کہا کہ "اس طریق کا حاصل مٹ جانا ہے مگر انہوں نے اس کی کچھ قدر نہ کی" تصوف میں اس مٹنے کی حد یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ جیسے رمزشناس شریعت فرماتے ہیں کہ

"مومن مومن نہیں ہوسکتا جب تک کافر فرنگ سے اپنے کو بدتر نہ سمجھے۔ سائیں توکل شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کو کتے سے بھی بدتر سمجھنا چاہئے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے اس کو توجیہہ میں فرمایا کہ کتے میں اندیشہ بے ایمانی کا نہیں اور مسلمان کو بے ایمانی کا اندیشہ ہے ' اس لئے مسلمان کو چاہئے کہ اس اعتبار سے اپنے کو کتے سے بھی بدتر سمجھے"۔

بات یہ ہے کہ اسلام کی نگاہ میں بدتری و برتری کا مدار انجام پر ہے۔ اور کون کسی کافر فرنگ یا کتے کے مقابلہ میں بھی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ میرا انجام اس سے بہتر ہوگا۔ سر آمد صوفیہ حضرت عارف رومی فرماتے ہیں کہ

ہیچ کافر رانجواری منگرید
کہ مسلمان بودنش باشد امید

"حقیقت میں زندگی ختم ہونے تک انسان کو کچھ حق نہیں اپنے کو اچھا سمجھنے کا۔ رات دن تبدیل و تغیر ہوتی رہتی ہے کہ کوئی آج عابد و زاہد ہے کل شیطان ہو جاتا ہے۔ کوئی آج مسلمان ہے ' کل کافر ہو جاتا ہے ' کوئی آج کافر ہے ' کل مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس لئے زندگی میں اپنے کو کسی سے اچھا سمجھنے کا حق نہیں۔ ہاں مرنے کے بعد اگر اسلام پر خاتمہ ہوگیا ' تو جو کچھ چاہئے سمجھ

لینا ' اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

گہہ رشک برد فرشتہ بر پاکی ما
گہہ خندہ زند دیو زنا پاکی ما
ایمان چو سلامت بہ لب گور برم
احسنت برین چستی و چالاکی ما

واقعی کبر سے بڑھ کر کوئی دینی و اخلاقی بیماری نہیں ۔ غور کرو تو دنیا میں ساری خرابیاں و فسادات خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی سب بواسطہ یا بلا واسطہ اسی بڑائی کا نتیجہ ہیں ۔ اور اس بڑائی یا کبر کا علاج دین و یوم دین یا انجام و آخرت پر نظر ہونے کے سوا کوئی اور قطعاً نہیں ۔ اس معاملہ میں حق یہ ہے کہ حضرات صوفیہ کا مذاق بڑا دقیق و عمیق ہے ۔ اور ان کا مذاق پیدا کئے بغیر خالی کتابی علم و دین سے بھی یہ مرض ہرگز دفع نہیں ہوسکتا ۔ خود حضرت علیہ الرحمتہ کا ایک جواب اسی مذاق کا کیسا عجیب ہے فرماتے ہیں کہ

" ایک شخص نے مجھ سے دریافت کیا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے ۔ میں نے جواب دیا کہ مرنے کے بعد قبر میں جائز ہے ۔ جب یہ اطمینان ہو جائے کہ ہماری حالت یزید سے اچھی ہے ۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آج اس پر لعنت کریں اور کل ہماری حالت اس سے بھی بدتر ہو تو یزید کہے گا کہ سبحان اللہ آپ دنیا میں کس سر خروئی کی بناء پر مجھ پر لعنت کیا کرتے تھے ۔ اب گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو ۔ کسی کو کانا وہ کہے جس کو اپنے اندھے ہونے کا اندیشہ نہ ہو ۔ اگر یزید برا تھا تو اس کا کیا اطمینان کہ ہم اس سے اچھے رہیں گے " ۔

حد اس باب میں بزرگوں کے مذاق کی یہ ہے کہ

" حضرت رابعہ بصریہ شیطان پر بھی لعنت نہ کرتی تھیں اور فرماتی تھیں کہ جس قدر وقت لعنت میں صرف کیا جائے اس سے بہتر یہ ہے کہ یہ وقت ذکر محبوب ہی میں صرف کیا جائے ۔ ہر چند کہ شیطان پر تبرا جائز ہے ' مگر بزرگ

اس کے درپے نہیں ہوتے ۔ کیونکہ مرنے تک اپنا ہی کچھ پتہ نہیں پھر ضروری ہی کام میں نہ لگے ' جیسا کہ حضرت رابعہ نے فرمایا ۔ اس لئے اپنے کو اچھا سمجھنے کا کسی کو حق نہیں " (۱)

اور یہ ان حضرات کی کوئی مصنوعی تواضع یا نرا قال نہیں سراپا حال ہے ۔ اساطین و اکابر تک کا یہ رنگ کہ

" حضرت ذوالنون مصری سے لوگوں نے قحط کی شکایت کی ۔ فرمایا کہ قحط کے دور ہونے کی سوا اس کے کوئی تدبیر نہیں کہ مجھ کو شہر سے نکال دو ۔ کیونکہ میرے گناہوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں مبتلا ہو رہے ہیں ۔ اور یہی نہیں کہ محض زبان سے کہنے سے بس کیا بلکہ شہر کو چھوڑ کر چلے گئے " ۔

اسی طرح حضرت علیہ الرحمتہ نے حال کے کسی بزرگ کی حکایت نقل فرمائی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ جب ریل میں بیٹھتا ہوں تو خدا تعالی سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میرے گناہوں کے سبب یہ لوگ ہلاک نہ ہوں ۔ ان دونوں حکایتوں کی نقل کے بعد حضرت فرماتے ہیں کہ

بزرگوں نے اس مرض کا زیادہ علاج فرمایا ہے : یہی امراض ہیں جن کا بزرگوں نے علاج کیا ہے ۔

یکے آنکہ بر غیربدبین مباش
دوم آنکہ برخویش خودبین مباش

" اس کے برخلاف ہمارا رات دن سبق یہی ہے کہ ہم ایسے ہم ویسے اور دوسرا ایسا اور ویسا ۔ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اے عزیز تیری ایسی مثال ہے کہ تیرے بدن پر سانپ بچھو لپٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے شخص کے بدن پر ایک مکھی بیٹھی ہے تو اس کو مکھی بیٹھنے پر ملامت کر رہا ہے لیکن اپنے

---

(۱) سلوۃ الحزین ص ۲۴ ' ۲۳ ۔ ۱۲

سانپ بچھوؤں کی خبر نہیں --------

"حالانکہ یہ دونوں مستقل عیب ہیں ۔ کیونکہ اپنے عیبوں کو نہ دیکھنا یہ بھی گناہ ہے اور دوسرے کے عیبوں کو بے ضرورت دیکھنا یہ بھی گناہ ہے اور بے ضرورت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی ضرورت شرعی نہ ہو (۱) " ۔ جیسے مثلاً اصلاح کے لئے والدین استاد و مرشد کا اپنی اولاد شاگردوں اور مریدوں کی کوتاہی پر نظر رکھنا بلکہ ہر راعی یا نگران کا اپنی رعیت یا زیر نگرانوں پر نظر رکھنا لازم ہے ' ورنہ باز پرس ہوگی کلکم راع و کلکم مسئول عن راعیتہ

فرعونیت : یہی نسبتہ محدود انفرادی کبر و جاہ طلبی جب حکومت طلبی و ملک گیری کا لباس پہن لیتی ہے ' اور بندہ فرعون بن کر خدائی کا دعویٰ اور انا ربکم الا علی کا نعرہ مارنے لگتا ہے ' تو خدا کی زمین پر بندہ کی اس علو طلبی (۲) کی بدولت شخصی و انفرادی کبر کا محدود فساد پھیل کر ملک کے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ۔ پھر یہ شخصی فرعونیت حب قومی یا جمہوری فرعونیت کے بھیس میں سر اٹھاتی ہے تو ساری قوم اور جمہوریت کا ایک ایک فرد فرعون بے سامان بن جاتا ہے اور سارا کرہ ارض شر و فساد سے بھر جاتا ہے ' جیسا کہ آج کل ہر آنکھ والا دیکھ رہا ہے ۔ شخصی حکومت میں تو دراصل ایک ہی بڑے فرعون یا اس کے معدودے چند حاشیہ نشینوں اور عہدہ داروں کی گنجائش ہوتی ہے ۔ پھر اس شخصی فرعونیت کے دعویٰ و بقا کے لئے بڑے بڑے فوجی و عسکری سازوسامان اور خدم و حشم کی ضرورت ہوتی تھی ۔

---

(۱) الرفیق ص ۱۴' ۱۳ - ۱۲

(۱) ان فرعون علا فی الارض -------- انہ کان من المفسدین (قصص) تلک الدار الاخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا ۔ ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ فساد فی الارض کبر و علو طلبی کا لازمی نتیجہ ہے ۱۲

جمہوری فرعونیت: بخلاف آج کل کی لادینی جمہوریت و عوامیت کی گوناگوں صورتوں کے کہ ان کے اندر ہر ہر فرد حکومت و فرعونیت کا دعویدار اپنے کو سمجھتا اور سمجھایا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس دعوے کے اثبات کے لیے فوجی قوت کے بجائے زیادہ تر زبان و قلم کی (اڈیٹرانہ و لیڈرانہ) چرب زبانی و سخن سازی یا محض مکر اور فریب کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے جس میں اس کی کچھ بھی تھوڑی بہت صلاحیت ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی سیاسی و معاشی دعویٰ و دعوت (آئیڈیالوجی) کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور زبان و قلم کی شتر بے مہار آزادی کے زور سے عوام کالانعام کی کسی بھیڑ (اکثریت) کو ہمنوا بنا کر حکومت پر قابض ہو جاتا ہے۔ پھر عوام فریبی کے میدان کا اس سے بڑا کوئی پہلوان اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور سرشاری کی طاقت سے حریف کو نیچا دکھلا کر اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ یہ سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا اور احمق عوام کا کام فٹ بال بن کر ان بے سروسامان فرعون یا لیڈروں کی صرف ٹھوکریں کھاتے رہنا رہ گیا ہے۔

ابھی اسی ہفتہ اخبار (پانیر ۸ دسمبر ۱۹۴۷ء) میں پڑھا کہ اس جنگ عالمگیر کے بعد فرانس میں، جب سے وہ جرمنی کے پنجے سے چھوٹا ہے، اب تک دو سال کے اندر اندر نو حکومتیں بدل چکی ہیں"! اعلاء کلمتہ الحق کی جگہ اس اعلاء کلمتہ النفس کا نتیجہ اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے!

علو فی الارض کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہے: جب انسان اپنے اوپر نہ کوئی خدائی طاقت اور خدا ساختہ نظام حکومت تسلیم کرتا ہو، نہ اپنے فتنہ و فساد کی جوابدہی کے لئے کوئی آخرت اس کے سامنے ہو، تو اس کا بالکل منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہر ہر ملک اور ہر ملک کا ہر ہر طبقہ و جماعت اور ہر ہر طبقہ و جماعت کا ہر ہر فرد اپنی عقل و دانش کے موافق خود ساختہ اصول و نظام کے لئے علوم فی

الارض کے بلند سے بلند مقام کا مدعی بن سکے ' اور اس محدود زمین اور اس کے محدود جاہ و مال میں اس علو فی الارض کے مدعی جتنے زیادہ ہوتے جائیں گے اتنا ہی فساد فی الارض زیادہ ہوتا جائے گا ۔

غرض انفرادی و اجتماعی چھوٹے اور بڑے جس شر و فتنہ کو بھی تحلیل اور کرید کرکے دیکھو زیادہ تر کسی نہ کسی صورت میں اندر سے اس ترفع و تعلی یا استکبار اور علوء فی الارض کے جذبہ کے طلب کو کار فرما پاؤ گے ۔

اس اکبر الرذائل کا ایک ہی علاج : اس کو مٹانے یا اس پر قابو پانے کی فقط ایک ہی راہ ہے 'کہ بندہ کی نظر اپنے عجز و عبدیت اور خدا کی کبریائی و عظمت پر ہو یعنی بندہ بندہ رہے خدا نہ بنے ۔ اور ایک بندہ دوسرے بندہ کو اپنے کسی اصول و دعوت (آئیڈیالوجی) یا امر و حکم کا بندہ سمجھنے اور بنانے کا خیال نہ کرے ' سہارا زور خود اپنے کو بندہ بنانے پر ہو ۔ جس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اپنے کسی ہنر و کمال کو خود اپنا نہیں خدا کا عطا کردہ سمجھا جائے ۔ اور بطور امانت کے اصل مالک و معطی کے حکم و مرضی کے مطابق استعمال کیا جائے ۔ دوسرے فوز و فلاح کامیابی و کامرانی کا معیار یہ دنیا نہیں بلکہ اس دنیا کی زندگی و عمل کا انجام یا آخرت ہو ۔ انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے تکبر و ترفع کے یہی دو اصولی علاج (۱) ہیں ' جن کی تفصیل و تفہیم حضرت مجدد وقت کی تعلیم و تربیت میں مختلف ولنشین عنوانوں اور مثالوں سے ملتی ہے ۔

اور خدا کے سامنے اپنی خودی کو مٹانا اور فنا کرنا یہی سارے تصوف کی جان اور اکابر صوفیہ کی تعلیم کا نچوڑ ہے ۔ صوفیانہ وحدۃ الوجود نرا فلسفہ نہیں ' اس کا بھی بڑا مفاد یہی ہے کہ جب ہمارا وجود تک ہمارا نہیں تو ہمارے صفات و کمالات

---

(۱) علاج الکبر کے نام سے حضرت کا پورا وعظ بھی ہے ۱۲

ہمارے کیا ہوتے ۔ لہٰذا جب اپنا کچھ ہے ہی نہیں تو پھر مانگے کی یا پرائی چیز پر اکڑنا حماقت و سفاہت کے سوا کیا ہے! اور یہ مانگے کا وجود یا ہستی بھی ایسی نام کی ہستی ہے کہ اگر ہستی حق کی کبریائی و عظمت پر نظر ہو، تو یہ نظر تک نہیں آسکتی ۔ اور ہونا نہ ہونے کے برابر معلوم ہوتا ہے ۔۔۔۔

همہ ہرچہ ہستند ازان کمتر اند
کہ باہستیش نام ہستی برند

حضرت علیہ الرحمہ اکثر اس کمترین اور نام کی ہستی کو ایک معمول مثال سے سمجھایا کرتے ہیں کہ

"تحصیلدار اس وقت تحصیلدار ہے کہ گورنر کے سامنے نہ ہو، لیکن اس کے سامنے آتے ہی اس کی تحصیلداری ہیچ ہے ۔ حتیٰ کہ اگر گورنر کے سامنے اس کو کوئی حضور کہہ دے تو عرق عرق ہو جائے گا ۔ بس یہی حالت وحدۃ الوجود کی ہے ۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ جس وقت حضور خداوندی ہوتا ہے، اپنی تعظیم سے بلکہ اپنے کو موجود کہنے سے بھی شرم آتی ہے ۔ اور جس قدر حضور میں ترقی ہوگی، اس کیفیت میں ترقی ہوتی جائے گی"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تواضع: آپ سے بڑھ کر یہ حضوری کس کو حاصل ہوگی ۔ پھر دنیا و دین کا بادشاہ ہونے کے باوجود

"کبھی آپ نے اپنے لئے کوئی ممتاز جگہ تک نہ بنائی ۔ لوگ زیارت کو آتے تو صحابہ سے دریافت کرتے کہ تم میں محمدؐ کون ہیں؟ صحابہ جواب دیتے کہ یہ جو گورے گورے سہارا لگائے بیٹھے ہیں ۔ اور سہارا لگانے کا مطلب کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضور گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھتے تھے ۔ عربی محاروں میں ہاتھ پر سہارا کو بھی اتکا کہتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ چلنے میں حالت یہ تھی کہ ہمیشہ سب کے ساتھ ملے جلے چلتے ۔ آخر کیا وجہ تھی کہ باوجود یکہ آپ کی شان یہ تھی کہ ع "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔ بات یہ تھی کہ حضور کو ذات باری کی عظمت ہمیشہ

پیش نظر تھی ۔ غرض آپ کے کسی انداز سے امتیاز اور بڑائی کی شان نمایاں نہ ہوتی "۔

کھانے تک میں شان عبدیت کے غلبہ کا حال یہ تھا کہ فرماتے ہیں کہ

" انی اکل کما یاکل العبد " کہ میں غلام کی طرح کھاتا ہوں ۔ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے ۔ صاحبو یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ۔ اس کی قدر جب ہوگی کہ جب اپنے اوپر یہ کیفیت غالب ہو ۔ اور یہی راز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کھانا کھانے میں کوئی لقمہ گر جائے تو مٹی صاف کرکے کھا لو ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھانا جلدی جلدی تناول فرمایا کرتے ۔ آج اس کو سخت عیب سمجھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس طرح کھاتا ہے کہ گویا اس کو کھانے کو نہیں ملا ۔ وجہ یہ ہے کہ جو چیز حضور کو پیش نظر تھی ہم اس سے محروم ہیں ۔ صاحبو میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی والی ملک کسی معمولی آدمی کو بلا کر حلوہ کھانے کو دے اور کہے میرے سامنے بیٹھ کر کھاؤ تو غور کیجئے کہ یہ شخص کس طرح کھائے گا ۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہر لقمہ کا یہ انداز ہو گا جس سے معلوم ہوگا کہ بڑی رغبت اور شوق سے کھا رہا ہے ۔ اور یہی انداز اس وقت محبوب ہوگا ۔ اس کو طمع کہنا ہرگز درست نہیں اور اگر یہ طمع ہی ہے تو سمجھ لو کہ

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین
خاک بہ فرق قناعت بعد ازیں

اور اگر کھانے کے وقت کوئی لقمہ اتفاق سے اس کے ہاتھ سے گر جائے تو یہ کیا کرے گا ' ظاہر ہے کہ اس کو اٹھائے گا اور صاف کرکے کھا جائے گا علی ہذا یہ بھی سوچو کہ بادشاہ کے سامنے کس انداز سے بیٹھ کر کھائے گا ۔ اپنے گھر کی طرح نہیں ' بلکہ نہایت ادب سے بیٹھ کر کھائے گا " ۔ (الرفیق ص ۵۲ ' ۵۱)

حصول حضوری یہی احسانی تصوف ہے : اسی حضور کا حاصل کرنا تو وہ خالص اسلامی یا احسانی تصوف ہے ۔ جس کو حدیث میں اس طرح تعبیر فرمایا گیا ہے کہ خدا کی بندگی اس طرح بجا لاؤ کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے (یعنی وہ تمہارے سامنے ہے) کیونکہ اگر تم اس کو نہ بھی دیکھ رہے ہو تو وہ بہرحال تم کو دیکھ رہا ہے (یعنی تم تو بہرحال اس کے سامنے یا اس کی حضوری مین ہو) اس حضور کا حاصل کرنا ہی صوفیہ کے سارے اشغال و مراقبات کا مقصود اعظم ہے ۔ اور حضرات صوفیہ کے تذکرے اس حضور کے ذکر سے بھرے ہیں ۔ خود حضرت اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ اس قدر حضور کا غلبہ تھا کہ مارے ادب و ہیبت کے پاؤ پھیلا کر لیٹ نہیں سکتے تھے

ظاہری تواضع بھی علاج کبر ہے : اس کے علاوہ ظاہر و قالب کے افعال اور ہیئت کا اثر باطن و قلب پر پڑنا ایک معمولی تجربہ اور نفسیات کا مسئلہ ہے ۔

"حضور نے کھانے کے آداب کی جو تعلیم فرمائی ہے ' اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح باطنی حالات کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے ' اسی طرح ظاہری ہیئت کا اثر بھی انسان کی اندرونی حالت تک پہنچتا ہے ۔ اگر ظاہری ہیئت پر رعونت و تکبر برستا ہے تو دل تک اس کا چھینٹا ضرور پہنچے گا ۔ اور اگر ظاہری حالت منکسرانہ ہو تو دل میں بھی انکساری و خشوع و تذلل کے آثار نمایاں ہوں گے" ۔ (الرفیق ص ۵۳)

غرض کبر و رعونت کی بیماری کو دور کرنے کی اصل تدبیر و علاج یہی دو چیزیں ہیں ایک تو حضرت حق کی عظمت کو پیش نظر رکھنا دوسرے ظاہری حالت و ہیئت کو اختیار بھر منکسرانہ رکھنا جیسا کہ علاج الکبر نام کے وعظ میں فرمایا ' اور تربیتہ السالک میں اس کی جا بجا ہدایات ملتی ہیں ۔ مثلاً کسی صاحب نے عرض کیا کہ

"کمترین میں کبر ہے اس کا علاج وعظ علاج الکبر سے معلوم ہوا کہ عظمت

حق سبحانہ کو پیش نظر رکھے اور کبریائی کے حضرت باری عزاسمہ کے لئے خاص ہونے کو مستحضر رکھے ۔ اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ آیا جس موقع پر کبر کا اندیشہ ہو جب ہی استحضار کیا کروں یا روزانہ کوئی معین مقدار مقرر کرلوں " ۔

جواب میں تحریر فرمایا کہ جس وقت کبر کا اندیشہ ہو ۔

" اس وقت تو ضرور ضرور (نیز روزانہ استحضار کی کوئی مقدار معین کرلینا) اور بھی بہتر ہے اور اس کے ساتھ علاج ہی کا یہ جزء بھی ہے کہ قصدًا ایسے فعل اختیار کرو جو عرفًا موجب ذلت سمجھے جاتے ہیں ۔ بدون اس کے دوسرے علاج ناکافی ہیں " ۔ (بتویب تربیتہ السالک ص ۳۳۶)

عرفی تذلیل سے علاج کبر : اس لئے کبر کے مریضوں سے اکثر بزرگ ایسے کام لیتے ہیں جو ان کی عرفی و ظاہری شان و مرتبہ کے منافی ہوتے ہیں اسی بتویب تربیتہ السالک میں چار صفحے اوپر (ص ۳۳۲) کسی ایسے ہی اصلاح طلب مریض کو تحریر فرمایا ہے کہ

" اگر پاخانہ اٹھواؤں تو پاخانہ اٹھانا ہوگا ۔ اگر برسربازار جوتیوں سے پٹواؤں تو اس کو بھی گوارا کرنا ہوگا اگر مسجد کی نالی صاف کرنا بدھنے بھرنا ، جوتیاں سیدھی کرنا سپرد کروں تو یہ سب کچھ کرنا ہوگا ۔ غرض پہلے اتنی ہمت کرلیجئے پھر کہیں اصلاح کا نام لیجئے "۔

یہ علاج صوفیہ کی ایجاد نہیں بلکہ ماثور ہے : اور یہ طریق علاج و اصلاح کچھ حضرات علیہ الرحمہ یا اسلاف صوفیہ کی ایجاد نہیں ، صحابہ اور وہ بھی حضرت عمرؓ جیسے صحابی پھر وہ بھی زمانہ خلافت کی شاہی بلکہ شاہنشاہی کے فاروق اعظم ، جن کی عظمت سے قیصر و کسریٰ کانپتے تھے اپنے مجض وسوسہ کبر کا علاج یہی تو فرمایا تھا کہ

" مشکیزے میں پانی لے کر بھرتے پھرتے تھے ۔ پوچھا گیا تو فرمایا کہ ایک شخص نے آکر تعریف کردی تھی ۔ میں نے غور کر کے دیکھا کہ نفس اس سے خوش ہوا ، اس لئے اس کا علاج کر رہا ہوں " ۔ (الرفیق ص ۴۲)

لادینی جمہوریت و مساوات کے مدعیوں کا کبر: یہ الٰہی خلافت یا دینی حکومت و جمہوریہ کے اس خلیفہ (یا پریسیڈنٹ) کی تواضع کسر نفسی اور ستائش بیزاری کی شان تھی، جو وسعت ملک و ملک گیری کے اعتبار سے شاہ بلکہ شہنشاہ وقت تھا۔ اس کا مقابلہ ذرا آج کل کی لادینی جمہوریت و اشتراکیت والے بڑے بڑے صدور و اراکین و قائدین کی ستائش پسندی ہی نہیں خود ستائی سے کرو کہ حصول جاہ و منصب کے لئے اپنے مناقب و فضائل کے کیسے طویل و عریض جھوٹ سچ ستائش نامے (مینیفسٹو) شائع فرماتے ہیں، اور ستائش پسندی کا تو یہ عالم کہ شہر شہر اور ضلع ضلع کی بلدیات تک سے اپنے منقبت نامے (ایڈریس) وصول کرنا گویا ان کا پیدائشی حق ہے۔ باقی ان کے رہنے سہنے کے بنگلے اور فرنیچر، کھانے پینے کے لنچ اور ڈنر۔ دورہ و سفر کی شان اور موٹر۔ ملنے جلنے میں ترفع و تفوق، بات چیت میں تعلی و تکبر غرض زندگی کی ہر ادا سے آرائش و نمائش، نفسانیت و رعونت امتیاز و افتخار کا جو مظاہرہ ان عوام (ماسس) کے مقابلہ میں دن رات ہوتا رہتا ہے جن کے درد و غم میں دن رات گھلنے اور جن کے ساتھ انصاف و مساوات کا اٹھتے بیٹھتے وظیفہ پڑھا جاتا، اس کا مشاہدہ ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے ہے اس نام نہاد جمہوریت کا ادنیٰ سے ادنیٰ محرر و چپراسی تک عوام کے مقابلہ میں اپنی شان امتیاز کا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہتا۔!

دینی مساوات و جمہوریت کا نقشہ گھر باہر: خیر یہ تو خلیفہ کی نفس کشی و انکسار کا حال گھر یا دارالخلافہ میں تھا، کہ معمولی ستائش تک پر نفس کو ایسی سرزنش تھی۔ باقی باہر نکلنے میں تو معمولی آدمی بھی کچھ نہ کچھ اپنے مرتبہ و مقام کا لحاظ رکھتا ہے، لیکن دیکھو دینی حکومت کا خلیفہ (پریسیڈنٹ) گھر کی طرح باہر بھی کبر و امتیاز کے ادنیٰ شائبہ تک سے کس طرح دور و نفور ہے۔ بیت المقدس فتح نہیں ہو رہا تھا لشکر اسلام کی طرف سے حضرت عمرؓ کی خدمت میں درخواست آئی کہ خود امیرالمومنین کے تشریف لانے کی ضرورت ہے۔

" اب غور فرمائیے کہ ایک ایسے شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے ہرقل اور کسریٰ بھی تھراتے تھے ۔ مگر حالت یہ تھی کہ جس قمیص میں سفر کیا اس میں چند درچند پیوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ ' جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام ۔ آج کل ادنیٰ سے ڈپٹی کے دورہ میں بھی بڑا سامان ہوتا ہے ۔ رعایا پریشان ہوتی ہے اس کو رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے ۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہ ہوئی ۔ کیونکہ ایک تھیلے میں ستو ساتھ تھے اور ایک میں چھوہارے ۔ منزل پراتر کر ستو گھول کی پی لیتے اور چھوہارے کھاتے رعایا سے نہ مرغ نہ انڈے نہ گھی ۔

حقیقی عزت اسلام ہی سے ہے : " جب اس شان سے کبھی پیدل کبھی سوار آپ شام کے قریب پہنچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا آپ نے ممانعت کردی صرف خاص خاص حضرات نے استقبال کیا اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ آپ دشمن کے ملک میں ہیں اس لئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قمیص اتار کر دوسرا قمیص پہن لیں اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوجائیے تاکہ دشمن کی نظر میں عزت ہو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم وہ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام) ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں بلکہ خدا کی اطاعت سے ہے ۔

" مگر صحابہ کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے درخواست منظور کرلی ۔ چنانچہ ایک عمدہ قمیص پہن کر گھوڑے پر سوار ہوئے دو ہی چار قدم چلے تھے کہ فوراً اتر پڑے اور فرمایا کہ دوستو تم نے اپنے بھائی کو ہلاک کرنا چاہا تھا ' واللہ میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ' تم میرا وہی پیوند لگا قمیص لے آؤ ۔ میں اسی لباس میں اور اپنے اونٹ ہی پر چلوں گا "۔

آج کل تقویٰ و تواضع کے حق میں ظاہری وضع لباس کی اس اہمیت کو اچھے اچھے اہل علم اور اہل تقویٰ محسوس نہیں فرماتے ۔ نہ بڑے بڑے عربی ودینی

مدارس کے ذمہ دار نگران اس باب میں اپنی ذمہ داری کو محسوس فرماتے ہیں۔
حالانکہ جیسا کہ حضرت مجدد وقت نے اس واقعہ کو نقل کرکے فرمایا کہ
جب (حضرت عمرؓ) ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑتا ہے، تو ہمارا کیا منہ کہ ہم کہیں کہ ہمارا دل نہ بگڑے گا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں اور ہم کو کس چیز نے مطمئن کر دیا کہ ہمارے لئے کوئی لباس مضر نہیں۔"

لا دینی جمہوریت کی فرعونیت: یہ تو اسلامی اور دینی جمہوریت کے سب سے بڑے خلیفہ کی گھر باہر اپنے پرائے اور دشمنوں تک کے سامنے تواضع و نفس کشی کی شان تھی اب ذرا اس کے مقابلہ میں آج کل کی لا دینی جمہوریت کے علمبردار فراعنہ کے نقال چھوٹے بڑے فرعونوں کی فرعونیت و رعونت، تکبر و نفس پروری کے ساز و سامان کا ایک ادنیٰ سا تازہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اسی ہفتہ ۱۵ اگست ۴۷ء کو ہندوستان کی نومولود جمہوریت نے جنم لیا ہے اور ۲۱ اگست ۴۷ء (پانیر) میں یہ خبر چھپی ہے کہ روس میں اس جمہوریہ کی سفارت فرمائی پر جو ہندی خاتون مقرر ہوئی ہیں انھوں نے اپنے سفارت خانہ کی آراستگی کے لئے فاقہ کش ہندوستان کے خزانے سے ۲۵ ہزار پاؤنڈ کا مطالبہ فرمایا ہے۔ یعنی لاکھ روپیہ کا۔ اور یہ سامان آرائش و نمائش سو دیشی نہیں بلکہ "سویڈشی" یعنی سوئزرلینڈ کا ساختہ ہونا چاہئے اس کے علاوہ چالیس ہزار کے ایرانی قالین بھی طلب فرمائے گئے ہیں اس سے بڑھ چڑھ کر اس جمہوریہ کے ایک مولانا وزیر کی نسبت یہ خبر پڑھ کر سر غیرت و ندامت سے جھک گیا کہ انھوں نے کسی "مسز" کے انتخاب کے موافق اپنی نئی قیام گاہ کے لئے ۲۵ ہزار کے فرنیچر کا مطالبہ فرمایا ہے، ساتھ ہی یہ خبر بھی درج ہے کہ حکومت کے ذخیرہ میں ماڈرن فرنیچر بافراط موجود ہے، مولانا کو انتخاب کی آزادی حاصل ہے۔ اس پر بھی مولانا نے اپنی نئی قیام گاہ میں اس وقت تک رونق بخشی سے انکار فرما دیا، جب تک ان "مسز" کے مجوزہ و پسندیدہ

نقشہ کے مطابق اس کو آراستہ نہ کر دیا جائے!

ان خبروں کو پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور اس سے زیادہ غصہ کہ ہندوستان دنیا کا سب سے زیادہ مفلس ملک قرار دیا جاتا ہے۔ مگر اس کے چالیس کروڑ ننگے بھوکے "عوام کے لئے عوام کی حکومت" یا آزادی و جمہوریت کے وزراء و سفراء کے ترفع و کبریائی کے یہ ابتدائی تحفے ہیں۔ "آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا"۔

خود نمائی کی بنیاد خدا فراموشی: غرض انفرادی رعونت ہو یا سیاسی فرعونیت ہر قسم کی خود نمائی کی بنیاد خدا فراموشی ہے۔ ورنہ اگر حق تعالیٰ کی عظمت و جلال پر نظر ہو تو انسان اپنے جاہ و جلال کی نمائش سے اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر لرزاں و ترساں ہوگا، جس طرح بقول حضرت علیہ الرحمتہ کوئی تحصیلدار گورنر کے سامنے اپنی تحصیلداری کی اکڑ فوں دکھلانے سے۔ بلکہ اس تک کو گوار نہیں کر سکتا کہ اس کو گورنر کے رو برو کوئی حضور کہہ کر بھی خطاب کرے۔

تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات و کبریائی کے سامنے ہماری پستی و کمتری کی کیا حد ہو سکتی ہے۔ پھر ہمارے صفات و کمالات جو کچھ بھی ہیں وہ سرے سے ہمارے ہیں کب۔ اس لئے پرائی چیز پر اکڑنا تو اور بھی سفاہت و تنگ ظرفی کی بات ہے۔ اس کی مثال حضرت علیہ الرحمتہ یہ دیا کرتے ہیں کہ اگر کسی چمار کو کوئی بادشاہ کوئی بڑا قیمتی موتی بھی دیدے، تو کیا اس سے وہ چمار چمار نہ رہے گا، یا اس عطیہ شاہی پر بندگی و منت گذاری کے بجائے اپنے چمار ہونے کو بھلا کر الٹے نمک حرامی سے بادشاہی کا دعوے کرنے لگنا درست ہوگا۔ اس لئے تو اس نمک حرامی و سرکشی کے جرم عظیم پر ارشاد ہوا کہ "کبریائی میری چادر اور بڑائی میرا ازار ہے جو اس میں مجھ سے منازعت کرے گا اس کو دوزخ میں داخل کرونگا"۔۔ (الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری فمن نازعنی واحد اسنھما ادخلتہ النار

تواضع کی افراط: کبر کی افراط کے ساتھ تواضع کی افراط کا بھی ایک مرض عام ہے جو بارہا ناشکری کی حد تک پہونچ جاتا ہے حضرت مجدو وقت علیہ الرحمتہ کی

تجدید نے جس طرح دنیا کی ہر راہ میں صراط مستقیم کی رہنمائی فرمائی ہے ' اسی طرح کبر کے علاج کے ساتھ ایسی تواضع کے مرض پر بھی متنبہ فرمایا ہے ' جو تواضع کے بجائے کفران نعمت واحسان ناشناسی ہو جائے ۔ الفصل والا نفصال نام ایک وعظ میں ایسے لوگوں کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی اصلاح فرمائی گئی ہے ' جو تصوف میں اعمال کے بجائے احوال کو مقصود سمجھتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں ارشاد ہے کہ

"اس کا اثر یہ ہوا کہ سالکین نے اعمال صالحہ کی بے قدری شروع کر دی ' کہ جب نماز میں بیوی بچوں کا خیال آگیا تو وہ نماز ہی کیا ہوئی یہ شخص ناشکری میں مبتلا ہوگیا ۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ نماز کو اپنی نماز سمجھے اور اس کو اپنا کمال سمجھے۔ کیونکہ نماز تو اپنی جب ہوتی کہ اپنے اسباب سے کام لیا جاتا ۔ یہاں تو اعضا وارادہ سب حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں ۔ اس لئے اپنی حیثیت سے تو نماز وغیرہ کچھ بھی نہیں (یعنی اپنا کوئی کمال نہیں) مگر دوسری حیثیت سے یہ اعمال قابل قدر ہیں یعنی عطائے حق ہونے کی وجہ سے یہ نماز روزہ جس درجہ میں بھی ہے قابل قدر ہے ۔

ع ۔ بلا بودے اگر ایں ہم بنودے

" اس کی ایسی مثال ہے ' جیسے ایک چمار کو بادشاہ موتی دیدے ' تو وہ اپنے کو چمار ہی سمجھے گا مگر ساتھ ہی موتی کو موتی بھی سمجھے گا ۔ یہ نہیں کہ اپنے کو چمار ہونے کی وجہ سے موتی کو بھی ٹھیکرا سمجھنے لگے ۔ یا موتی کو موتی سمجھے اور اپنے کو چمار نہ سمجھے ۔ بس یہ مطلب ہے شکر کا کہ اپنے کو تو چمار سمجھو مگر اعمال صالحہ کو عطائے حق ہونے کی وجہ سے قابل قدر سمجھو اور نعمت حق کی بے قدری نہ کرو ۔

" اس پر ایک حکایت یاد آئی آلہ آباد میں ایک بزرگ محمدی شاہ صاحب تھے ' جو ولائتی تھے اور مجذوب بھی تھے ۔ آلہ آباد والے کہتے تھے کہ رات کو جب یہ ذکر کرتے ہیں تو سارا شہر گونج جاتا ہے ۔ ۔ ۔ میں بھی ایک دفعہ والد صاحب کے

ساتھ ان بزرگ کے پاس حاضر ہوا ہوں ۔ ان کا ایک واقعہ حافظ عبد الرحمٰن صاحب بکھر وہی بیان کرتے تھے کہ وہ ایک شخص کے ساتھ ان بزرگ کے پاس حاضر ہوئے ۔ اس دوسرے شخص کو محمدی شاہ جانتے تھے ' ان سے حافظ عبد الرحمٰن صاحب کی تعریف پوچھی تو انھوں نے کہا کہ یہ حافظ بھی ہیں حاجی بھی ہیں ' ذاکر وشاغل بھی ہیں ۔ اس پر حافظ عبد الرحمٰن صاحب نے تواضعاً کہہ دیا کہ حضرت میں تو کچھ بھی نہیں ۔ یہ سن کر محمدی شاہ صاحب بگڑ گئے اور فرمایا کہ اچھا تو تم حافظ نہیں ہو ' تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا قرآن سلب کرلیں اور تمہارا حج باطل ہو جاوے ۔ حافظ عبد الرحمٰن صاحب کہتے تھے کہ انھوں نے میری ایسی خبر لی کہ پیچھا چھوڑانا مشکل ہوگیا اور اس کے بعد جب کبھی حافظ جی ان کے پاس حاضر ہوتے تو وہ کہتے آؤناشکرا آؤ ناشکرا ۔ انھوں نے ان کا لقب ہی ناشکرا رکھ لیا۔

" غرض ہمارے اعمال (اور اس طرح کے سارے کمالات) کی دو حیثیتیں ہیں ۔ ہماری حیثیت سے تو یہ اعمال کچھ بھی نہیں ' مگر دوسری حیثیت سے قابل قدر ہیں گو وہ ٹوٹا ہی برتن زیدیں ۔ "

مطلب یہ ہے کہ جس کی نظر خدا کی عظمت و کبریائی پر ہے اس کو اپنی بڑائی نظر ہی کب آسکتی ہے ' جو اس پر تکبر کرے اور جو کچھ نظر بھی آئے تو وہ محض خدا ہی کی دین ہے ' اپنا کیا ہے ' جو اس پر اکڑے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین میں بڑائی اور بزرگی کا مدار یوم دین پر ہے ' یعنی دنیا کے کمال اور اعمال پر نہیں بلکہ آخرت کے انجام و مآل پر ۔ اور اس کا دعویٰ کون کرسکتا ہے کہ اس کا انجام کسی کافر یا فرعون کے مقابلہ میں بھی بہتر ہوگا ۔ ایک طالب علم ساری طالب علمی بھر ذہین بڑا شوقین بڑا محنتی رہا اور امتحان میں سب سے اول آنے کا دم دعویٰ تھا ' لیکن جب امتحان کا وقت سر پر آیا تو کسی قلم اشار "کا سودا سر میں سمایا ۔ پرچہ سامنے آیا تو سوال از آسمان جواب از ریسمان کا معاملہ ہوا ' اور سارا دم دعویٰ

رکھا گیا - اور نتیجہ میں بد ذہن و بد شوق آگے نکل گئے ' جن کے مقابلہ میں یہ دعویٰ تھا - وہی اصول کہ

ہیچ کافررا نجواری منگرید
کہ مسلمان بودنش باشد امید

سالک کے لئے قبض کا حال کیسی مصیبت کا حال ہوتا ہے ' جس کا اندازہ کوئی سالک ہی کرسکتا ہے کہ بارہا خود کشی تک کرلینے کا جی چاہتا ہے مگر محققین صوفیہ کے ہاں اس اعتبار سے یہ مصیبت عین نعمت ہے کہ اس کی بدولت سالک عجب و پندار سے محفوظ رہتا ہے ' جو اس راہ کی سب سے بڑی ہلاکت ہے -

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو
آں صلاح تست آئس دل مشو

خود حضرت علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ

"قبض باعتبار آثار کے بسط سے زیادہ نافع ہے - کیونکہ بسط میں عجب کا خطرہ ہے - اس میں اپنے کمالات پر نظر ہوتی ہے ' اور قبض میں اپنے اوپر نظر نہیں ہوتی ' بلکہ عجز و نیازمندی ہی کا غلبہ ہوتا ہے اس وقت انسان اپنے کو کتے اور فرعون سے بدتر سمجھتا ہے - اور یہ بات اس شخص کی سمجھ میں نہیں آسکتی ' جس پر یہ حال گذرا نہ ہو - کیونکہ یہ ذوقی امر ہے جس پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے - اور یہ نہیں کہ اس وقت یہ شخص اپنے کو مومن نہیں سمجھتا بلکہ اپنے کو مومن اور فرعون کو کافر سمجھ کر بھی اپنے کو اس سے بدتر سمجھتا ہے - میں الفاظ میں اس حالت کی حقیقت کو نہیں بتلاسکتا تم اتنا سمجھ لو کہ اس کو اپنے مآل پر نظر ہوتی ہے کہ نہ معلوم مآل کیسا ہو - اور اس طریق میں عجز و نیاز ہی سے کام چلتا ہے ' عجب و پندار سے کامیابی نہیں ہوسکتی مولانا فرماتے ہیں -

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ
جز شکستہ رانگیرد فضل شاہ

اور فرماتے ہیں کہ

ہر کجا پستی ست آب آنجارود ہر کجا مشکل جواب آنجارود
سالہاتو سنگ بودی دلخراش آزمون رایک زمانے خاک باش
دربہاران کے شود سرسبز سنگ خاک شو تاگل بروید رنگ رنگ

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ چشتیہ کا مذاق کیسا اچھا ہے ۔گو تمام صوفیہ کا یہی مذاق ہے مگر چشتیہ پر سب سے زیادہ اس کا غلبہ ہے کہ

افروختن و سوختن و جامہ دریدن
پروانہ زمن، شمع زمن گل زمن آموخت

"میں نے مولانا گنگوہی سے سنا ہے کہ جس شخص کو ساری عمر مجاہدات و ریاضات کے بعد میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا ۔ اس کو سب کچھ حاصل ہوگیا کیونکہ اس طریق کا حاصل یہی بے حاصلی ہے ۔ اور جو یہ سمجتا ہے کہ مجھے کچھ کمال حاصل ہوگیا وہ اس شعر کا مصداق ہے ۔ ۔

خواجہ پندارد کہ وارد حاصلے
حاصل خواجہ بجز پندار نیست

لیکن اگر دین ہی نہیں ، تو پھر کہاں کا خدا ، اور کہاں کی آخرت جو اس کی عظمت و کبریائی پر نظر اور اپنے انجام و مآل کا اندیشہ ہو ۔ اس لئے لادینی زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اور لادینی سیاست و حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری سب کا نتیجہ سراپا رعونت و فرعونیت ترفع و تعلی ، نام و نمود فخر و نمائش کے مظاہروں کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے ! اسی شیطانی انانیت اور فرعونی علوے فی الارض کے فسادات کی بدولت اب زمین میں کہیں مفر اور پناہ کی جگہ نہیں رہ گئی ہے !

---

(۱) الفصل والا نفصال ص ۲۶، ۲۵ ۔ ۱۲

بہرحال کہنا یہ ہے کہ انانیت و فرعونیت کے اس ام الامراض کا اصولی علاج تو صرف دین یعنی خدا کی عظمت اور خوف آخرت کا حضور و استحضار ہے - لیکن جس طرح معمولی امراض جسمانی کا علاج تک محض طب کی کتابیں پڑھ لینے سے نہیں ہوسکتا جب تک کسی طبیب حاذق سے رجوع نہ کیا جائے ' تو پھر امراض نفسانی وہ بھی کبر جیسے ام الامراض کا نقط کتابی اصول معلوم کرلینے سے کیسے علاج ہوسکتا ہے ' جب تک کسی باقاعدہ معالج سے رجوع نہ کیا جاوے - علاج تو علاج معمولی تشخیص تک کے لئے نری کتاب خوانی اور اصول دانی کام نہیں آسکتی - مرض کی تشخیص تو الگ رہی حدیہ ہے کہ خالی کتاب خوان بارہا بعض ظاہری علامات سے دھوکا کھا کر جو مرض سرے سے نہیں ' اس کا بھی اپنے کو مریض سمجھ لیتا ہے ' حضرت والد رحمہ اللہ طبیب تھے ' ایک مرتبہ راقم ہذا طویل سلسلہ علالت میں ان کے زیر علاج تھا - گھر میں طب کی کتابیں تو موجود ہی تھیں - اپنی بیماری کے لئے ان کو دیکھنا شروع کیا ' تو زیر علاج بیماری کے علاوہ معلوم ہوتا تھا کہ خدا جانے اور کن کن بیماریوں میں مبتلا ہوں - حضرت والد سے عرض کیا ' تو کتابیں دیکھنے کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ کتابوں سے مرض کی خود تشخیص کرنا چاہوگے تو کوئی اور مرض ہو نہ ہو لیکن مراق ضرور ہو جائے گا -

اسی طرح نفسانی امراض میں بھی خود مرض کبر ہی کے متعلق دو ایک مثالوں سے اندازہ کیجئے کہ کس طرح آدمی کو بے مرض کے مرض کا دھوکا ہو جاسکتا ہے اور کس طرح اس دھوکے سے نکالنا ایک ماہر معالج ہی کا کام ہوتا ہے - کسی سالک نے لکھا کہ -

"حضرت والا یہ ناچیز انگریزی ماسٹر ہے - بفضلہ یہ ناچیز اس کا منتظر نہیں رہتا کہ لوگ مجھ سے عزت کا سلوک کریں - اپنی حالت کفار سے بھی بدتر محسوس ہوتی ہے - لیکن کچھ عرصہ سے دیکھتا ہوں کہ اگر کوئی حاجی یا حضرت کہہ کر پکارتا ہے تو دل خوش ہوتا ہے - اگر کوئی ماسٹر کہہ کر پکارتا ہے ہلا تو وہ خوشی نہیں ہوتی

ـــــــــــــ غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ نفس چاہتا ہے کہ نیک اور دیندار لوگوں میں میرا شمار ہو ۔ حضرت اقدس اگر یہ حالت مذموم ہو تو علاج ارشاد فرمائیں"۔

پہلے آپ خود ذرا غور فرمالیں کہ اس کا کیا جواب دے سکتے ہیں 'پھر اس کے بعد حضرت علیہ الرحمہ کا جواب پڑھیں تو قدر ہو ۔ ارشاد ہوا کہ

جیسے سب چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے خاصیتیں رکھی ہیں ۔ اسی طرح الفاظ میں بھی ۔ اور ان کے وہ آثار طبعی ہیں ۔ ان کا احساس ایسا ہی ہے ' جیسے شیریں اور تلخ چیزوں کا تو اگر کسی کو پختہ انار شیریں معلوم ہوتا ہے اگرچہ وہ حرام ہی کا ہو ' اور کریلا تلخ معلوم ہوتا ہو اگرچہ وہ حلال ہی کا ہو ' تو جیسے یہ احساس مذموم نہیں اسی طرح خاص الفاظ و القاب کے اثار کا احساس مذموم نہیں

" البتہ خلاف واقع کو اپنے قصد سے پسند کرنا اور واقع کو اپنے قصد سے ناپسند کرنا یہ بیشک مذموم ہے ۔ سو اس سے بچنا اختیاری امر ہے ۔ اور اس کا سہل اور اسلم طریقہ یہ ہے ۔ کہ جب کوئی مدحیہ الفاظ استعمال کرے فوراً ہی ان کی نفی اور نہی سے کام لے ۔ اور دل میں اللہ تعالیٰ سے ایسے اقوال کے شر سے پناہ مانگے"۔ (النور ربیع الاول ۶۲ھ)

ایک اور حال سنئے ۔

"اپنا ایک حال بغرض اصلاح عرض ہے ۔ وہ یہ کہ جن لوگوں کی وضع خلاف شرع ہوتی ہے یا جو خلاف شرع امور میں مصروف ہوتے ہیں ' ان کی ان باتوں سے دل میں نفرت ہوتی ہے ۔ اور بلا ضرورت ان سے ابتداء سلام و کلام کرنے کو محض حق تعالیٰ کی رضا مندی کے خیال سے دل نہیں چاہتا ۔ بایں ہمہ اپنے کو ان سے اچھا نہیں سمجھتا ۔ اور جو باتیں اپنے اندر موافق شریعت کے پاتا ہوں ' ان کو محض اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان جانتا ہوں ' اور ان کے زوال کا اندیشہ ہے ۔

کیونکہ عطا بلا استحقاق ہے ' تو جو باتیں خلاف شرع اپنے اندر پاتا ہوں ان کو بھی برا اور قابل ترک سمجھتا ہوں"۔

اس کے بعد اصل سوال یہ ہے کہ "لیکن اپنے نفس سے اتنی نفرت اپنے دل میں نہیں پاتا ' جس قدر اور لوگوں نے ان کی خلاف شرع باتوں پر ہوتی ہے ۔ اس وجہ سے اندیشہ کبر کا ہوتا ہے"۔ اس کا جواب جیسا محققانہ اور تشفی بخش عطا فرمایا ' اس سے حضرت کی شان تحقیق وحذاقت سے بڑھ کر اس کا اندازہ ہوتا ہے ' کہ غیر محقق و غیر حاذق شناخت مرض میں بھی کیسے کیسے دھوکے کھا سکتا ہے ۔ اب محقق کی تحقیق ملاحظہ ہو کہ

"نفرت میں تفاوت ہونا کبر نہیں ۔ نفرت اعتقادی تو دونوں جگہ یکساں ہے ' اور عبد اسی کا مامور ہے ۔ اور تفاوت نفرت طبعی میں ہے جیسے انسان کو اپنے پاخانہ سے نفرت کم ہوتی ہے اور دوسرے کے پاخانہ سے زیادہ ہوتی ہے ۔ اور راز اس تفاوت کا تفاوت فی المحبت ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کو اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے ' بہ نسبت غیر کے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ماں کو اپنے بچے کے پاخانہ سے اتنی نفرت نہیں ہوتی جیسی غیر محبوب کے پاخانہ سے ۔ سو اس کا کبر سے کوئی تعلق نہیں"۔ (النور ذیقعدہ ۴۹ھ)

اس سے اندازہ کیجئے کہ مرض کبرام الامراض اور عسیر العلاج ہی نہیں بلکہ بہت سی ایسی متشابہ چیزیں ہیں ' جو حقیقتہً کبر نہیں ہوتیں ' مگر صورۃً کبر ہی معلوم ہوتی ہیں ان کی تشخیص کے لئے کیسی حذاقت و مہارت درکار ہے ۔ کسی طالب نے جو قرینہ سے کسی مدرسے کے استاد معلوم ہوتے ہیں خود اپنے حال کی اسی طرح کچھ متشابہ مثالیں پیش کرکے ان کی تحقیق و علاج چاہا ۔

"احقر نے مطبخ سے کھانا جاری کرالیا چونکہ وہاں سے جاکر خود لانا پڑتا ہے ' اس لئے بہت عار آتی تھی ۔ خصوصاً جب کوئی جان پہچان والا مل جاتا تو اور زیادہ شرم آتی کہ ایسا کیا فقر طاری ہوگیا کہ مطبخ سے کھانے لینے لگا ــــــــــــ ایک

دو دفعہ لانے کے بعد دل میں آیا کہ کسی سے منگوالیا کروں مگر چونکہ تکبر کا شبہہ ہوچکا تھا اس لئے اخیر تک خود ہی لاتا رہا - اس سے عار کا لعدم ہوگیا اور عادت سی ہوگئی -

"بازار سے کوئی وزن سر پر رکھ کر لانے میں بہت ذلت سی معلوم ہوتی ہے ' اس خیال سے کہ لوگوں کا بازار میں مجمع ہے ' نہ یہ کہ میں اس سے خالی ہوں چنانچہ اگر لوگوں کا مجمع نہ ہو تو لاسکتا ہوں -

"موچی کے پاس بیٹھ کر جوتہ نہیں گٹھواتا بلکہ کھڑا رہتا ہوں - اس کے پاس بیٹھنے میں ذلت سی معلوم ہوتی ہے -------- ایک مرتبہ نظر سے اس مضمون کا شعر گذرا کہ اتنا عجز و انکسار بھی اچھا نہیں کہ سفہاء سر پر چڑھ جائیں -------- چنانچہ دل کو ٹٹولنے سے پتہ لگتا ہے کہ اگر کوئی آدمی بھی نہ ہو تب بھی موچی کی دوکان پر نہ بیٹھوں کہ موچی نہ معلوم کیا خیال کرے - البتہ دل میں اپنے کو افضل نہیں سمجھتا ' نہ اس کو اپنے سے ذلیل سمجھتا ہوں -

"پیوند کے کپڑے بھی نہیں پہنتا - اس خیال سے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ بہت غریب آدمی ہے - اور ویسے بھی پیوند کے کپڑے کو طبیعت قبول نہیں کرتی - دل خود نفرین کرتا ہے کہ ایک بیہودہ خیال کی وجہ سے ایک سنت سے محروم ہوں - اور نفس کی شرارت کی وجہ سے بھی دل چاہتا ہے کہ اچھے اچھے کپڑے پہنوں -

"ایسے شخص کا نصیحت کرنا بہت برا معلوم ہوتا ہے ' جس کے برتاؤ سے معلوم ہو کہ اس کے دل میں میری کچھ وقعت نہیں ------- یا طرز نصیحت سے یہ پتہ لگتا ہے کہ محض میرا نفع مقصود نہیں بلکہ کچھ نفس کی بھی آمیزش ہے - یعنی غصے میں کچھ اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال رہا ہے"-

"کسی شخص کے متعلق یہ خیال ہو جائے کہ یہ ہماری جماعت کو یا مجھ کو ذلیل سمجھتا ہے ' تو میں بھی اس کے ساتھ اچھی طرح نہیں پیش آتا - چنانچہ مسٹروں کو اکثر سلام نہیں کرتا -

"جیسا کسی کا مجھ کو ذلیل سمجھنا برا معلوم ہوتا ہے - ایسا ہی کبھی میرا ادب کرنا بھی برا معلوم ہوتا ہے -

اب حضرت کا تحقیقی جواب سنئے -

"یہاں کئی چیزیں متشابہ ہیں" جن میں کبھی اشتباہ ہو جاتا ہے - کبر و عجب و حب جاہ و ریا و خجلت پھر ہر ایک میں دو دو درجے ہیں حقیقت و صورت، تو یہ دس چیزیں ہیں ------ مختصر بقدر ضرورت لکھتا ہوں جس سے تھوڑی مناسبت والے کو سمجھنے میں ضروری بصیرت ہو سکتی ہے اور جزئی واقعات کو منطبق کر سکتا ہے۔

"باقی جس کو ضروری مناسبت بھی نہ ہو اس کے لئے نہ کلیات کافی ہیں نہ جزئیات - بلکہ جب کوئی واقعہ پیش آوے کسی محقق کے سامنے پیش کرے"۔

آگے اصل جواب مختصراً یہ ہے کہ

"تکبر کا حاصل یہ ہے کہ کسی دنیوی یا دینی کمال میں اپنے کو باختیار خود دوسرے سے اس طرح بڑا سمجھنا کہ دوسرے کو حقیر سمجھے - تو اس میں دو جز ہیں اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر سمجھنا یہ تکبر کی حقیقت ہے جو حرام اور معصیت ہے اور ایک اس کی صورت ہے ------ یعنی بلا اختیار ان اجزاء کا خیال آجانا یہ معصیت تو نہیں، لیکن اس خیال کو باختیار خود اچھا سمجھنا یا باوجود اچھا نہ سمجھنے کے باختیار خود اس کو باقی رکھنا یہ کبر کی حقیقت ہو جائے گی اور معصیت ہوگی -

"اور یہ جو قید لگائی کہ دوسرے کو حقیر سمجھے - یہ اس لئے کہ اگر کوئی واقعی بڑائی چھوٹائی کا اس طرح معتقد ہو کہ دوسرے کو ذلیل نہ سمجھے تو وہ تکبر نہیں - جیسے بیس برس والا دو برس کے بچے کو سمجھے کہ مجھ سے عمر میں چھوٹا ہے یا ہدایہ پڑھنے والا طالب علم نحو میر پڑھنے والے کو سمجھے ------ کہ مجھ سے پڑھائی میں کم ہے یا مالدار آدمی کسی مسکین کو سمجھے کہ مجھ سے مال میں کم ہے، مگر اس کو حقیر نہ سمجھتا ہو تو یہ کبر نہیں -

"مگر اس بڑائی چھوٹائی کا اعتقاد گو کبر نہیں - لیکن اگر ایسا تفاوت عرفاً و شرعاً

کمال ہو تو کبھی کبھی یہ اعتقاد کبر تک پہونچا دیتا ہے اس لئے سد ذرائع کے طور پر اس کا وہی علاج کرنا چاہیئے جو حقیقت کبر کا ہے۔

یہ علاج ذیل کے ایک مسلسل و مستقل مراقبہ کی صورت میں تجویز فرمایا گیا ہے جس کی حسب موقع و ضرورت تجدید و تکرار کرتے رہنا چاہیئے۔

(الف) گو میرے اندر یہ کمال ہے، مگر میرا پیدا کیا ہوا نہیں حق تعالیٰ کا عطا فرمایا ہوا ہے۔

(ب) عطا بھی کسی استحقاق سے نہیں ہوا، بلکہ محض موہبت و رحمت سے۔

(ج) پھر عطا کے بعد بھی اس کا بقا میرے اختیار میں نہیں، بلکہ حق تعالیٰ جب چاہیں سلب کرلیں۔

(د) گو اس دوسرے شخص میں فی الحال یہ کمال نہیں، مگر فی المآل ممکن ہے کہ میرے کمال سے زیادہ اس کو یہ کمال اس طرح حاصل ہو جائے کہ میں اس کا محتاج ہو جاؤں۔

(ہ) اگر فی الحال بھی نہ ہو، جیسا کہ بعض اوقات ظاہر اسباب سے گمان غالب ہوتا ہے تو فی الحال ہی اس شخص میں کوئی ایسا کمال ہو جو مجھ سے مخفی ہو اور دوسروں پر ظاہر یا حق تعالیٰ کو معلوم ہو اور جس کے اعتبار سے وہ بہ حیثیت مجموعی مجھ سے اکمل ہو۔ اگر اس کے کسی کمال کا احتمال قریب ذہن میں نہ آئے، تو اس احتمال کا ذہن میں حاضر کرے کہ شاید وہ علم الٰہی میں مقبول ہو اور میں غیر مقبول۔ یا مجھ سے زیادہ مقبول ہو تو مجھ کو کیا حق ہے کہ اس کو حقیر سمجھوں۔

اور بالآخر یہ مراقبہ و معالجہ خصوصیت کے ساتھ کیسا قاطع و عجیب ہے کہ بالفرض کوئی شخص تمام باتوں میں مجھ سے کم ہی ہے۔

(و) تو ناقص کا کامل پر حق ہوتا ہے، جیسا مریض کا تندرست پر ضعیف کا قوی پر، فقیر کا غنی پر لہٰذا مجھ کو چاہیئے کہ اس پر شفقت و ترحم کروں، اس کی تکمیل میں کوشش کروں۔ اور اگر اس کی قدرت وہمت نہ تو دعائے تکمیل ہی سہی

----- تو اس تدبیر سے اس کے ساتھ شفقت کا تعلق پیدا ہو جائے گا - اور جس کی تکمیل و تربیت میں آدمی کوشش کرتا ہے - اس سے طبعًا محبت ہو جاتی ہے ' اور محبت کے بعد تحقیر نہیں ہوتی -

(ز) یہ بھی نہ ہو تو اس سے لطف و اخلاق کے ساتھ کبھی کبھی بات چیت کرلیا کرے - اس کا مزاج پوچھ لیا کرے - اس سے جانبین میں تعلق کے بعد تحقیر نہیں رہتی -

البتہ اگر وہ شخص ایسا ہے کہ شرعًا اس سے بغض رکھنا مامور ہے تو تدابیر مذکورہ میں سے بعض کا استعمال نہ کیا جائے گا - مگر بعض کا پھر بھی کیا جاسکتا ہے ان کو کرے -

یہ سب گفتگو تو تکبر کے متعلق تھی - اس کے بعد عجب وغیرہ کے متعلق اس کی تفریعات یہ ہیں کہ

"عجب میں صرف ایک قید کم ہے - یعنی عجب میں دوسروں کو چھوٹا سمجھنا نہیں صرف اپنے کو بڑا سمجھنا ہے - اس میں بھی حقیقت و صورت کے ویسے ہی درجے اور وہی احکام ہیں - اور معالجات مذکور میں سے جن میں دوسرے کا تعلق نہیں وہ سب اس میں بھی ہیں -

"حب جاہ کا حاصل یہ ہے کہ جیسا اپنے کو دل میں بڑا سمجھتا ہے ' اس کی بھی کوشش کرتا ہے کہ دوسرے بھی مجھ کو بڑا سمجھیں اور تعظیم و اطاعت و خدمت کریں - چونکہ اس کا منشا بھی تکبر و عجب ہی ہے ' اس لئے اس کے درجات و معالجات بھی وہی ہیں جو کبر کے گذرے -

ریا کا حاصل یہ ہے کہ کسی دینی یا دنیوی عمل کو لوگوں کی نظر میں بڑائی حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے - چونکہ یہ بھی کبر و عجب ہی سے پیدا ہوتا ہے ' اس لئے اس کے بھی وہی درجات و معالجات ہیں -

"اور یہ سب احکام کلی ہیں کبھی کبھی کسی خصوصیت مقام سے بعض نئے

صورتیں اور نئے معالجات بھی ثابت ہوتے ہیں ' جو مربی کی رائے سے متعین کئے جاسکتے ہیں -

"اخیر کی ایک قسم خجلت (شرمندگی) ہے - یہ ایک طبعی انقباض ہے جو خلاف عادت کام کرنے یا حالت پیش آنے سے بلااختیار نفس پروار د ہوتی ہے - اور سالک کو بعض اوقات غایت احتیاط کے سبب اس پر کبر وغیرہ کا شبہہ ہو جاتا ہے - مگر واقع میں وہ کبر نہیں ہے- اور معیار یہ ہے کہ یہ شخص جس طرح ایک دنی و خسیس کام کرنے سے شرماتا ہے ' اسی طرح اگر اس کے ساتھ کوئی غایت درجہ کی تعظیم و تکریم کا معاملہ کرے تب بھی ویسا ہی انقباض ہوتا ہے -

"اخیر میں ایک معالجہ ممتدہ ذکر کرتا ہوں - کیونکہ معالجات مذکورہ وقتی تھے جن سے اثر کا رسوخ نہیں ہوتا الانا دراً اور متبدی کو ایک معتد بہا مدت تک اس معالجہ کی ضرورت ہے کہ بتکلف کم درجہ لوگوں کے اوضاع و اطوار و عادات اختیار کرے حتی کہ وضع راسخ ہو جائے مگر اس کا خیال رکھے کہ اس درجہ کی دناء ت و خست اختیار نہ کرے جس سے تواضع کی شہرت ہوجائے"- (رسالہ شمس الفضائل لطمس الرذائل)

اس نسخہ کے اکسیری اجزاء کی قدر و قیمت تو کسی سالک ہی کے دل سے پوچھئے ' جو کبر جیسے مہلک مرض کی ہلاکتوں سے آگاہ اور اس سے شفا کا طالب ہو ورنہ آج کل تو اس علاج ہی کو سب سے بڑی مہلک بیماری بلکہ دیوانگی خیال کیا جائے گا - اس لئے کہ کبر و جاہ ' تکبر و ترفع ' علو و برتری خواہ شخصی ہو یا قومی ' انفرادی ہو یا اجتماعی ' سیاسی ہو یا معاشی ' اس کا نام تو اس زمانہ میں عین ترقی ہے!

لیکن قرآن مجید کی اٹل تشخیص میں **علو فی الارض** وانی یہ ترقی فساد فی الارض کا دوسرا نام ہے - جس کا مشاہدہ بھی اس عہد سے زیادہ معلوم تاریخ کی آنکھوں نے کبھی نہیں کیا اور جس کی کچھ تفصیل اوپر حسب موقع گذر بھی چکی -

البتہ اس کا کوئی علاج نہیں کہ

ع۔ آنکھیں خدا نے دی ہیں مگر دیکھتے نہیں

حیات طیبہ

اوپر کے مباحث میں مستقلاً اور مختلف عنوانات کے تحت حضرت جامع المجددین کی تجدیدات تصوف سے یہ خوب اچھی طرح روشن ہوچکا ہے کہ تصوف کی حقیقت کامل و جامع دین کے درجہ کمال و جامعیت کے سوا کچھ نہیں - جب وہ قلب و قالب صورت و معنیٰ ظاہر و باطن کے سارے کمالات و فضائل کی جامعیت ہی کا نام ہے تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ حسنۂ آخرت کے ساتھ حسنۂ دنیا کا بھی جامع نہ ہو درآنحالیکہ خود قرآن مجید کی نص صریح سے حسنۂ آخرت کے ساتھ حسنۂ دنیا بھی مطلوب ہے کما قال اللہ تعالیٰ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ اور دوسری جگہ ایمان و عمل صالح پر جن کا کمال خاصیت ہی تصوف ہے نہایت قطعیت کے ساتھ اس دنیا میں بھی پاکیزہ و مزہ دار زندگی کا وعدہ فرمایا کہ "**من عمل صالحا من ذکر اوانثی وھو مومن فلنحیینہ حیوۃ طیبہ**"(۱)-

اصل راحت قلب کی راحت ہے: اصل میں انسان اس معاملہ میں جو شدید دھوکا کھاتا رہا وہ یہ کہ حسنہ دنیا یا اس دنیا کی بھلائی اور آرام و راحت کو دولت و ثروت حکومت و سلطنت امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ خدم و حشم یا کھانے پینے اور رہنے سہنے کے اعلیٰ درجہ کے ظاہری ساز و سامان میں منحصر جانا - یعنی وہی اہل ظاہر کی طرح نظر صرف ظاہر پر رہی - حالانکہ ذرا سوچو تو یہ کھلا ہوا شدید مغالطہ ہے - اس لئے کہ آرام و راحت لطف و مسرت فی الواقع نفس و قلب کا ادراک و وجدان ہے - اگر دل کسی وجہ سے بے چین و پریشان ہے ' تو تخت سلطنت پر بیٹھ کر قصر شاہی کے نیچے بھی دنیا مٹی ہے اور اگر دل کو امن و اطمینان چین اور سکھ نصیب ہے ' تو پھونس کی چھونپڑی کے نیچے دال دلیا کھا کر فرش زمین پر لوٹ

---

(۱) مرد و عورت جو بھی اچھے کام کرے ' بشرطیکہ ایمان جن بھی ہو ' تو ہم اس کو یقیناً دنیا میں بھی مزہ دار زندگی عطا کریں گے ۱۲

لگانے والوں کو بھی قصر شاہی اور اس کے الوان نعمت سے ہزاروں درجہ زیادہ لطف و مسرت اور مزے دار زندگی حاصل ہے -

صوفیاء کا اصل زور قلب ہی کی اصلاح پر ہے : اور یہ معلوم ہے کہ حضرات صوفیاء کے ہاں سب سے زیادہ زور دل یا قلب و باطن ہی کی صفائی ستھرائی پاکیزگی و طہارت پر ہے ' بلکہ اصطلاحاً تصوف نام ہی خصوصیت کے ساتھ قلب و باطن کی تطہیر و تزکیہ کا ہے - لہٰذا قدرۃً صوفی سے بڑھ کر اور کس کی دنیاوی زندگی بھی مزیدار ' صاف ستھری ' پاک و پاکیزہ یا "حیات طیبہ" ہوسکتی ہے - دل اگر بیمار و بے لطف ہے تو جسم کی صحت اور کھانے پینے کا بھی لطف نہیں - اس لئے تو صوفیوں کے ہاں بار بار اس حدیث کو دہرایا جاتا ہے کہ اگر قلب ٹھیک رہا تو سارا جسم ٹھیک ہے اور یہ بگڑا تو سارا جسم بگڑا اب دیکھو کہ قلب کا یہ بگاڑ یا اس کی بیماریاں کیا ہیں -

قلب کی بیماریاں : اس کی بیماریاں وہی ہیں ' جن کا نام رذائل نفس ہے - یعنی حب مال و جاہ بغض و حسد ' بخل و حرص ' ریا و نفاق ' کبر و عجب جو دل ان بیماریوں میں مبتلا ہو اس کی نصیب میں غم و غصہ حزن و خوف رنج و مصیبت کے سوا لطف و راحت کہاں - جس کو حب مال و جاہکا مرض ہے اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ مال و جاہ کی کسی مقدار و مرتبہ پر پہنچ کر بھی راضی و مطمئن نہیں ہوسکتا - تو پھر دل کا اطمینان و چین کہاں ' وہ تو ہمیشہ اس حزن و غم میں گھلتا رہے گا کہ ہائے فلاں کے پاس مجھ سے زیادہ مال ہے - فلاں کو زیادہ جاہ حاصل ہے - پھر اگر ذرا بھی خود اس کے جاہ و مال کو خطرہ لاحق ہوا تو خوف سے دم نکلنے لگتا ہے - یہ حال بخل و حرص کا ہے - اسی طرح نفس و حسد کی آگ سے کون نہیں جانتا کہ انسان کا سینہ دہکتی بھٹی بنا رہتا ہے - ریا و نفاق کا گرفتار تو دل ہی میں جانتا ہے کہ جو کچھ میں لوگوں کو دکھلا اور سنا رہا ہوں یا مکر و فریب سے یقین دلا رہا ہوں ' وہ واقع میں ہوں نہیں پھر ریا و نفاق کے کھل جانے کا خوف ذلت الگ دامن گیر

- تو مرائی و منافق کے دل میں وہ خوشی کہاں جو فی الواقع کسی فضل و کمال کے متصف کو حاصل ہوتی ہے ' خواہ اس کو کوئی جانے یا نہ جانے - باقی کبر و انانیت تو یہ تو ابھی اوپر ہی معلوم ہوچکا کہ دراصل تمام باطنی و قلبی بیماریوں کی جڑ ہے - اور حکومت و سلطنت جاہ و مال ' صنعت و تجارت ' علم و فضل کون سی ایسی بڑائی ' ہوگی جو ایک سے بڑھ کر ایک میں نہ پائی جاتی ہو - اسی لئے بڑائی کا طالب کا جس طرح دوسروں کی بڑائی سے قلب کڑھتا جلتا رہتا ہے - اسی طرح اپنی بڑائی کی فکر و حفاظت کی مصیبت اور اس کے زوال کے حزن و خوف میں مرتا رہتا ہے -

صحت قلب کی ٹھنڈک : اس کے مقابل میں اندازہ کرو کہ جو " مضغۂ قلب" کی ان بیماریوں سے پاک اور غناء قلب ' تسلیم و رضا صبر و شکر قناعت و توکل ' انکسار و تواضع کی دولت سے مالا مال اور دوسروں کے جاہ و مال سے بے پروا ہے ' اس کا کلیجہ کیسا ٹھنڈا رہتا ہوگا - لیکن داد دیجئے جدید لا دینی تعلیم و تہذیب کے اولو العزم حریصوں کی کہ انھوں نے جاہ مال کی حرص و ہوس ہی کا نام اولو العزمی و بلند ہمتی رکھ لیا ہے حتی کہ حکومت و دولت ' تجارت و ثروت ' جاہ و منزلت نمود و نمائش 'ترفع و تعلی ' برتری و کبریائی اقوام و افراد سب کی ترقی کا معیار بن گیا اسی ترقی کے لئے جدوجہد مسابقت و منافست ان کی اصطلاح میں حرکت و حیات ہے ' بلکہ اس کے پیچھے مرتے رہنا ہی زندگی ہے باقی صبر و شکر ' تسلیم و رضا ' توکل و قناعت ' تواضع و مسکنت یہ سب دنائت و پست ہمتی کی باتیں بزدلی کا فلسفہ یا زیادہ زیادہ سلبی اخلاق ہیں ! کیسی ستم ظریفی ہے کہ سلب رذائل کا نام سلبی اخلاق اور ہمت کی سب سے بلند پرواز کا نام پست ہمتی رکھ دیا !

بلند نظری کے ساتھ پست چیزوں سے بے پروائی لازم ہے : ذرا سوچئے تو سہی کہ اگر کوئی شخص جسمانی عیش و آرام اور مادی ساز و سامان میں مقابلہ و کشمکش سے کنارہ کش ہو کر کسی علم و فن طبیعات و تاریخ وغیرہ کی تحقیقات یعنی کسی ذہنی و دماغی مقابلہ و مسابقت میں فقر و فاقہ گوارا کرکے بھی مصروف منہمک

ہے ' اور سیٹھ ساہو کاروں یا وزراء و سلاطین کی ثروت و حکومت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا ہو ' تو وہ لادینی یا مادی ترقی و تہذیب کے فدائیوں کی نظر میں بھی بڑا بلند خیال و عالی حوصلہ ہوگا ۔ لیکن جو ان ذہنی و دماغی مطلوبات و مقاصد سے بھی نظر کو اونچا کرکے روحانی و غیرفانی مقاصد و مطالب کی دھن میں لگا ہو وہ دون ہمت ہے بزدل ہے ' حرکت و حیات کی لذت سے محروم اور ایجابی اخلاق کے فلسفہ سے نا آشنا ہے ! حالانکہ بالکل قدرتی اور معمولی بات ہے کہ جس کی نظر جتنی اعلیٰ ہوگی اتنا ہی وہ ادنیٰ چیزوں سے بے پروا اور ان کے لئے تنافس و تنازع سے دور و نفور ہوگا ۔

ورنہ اصل مقاصد میں طمع عین مطلوب ہے : بس یہی حقیقت ہے اس دنیوی و مادی زندگی کے معاملات میں ' دینی و روحانی زندگی کی قدر و قیمت اور بلندی و رفعت کے پہچاننے والوں کی قناعت پسندی یا خوش فہموں کی نظر میں "پست ہمتی" کی ۔ ورنہ انسان اور انسانیت کے شایان شان مقاصد و مقامات کے لئے تو قناعت نہیں بلکہ تنافس و مسابقت ہی عین مطلوب و مامور ہے **"وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون"** اور خود حضرات صوفیہ کے نزدیک ایسی چیزوں میں قناعت جس درجہ مذموم و مبغوض ہے اور حرص و طمع محمود و محبوب اس کا اندازہ صوفیوں اور عارفوں کے سرتاج عارف روم کی اس معرفت سے فرمائیں کہ

گر طمع خواہد زمن سلطان دین
خاک برفرق قناعت بعد ازیں

عافیت اور اطمینان کے دشمن : یہ تو درمیان میں ایک شدید غلطی و غلط فہمی کا ازالہ تھا ۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ اس دنیا میں بھی راحت و آرام کی زندگی جس کا نام ہے اس کا تعلق بھی جسم و ظاہر کے ساز و سامان سے زیادہ قلب و باطن کی

---

(۱) حرص کرنے والوں کو اسی کی تو حرص کرنا چاہئے ۱۲

عافیت و اطمینان سے ہے۔ اور قلب کی عافیت و اطمینان کے بڑے اور پہلے دشمن وہی بغض و حسد، حرص طمع، غیظ و غضب، ریا و نفاق، کبر و عجب حب جاہ و مال وغیرہ کے رذائل نفس و اخلاق ہیں جن کی بدولت دنیاوی و ظاہری مال و متاع ساز و سامان کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی آدمی کو مطمئن و آسودہ نہیں ہونے دیتی۔ مثلاً جو شخص اپنے سے زیادہ مال و جاہ والوں کے بغض و عدوات میں جلتا مرتا رہتا ہو اس کو اپنے جاہ و مال سے کیا راحت و مسرت نصیب ہوسکتی ہے سوا اس کے کہ ـــــ

ازبروں چوں گور کافر پر حُلل
واندروں قہر خدائے عزوجل

تصوف و سلوک کا پہلا قدم جب انہیں رذائل سے قلب و باطن کا تزکیہ یا اس کی اصلاح و معالجہ ہے، تو صوفی آدھا پیٹ کھا کر اور فرش زمین پر لوٹ کر بھی ہل من مزید کی حرص و ہوس میں جلنے مرنے والوں سے زیادہ مسرور و مطمئن رہ سکتا ہے۔ سلب اخلاق، یا سلب رذائل کی یہ وہ دولت ہے جو صوفی و سالک کو بالکل ابتدا ہی میں مل جاتی ہے۔ باقی اس راہ کے منتہی اور ایمانی و عملی صفات و کمالات سے آراستہ کاملین کی دنیاوی حزن و خوف سے پاک و آزاد حیات طیبہ کا تو خود ان کے سوا اندازہ ہی کون کرسکتا ہے!

توحید کا اثر: اس اعتبار سے توحید ہی کے آثار و نتائج کو دیکھئے جو اصل دین اور جس کی تکمیل تصوف ہے کہ موحد کے پاس حزن و غم خوف و ہراس پھٹک نہیں سکتا۔

"اگر چاروں طرف سے اس کو تلواروں میں گھیرلیا جائے، تب بھی اس کے دل پر ہراس نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں تھے۔ دوپہر کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرمانے کے لئے اترے۔ اتفاق سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے اس وقت کوئی قریب نہ

تھا ۔ آپ نے تلوار درخت میں لٹکا دی اور درخت کے نیچے سو گئے اس کی ایک دشمن کو خبر ہوئی اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً وہاں آیا اول دبے پاؤں تلوار پر قبضہ کیا ' نیام سے نکالا اور آپ کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا ۔ جب بالکل تیار ہوگیا تو آپ کو بیدار کیا اور پوچھا من یعصمک منی کہ آپ کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے ۔ آپ نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں فرمائی اور فرمایا کہ اللہ یعنی مجھے اللہ بچائے گا ۔ بھلا کوئی ایسا کرکے تو دکھلا دے بدون خدا کے تعلق کے کوئی ایسا کر نہیں سکتا "۔

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس
ہمیں ست بنیاد توحید بس

اب ذرا نیچے اتر کر اس توحیدی علم و معرفت کے ' اور آثار کو دیکھئے کہ جب ہم الحمدللہ مومن ہیں یعنی اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق ایمان و اطاعت کا ہے ۔ کفرو بغاوت کا نہیں ' تو کیسے ہوسکتا ہے کہ مومن و مطیع کے حق میں ان کا کوئی فعل و معاملہ رحم و کرم سے خالی ہو " وکان بالمومنین رحیما " (۱) اس لئے اگر بظاہر اور طبعًا کوئی بات کلفت و ناگواری کی پیش بھی آئے تو وہ بھی دراصل ہماری خیر خواہی اور دنیا و آخرت کسی نہ کسی کی بھلائی پر مبنی ہوگی ۔ ایسا آدمی جانتا ہے کہ

مصیبت کا انجام راحت :- " عسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم (کہ بارہا کوئی چیز بری معلوم ہوتی ہے لیکن دراصل اس میں بھلائی ہوتی ہے) اس لئے وہ گھبراتا نہیں اور (کم از کم) یہ سمجھتا ہے کہ میرا علاج اور کفارہ سئیات ہو رہا ہے ۔ نیز یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم خدا کے ہیں اپنے نہیں ۔ خدا

---

(۱) اہل ایمان کے حق میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر رحیم ہیں ۱۲

کو اختیار ہے کہ جس حالت کو ہمارے لئے مناسب سمجھیں اس میں ہمیں رکھیں - چنانچہ اسی کو مصیبت کے موقعہ پر فرماتے ہیں وبشر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبہ قالو انا للہ وانا الیہ راجعون " (۱)

" لہذا ظاہراً ہم پر جو تکلیف آتی ہے ' یہ ایسی ہی ہے ' جیسے ماں باپ کسی بچے کے دنبل میں ' جس نے اس کو بے حد تکلیف دے رکھی ہو یا آئندہ تکلیف پہنچانے کا اندیشہ ہو نشتر لگواتے ہیں کہ وہ ظاہراً تو تکلیف ہوتی ہے لیکن واقع میں کامل راحت کا سامان ہوتا ہے - اور اس تکلیف کی وہ حالت ہوتی ہے کہ ----

طفل می لرزد زنیش احتجام
مادر مشفق ازان غم شاد کام

یعنی بچہ تو ڈرتا لرزتا ہے اور ماں خوش ہو رہی ہے - حتی کہ نشتر لگانے والوں کو انعام دیتے ہیں - سو اگر کوئی تعجب کرنے لگے اور کہے یہ انعام کس بات کا دیا ' اس شخص نے تو تکلیف پہنچائی ہے اس کو تو سزا دینا چاہئے تو ماں باپ کہیں گے کہ احمق یہ تکلیف نہیں عین راحت ہے کیونکہ اس تکلیف کی بدولت لڑکے کی زندگی ہے ورنہ یہ دنبل بڑھتا اور اس کا زہریلا مادہ تمام جسم میں سرایت کر جاتا -

" تو جب ماں باپ کا نشتر لگوانا اور اس کی تکلیف دینا بوجہ ذریعہ راحت ہونے کے ناگوار نہیں تو خدا تعالٰی کو تو ماں باپ سے بدرجہا زیادہ محبت اپنے بندوں سے ہے - پھر اگر وہ فقر و فاقہ ڈال دیں یا کسی اور مصیبت میں مبتلا کردیں تو اس کو نشتر کے قائم مقام کیوں نہیں سمجھا جاتا " -

---

(۱) ان صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں ' اور اسی کے پاس جانا ہے ۱۲

اصل بات یہ ہے کہ ہماری نظر اپنے قلب و باطن کے دنبلوں یا بیماریوں پر بہت کم ہے، ورنہ احقر تو خود اپنے تجربہ بلکہ مشاہدہ کی گواہی دیتا ہے کہ جب سے حضرت علیہ الرحمتہ کی جوتیوں سے کچھ تعلق پیدا ہوا اور اپنے باطنی دنبل دکھائی دینے لگے، تو خدا کو گواہ کرکے عرض کرتا ہوں، کہ شاید ہی کوئی دنیاوی تکلیف و مصیبت ایسی ہوگی، جس کا حیات بخش نشتر یا آپریشن ہونا روز روشن کی طرح نہ نظر آتا ہو اور کبھی بظاہر مکروہ و موذی باتیں ایسی پیش آتی ہیں، کہ آخر میں اسی دنیا میں دنیاہی کی راحت کا سامان ثابت ہوتی ہیں۔ بس وہی نشتر میں ذرا صبر کی ضرورت ہے، تو مومن کی ہر مصیبت بشارت ہی بشارت ہے۔

صرف اسباب پر نظر: اس سے بڑھ کر کوتاہ نظری یہ ہے کہ ایمان و اسلام کے باوجود مصائب میں نظر صرف ظاہر و مادی اسباب پر ہوتی ہے اور سمجھتے ہیں کہ ظاہری و مادی اسباب مستقل بالذات عمل کرتے ہیں، نہ کوئی مسبب الاسباب ہے اور نہ اسباب مصیبت میں ہماری نافرمانیوں اور گناہوں کو کوئی دخل ہے۔ غرض مسبب الاسباب سے بالکل قطع نظر کرکے

"صرف اسباب ظاہری پر نظر کرتے ہیں۔ سبب اصلی کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ جو مصیبت آتی ہے گناہوں کی وجہ سے آتی ہے۔ ہوا آگ پانی وغیرہ سب اسباب خداوند کریم کے حکم کے تابع ہیں، ان کو جب اور جیسا حکم ہوتا ہے۔ ویسا ہی کرتے ہیں۔

خاک و آب و باد و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ باحق زندہ اند

یعنی ہمارے سامنے دیکھنے میں مردہ معلوم ہوتے ہی، ورنہ واقع میں زندہ اور تابع فرمان حق ہیں۔

جس قدر مصائب آتے ہیں سب حکم خداوندی سے نازل ہوتے ہیں اور اصل سبب جرائم و معاصی ہوتے ہیں۔ ان سے غضب حق ہوتا ہے اور پھر اس

کے حکم سے بلا و مصیبت نازل ہوتی ہے ۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ---

ہرچہ بر تو آیداز ظلمات و غم
آن زبیباکی و گستاخی ست ہم
غم چوبینی زود استغفار کن
غم بامر خالق آمد کارکن

جب کوئی مصیبت دیکھو فوراً استغفار کرو ۔ اس سلسلہ میں حضرت نے خود اپنے قصبہ (تھانہ بھون) کا ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ۔

کئی سال ہوئے جب ہمارے قصبہ اور گردونواح میں طاعون بہت زور شور سے پھیلا تھا ' تو قبل طاعون کے ایک بزرگ آخر شب میں بیٹھے ہوئے تھے کہ قلب پر یہ آیت وارد ہوئی انا منزلون علی اهل هذه القریه رجز امن السماء بماکانوا ایصنعون (۳) تو ان بزرگ نے اس کو وعظ میں بیان کیا لیکن اپنی طرف منسوب نہیں کیا کہ مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے ' مگر لوگوں نے توجہ نہ کی اور پھر طاعون پھیلا تو ایک سبب وہ گناہ بھی ہوا جو قوم لوط میں تھا ۔

غرض ایک طرف اگر اس پر نظر ہو کہ مصائب صرف ظاہر میں مصائب ہیں ورنہ اصل انجام کے اعتبار سے سراسر ہمارے حق میں عین مصلحت اور حق تعالیٰ کی رحمت ہیں ۔ دوسری طرف مصیبت کے ظاہری اسباب کے بجائے مسبب الاسباب یا خالق اسباب پر نظر ہو اور ان کو راضی رکھنے کی فکر یعنی " احکام و اعمال میں امتثال کی کوشش کرو " تو پھر جیسا حضرت فرماتے ہیں ۔

قلب کا پریشان نہ ہونا : اس کے بعد حقیقی مصیبت نہ آئے گی ۔ یعنی ظاہری مصائب مرض و موت رنج وغیرہ تو ہوں گے ' مگر اطاعت کی برکت سے تمہارا قلب پریشان نہ ہوگا ' جیسے کہ بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے تو وہ کسی چیز

---

(۱) ہم اس بستی والوں پر اس کی کرتوتوں کی بدولت آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں ۔ ۱۲

سے پریشان نہیں ہوتا ۔ اسی طرح مطیع کو چونکہ قرب حق نصیب ہوتا ہے ۔ للذا یہ بھی پریشان نہیں ہوتا (الرفیق ص ۸۳)

مصائب کے باوجود قلب کے پریشان نہ ہونے یا دل کے نہ گھبرانے کا نکتہ ہے بڑا اہم ' مگر کوئی بڑی باریک بات نہیں ' آدمی اگر ذرا سوچے تو روزانہ کی زندگی میں برابر اس کے تجربات ہوتے رہتے ہیں ' کہ جتنا زیادہ کسی محنت و مصیبت کا انجام خوشگوار ہوتا ہے ' اتنی ہی وہ مصیبت کم ناگوار ہوتی ہے اور دل کی پریشانی یا گھبراہٹ کیسی وہ تو اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس مصیبت کو بھی خوشی خوشی جھیلتا ہے ۔ اسٹیشن پر جس قلی کی معمولی و متوقع مزدوری مثلاً دو آنے ہو اس کو اگر چار آنے آٹھ آنے دے دو تو دونا سامان لادے گا کہ " مزدور خوش دل کند کار بیش " اور اس سے خواہ اس کی گردن اور کمر ٹوٹ رہی ہو ' مگر دل ہی دل میں خوش کہ اس کو پہنچا کر دوگنے چوگنے دام و انعام کا مستحق ہوں گا ۔ بیماری میں آدمی کو کیسی کیسی کڑوی اور بدمزہ دوائیں پینا پڑتی ہیں جن سے طبعی ناگواری اور تکلیف بھی ہوتی ہے مگر صحت کی امید میں دل پریشان نہیں ہوتا ' بلکہ خوشی خوشی ان کڑوی دواؤں کی قیمت اور ڈاکٹر کی فیس سب کچھ ادا کرتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت مصیبت جب ہی ہے جب کہ اس کا کوئی بہتر انجام و انعام نہ ہو یا اس انجام و انعام پر نظر نہ ہو ۔

انجام پر نظر کا انجام : پھر خیال کرو کہ دین کی حقیقت تو لفظاً و معناً سر بسر انجام و آخرت ہی ہے ۔ اور کیسا انجام و آخرت کہ اس کی ابدی راحت و نعمت کو نہ دنیا کی ہفت اقلیم کی بادشاہت پہنچ سکتی ہے ' اور نہ اس کے عذاب و مصیبت کے مقابلہ میں یہاں کی کوئی بڑی سے بڑی مصیبت مصیبت ہے ۔ تو جس کی نظر و فکر

میں وہاں کی راحت و مصیبت ہو ' وہ اس دنیا کی راحت کو نہ راحت جانے گا اور نہ مصیبت کو مصیبت ۔

" فرض کیجئے کہ ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ مجھے خوب پیٹا جا رہا ہے ' اور چاروں طرف سے سانپ بچھو ڈس رہے ہیں ' لیکن بیدار ہوا تو دیکھتا ہے کہ

تخت شاہی پر آرام کر رہا ہے کوئی مرچھل جھل رہا ہے کوئی عطر لا رہا ہے کوئی پان لا رہا ہے ۔ چاروں طرف لوگ دست بستہ کھڑے ہیں تو کیا اس کے دل پر اس خواب کا کوئی اثر باقی رہے گا ۔ ہرگز نہیں ۔ بلکہ اگر وہ خواب از خود یاد بھی آجائے تو طبیعت اس کو بھلا دے گی ۔ اس کے برعکس ایک شخص نے خواب دیکھا کہ میں تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوں اور تمام لوگ سامنے دست بستہ کھڑے ہیں ' اپنی حاجتیں پیش کر رہے ہیں اور میں پورا کر رہا ہوں ۔ لیکن آنکھ جو کھلی تو دیکھتا ہے کہ ایک شخص سر پر جوتیاں مار رہا ہے ' اور بہت سے سانپ بدن کو لپٹے ہوئے ہیں ' اور ایک کتا منہ میں موت رہا ہے ۔ تو کیا بیداری کی اس مصیبت کے بعد بھی خواب کی کسی قسم کی مسرت اس کے دل پر رہ سکتی ہے کبھی نہیں ۔ پس دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں بالکل ایسی ہے ' جیسے خواب کی بیداری کے مقابلہ میں ۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

حال دنیا راچو پر سیدم زیک فرزانہ
گفت یا خوابیست یا بادیست یا افسانہ
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے بہ بست
گفت یا غولے ست یا دیویست یا دیوانہ

تو واقعی دنیا کی مثال خواب ہی کی سی ہے کہ عمر بھر عیش کیا اور مرنے کے ساتھ ہی پکڑا گیا تو وہ عیش کیا کام آئے گا ۔

خوشی و غم کا تعلق مستقبل سے : بات یہ ہے کہ اس دنیا میں بھی ہماری نظر آج سے زیادہ کل پر یا حاضر سے زیادہ مستقبل پر رہتی ہے ۔ اور ہماری خوشی و غم

کا زیادہ سرمایہ مستقبل ہی کی امید و بیم سے وابستہ رہتا ہے حتی کہ مستقبل کی کوئی امید پوری ہو کر جب حال بن جاتی ہے ' تو اس کی مسرت زیادہ دیرپا نہیں رہتی ۔ اس سے آگے ایک نیا مستقبل اور نئی تمنا ہم پیدا کرلیتے ہیں ۔ اور پھر اس کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور زیادہ لطف و لذت اسی کے تصور سے اٹھاتے ہیں خواہ وہ تمنائی مستقبل شیخ چلی کے منصوبوں سے زیادہ نہ ہو ! خلاصہ یہ کہ آج بھی وہی آدمی زیادہ مسرور و مطمئن رہ سکتا ہے جو اپنے کل کو آج سے یا استقبال کو حال سے بہتر جانتا اور پاتا ہو ۔ مستقبل تاریک ہوا تو حاضر کا لطف و لذت بھی تلخ ہو جاتا ہے انسان کی آخرت خود عاقبت اندیش فطرت کے خالق نے اس دنیا یا حاضر کے غم و الم کو بے حقیقت و ناقابل التفات ٹھہرانے کے لئے کافر کے مقابلہ میں اس رازو حقیقت کی طرف اس آیت میں متوجہ فرمایا ہے کہ " ان تکونو تالمون فانهم یا لمون کما تالمون و ترجون من الله مالا یرجون " یعنی اگر تم کو اس دنیا میں غم و الم سے دو چار ہونا پڑا ہے ' تو اس سے تو کافر بھی نہیں بچ سکتا ' لیکن اصلی خوشی و مسرت کی بات جو ہے ' وہ تمہارے ہی پاس ہے کہ تمہارا مستقبل پر امید ہے اور اپنے خدا سے تم جو امیدیں رکھتے ہو ان سے کافر محروم ہیں ' اسی کو حضرت علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ " دنیا کی راحت و مصیبت آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے "۔

دنیا کی راحت و مصیبت آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے :۔

واقعی وہاں جا کر نہ یہاں کا عیش عیش رہے گا اور نہ مصیبت مصیبت اور آخرت میں تو یہ گزشتہ چیزیں کیا یاد رہتیں ۔ دنیا ہی میں دیکھ لیجئے کہ عمر گزشتہ بیش از خواب نہیں ۔ زمانہ گزرتا چلا جاتا ہے کہ جیسے برف کا ٹکڑا پگھلنا شروع ہوا تو ختم ہی ہو کر رہتا ہے ۔ اسی واسطے حدیث شریف میں ہے کہ جب قیامت کے روز اہل مصیبت کو بڑے بڑے درجے عنایت ہوں گے تو اہل نعمت کہیں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں مقراض سے کاٹی گئی ہوتیں ' لیکن آج ہم کو یہی درجے ملتے ۔ تو اس حالت پر نظر کرکے بے تامل کہنا پڑتا ہے کہ دنیا میں کچھ بھی نہ ملتا تب

بھی کچھ حرج نہ تھا "۔

سچ پوچھو تو دنیا میں انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہی رنج و راحت کا ہے۔ جس کے لئے مدعیان عقل قنوطیت و رجائیت کے بڑے بڑے فلسفے چھانتے ہیں ' اور بعضوں کو تو خود کشی کے سوا دنیا کے مصائب سے نجات و مفر کی کوئی شکل ہی نظر نہیں آئی ۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اس فانی زندگی کا کوئی باقی و بہتر " خیر و ابقی " مستقبل اگر نہیں تو اس میں جو کچھ تھوڑی بہت راحت و عزت ہے وہ بھی کوئی ایسی نہیں ' جس کا مصیبت و ذلت کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ نہ ہو ' اور جس سے مسرور و مطمئن کوئی ویسا ہی بے حس و بے حیا " وحشی " رہ سکتا ہے جس کا لطیف قصہ حضرت علیہ الرحمتہ نے جابجا نقل فرمایا اور جو دراصل لطیف قصہ نہیں بلکہ دنیا پرست کی زندگانی کا بڑا کثیف واقعہ ہے ۔

دنیا کی راحت و عزت کی مثال : ایک سرحدی وحشی ہندوستان آیا تھا کسی حلوائی کی دکان پر حلوہ رکھا دیکھا قیمت پاس نہ تھی آپ اس میں سے بہت سا اٹھا کر کھاگئے ۔ حلوائی نے حاکم شہر کو اطلاع کی ۔ حاکم نے یہ سزا مقرر کی اس کا منہ کالا کرکے جوتیوں کا ہار گلے میں ڈال دیا جائے اور گدھے پر سوار کرکے تمام شہر میں تشہیر کی جائے ۔ اور بہت سے لڑکے ساتھ کر دیئے جائیں کہ وہ ڈھول بجاتے پیچھے پیچھے چلیں ' چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔ جب یہ حلوہ خور صاحب اپنے گھر گئے تو لوگوں نے پوچھا کہ آغا ہندوستان چہ گونہ ملک است ۔ کہنے لگے ہندوستان خوب ملک است حلوہ خور دن مفت است ۔ فوج طفلان مفت است سواری خرمفت است ۔ ڈم ڈم مفت است ہندوستان خوب ملک است ۔

بس دنیا کے حشم و خدم پر ناز کرنا ایسا ہی ہے ' جیسا اس نے سواری خر اور فوج طفلان پر ناز کیا تھا ۔ صاحبو یہ بے حسی ہے واللہ اگر حس صحیح ہو تو یہ سب عذاب نظر آنے لگے "۔

آج کل سب سے زیادہ ترقی و عزت حکومت میں سمجھی جاتی ہے ' جس کی

حرص و ہوس میں جہنم سے پہلے ہی ساری دنیا اپنے ہاتھوں جہنم بنالی گئی ہے۔ اس کی نسبت اس سرحدی وحشی کے قصہ کے سلسلہ میں ارشاد ہے کہ

طلب حکومت:" حکومت دنیوی کی نسبت حدیث میں ہے کہ جس کے دس آدمیوں پر حکومت ہوگی قیامت میں اس کو مشکیں کس کر لایا جائے گا۔ اگرچہ اس کے بعد چھوٹ ہی جائے۔ آج اس حکومت کی درخواست کی جاتی ہے اس کے لئے روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی کہتا ہے تو یہ جواب ملتا ہے کہ ہم میں اگر صاحب حکومت نہ ہوں گے تو قوم تباہ ہو جائے گی"۔

آگے ذرا اس قسم کے طالب حکومت کان کھول کر سن لیں کہ

" ہم کہتے ہیں کہ ہم میں حاکم ہوں، لیکن کون شخص ہو اس کا فیصلہ خود حدیث میں موجود ہے۔ حضور فرماتے ہیں کہ " القضاۃ ثلثہ اثنان فی النار و واحد فی الجنہ " اور اس واحد کو عالم با عمل بتلایا گیا ہے (نہ یہ کہ صرف جمعیتہ العلماء یا جمعیتہ علمائے اسلام کا کارکن ہو یا کسی عربی درسگاہ کا فارغ التحصیل) تو حکومت ضروری ہے، لیکن حکومت کے لئے عالم باعمل ہونا چاہئے ——— دوسری ایک اور شرط ہے کہ حکومت کی خود درخواست نہ کرے۔ کیونکہ جو درخواست کرے گا وہ خود غرض ہوگا اور نفسانیت سے کام کرے گا۔ اس کو لوگوں کی مصلحت پر ہرگز نظر نہ ہوگی بلکہ اپنی مصلحت پر ہوگی، اور اس سے جتنی خرابیاں پیدا ہوں وہ کم ہیں"۔

" حضرت عثمانؓ نے ابن عمرؓ سے قضا کا عہدہ قبول کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے انکار کیا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ اگر تم منظور ہی نہیں کرتے تو اپنے انکار کی کسی کو خبر نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ سب ہی انکار کردیں۔ اس واقعہ سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ سلف صالحین حکومت کو کیسا سمجھتے تھے۔ اور حقیقت میں ایسا ہی شخص کام کرسکے گا۔(۱)

---

(۱) الرفیق ص ۱۳۸

اللہ اکبر اور کہاں نظر تھی ہمارے سلف صالحین کی اور کس اسفل السافلین میں ہم جا گرے ہیں کہ ادنیٰ ادنیٰ عہدہ پر اس طرح گرتے ہیں جس طرح مکھیاں غلاظت پر گرتی ہیں ۔ اسی نے آج کل حکومت کو سراپا شر و فساد ہی نہیں ' بلکہ اس کی عزت کو وہی " سواری خرو فوج طفلان " والی بے حسی و بے حیائی کی عزت بنا دیا ہے ۔

آخرت فراموشی : مطلب یہ کہ حکومت جس کو دنیا میں سب سے بڑی ترقی و عزت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے ' اس کی اہلیت و صلاحیت کی شرط بھی یہی ہے کہ نظر خود اس حکومت پر نہیں بلکہ آخرت پر ہو ۔ لیکن اس آخرت فراموشی میں غیروں کا کیا ذکر خود اپنا یہ حال ہے کہ گو

" مسلمان ایسا تو کوئی نہیں ' جس کا یہ عقیدہ ہو کہ آخرت کوئی چیز نہیں مگر حالت ضرور ایسی ہے کہ ان کے برتاؤ و معاملات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی منکر ہو ۔ کیونکہ جتنی محبت دنیا کی ہے آخرت کی وہ محبت اور شوق نہیں ۔ دنیا میں قیام کی بابت کیا کیا خیالات پکاتے ہیں کہ یوں رہیں گے یوں کریں گے جائیداد ہوگی ملازم ہوں گے ' ڈپٹی کلکٹر ہوں گے وغیرہ وغیرہ "

" انصاف سے دیکھو آخرت کے متعلق کبھی ایسی امنگیں نہیں ہوتیں ' بلکہ خیال بھی بہت ہی کم آتا ہے تو دنیا کی جس قدر محبت ہے ' نہ آخرت کی وہ محبت نہ وہاں جانے کا اتنا شوق ۔ ورنہ جیسے یہاں کی زندگی کے متعلق دل میں خیالات پیدا ہوتے ہیں ' وہاں کی زندگی کے بھی تو ہوتے ۔ اور جیسے دنیاوی امور میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں اور یہاں خوشیوں میں کھپے رہتے ہیں ایسا ہی امور آخرت کے متعلق بھی کچھ ہوتا " ------------

" پھر جیسے یہاں کی تکلیف سوچ کر تدبیر سوچتے ہو کہ شاید فلاں تدبیر سے یہ مصیبت کٹ جائے یا فلاں تدبیر سے مشکل آسان ہو جائے ایسے کبھی آخرت کی

مصیبت کو بھی سوچا ہے ۔ حالانکہ دنیا کے مصائب تو بعض ایسے ہیں کہ ان کی کوئی تدبیر ہی نہیں ۔ اس لئے اس کو سوچنا ہی عبث ہے مگر پھر بھی سوچتے ہو اور آخرت کی تو کوئی مصیبت بھی ایسی نہیں جو لاعلاج ہو ' ہر مصیبت کی تدبیر موجود ہے ' لیکن پھر بھی اس کا ذکر نہ فکر ــــــــــــــــــــ"

آخرت کی خوشی و غم : " بہر حال اگر کوئی دنیا کی خوشیاں مناتا ہے تو یہ شکایت ہے کہ آخرت کی خوشیاں کیوں نہیں منائی جاتیں اور اگر کوئی یہاں غم میں رہتا ہے تو اس کی شکایت ہے کہ آخرت کا غم کیوں نہیں کیا جاتا اور اگر کوئی خوشی منانے والا کہے کہ آخرت کی خوشی کہاں سے منائیں ' اس کی ہمیں امید ہی کہاں ہم تو گنہگار ہیں اور دنیا کی خوشی تو حاضر ہے اس کو کیسے نہ منائیں تو یہ شیطان کا دھوکا ہے ۔ اس میں دو دعویٰ ہیں اور دونوں غلط ۔ اول یہی غلط کہ دنیا کی خوشی حاضر ہے ' دوسرا بھی غلط کہ آخرت کی خوشی کہاں ۔

" پہلا تو اس لئے غلط کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یوں بیٹا ہوگا ' یوں چین کریں گے تو یہ تمہارے قبضہ میں کہاں ' ہزاروں آدمی ایسے ہیں کہ وہ سوچتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ ہے ۔ پھر اگر خوشی ہوئی بھی تو تجربہ ہے کہ تمنائیں ہمیشہ تعداد میں حاصل یا حاضر سے بڑھی ہوتی ہیں ۔ یعنی حاصل ہوتا ہے کم اور تمنا ہوتی ہے زیادہ ' تو جس کی تمنا جس قدر زیادہ ہوگی وہ ہمیشہ اسی قدر زیادہ غم میں رہے گا ۔ اللہ والے البتہ خوش رہتے ہیں ' اس لئے کہ وہ دنیا کی کچھ تمنا ہی نہیں کرتے ۔ اولاد ہوئی اس پر خوش ' نہ ہوئی اس پر خوش ' ہر حال میں راضی ۔ اور دنیا داروں کو خوشی کہاں واللہ راحت جس کا نام ہے (یعنی راحت قلب) اگر وہ حاصل نہ ہوئی تو پھر اس کا جتنا سامان ہوگا اتنا ہی زیادہ موجب تکلیف اور موجب حسرت ہوگا ۔ لوگ روپیہ ' پیسہ کو راحت سمجھتے ہیں ' حالانکہ راحت روپیہ پیسہ نہیں ورنہ چاہئے تھا کہ صندوق کو (جس میں وہ رہتا ہے) زیادہ راحت ہوتی ۔ مگر یہ لوگ صندوق سے بھی بدتر ہیں ' کیونکہ اس کو ادارک الم کا

تو نہیں اور یہ لوگ آلام میں مبتلا ہیں تو معلوم ہوا کہ دنیا دار بہت کم آرام میں ہیں "۔

آخرت کی بڑی سے بڑی خوشی اختیاری ہے: اور دوسری بات یہ کہ آخرت میں کون سی خوشی ہے۔ اس لئے غلط ہے کہ وہ بعد وعدہ آلہیہ کے تمہارے اختیار میں ہے آخرت کی کوئی راحت بھی ایسے نہیں جو تمہارے اختیار میں نہ ہو۔ خدا کی یہ رحمت کی کتنی بڑی سے بڑی تمنا ہو وہ باستثنائے منصوص مثلاً درجات نبوت ' سب اس کے اسباب کی مباشرت یا اختیار کرنے سے ضرور پوری ہوتی ہے۔ مثلاً اگر چھوٹے درجے کا عاصی و گنہگار آدمی بڑے درجہ مثلاً حضرت جنید کے درجہ میں جانا چاہے تو جاسکتا ہے ' اس طرح کہ اپنے اعمال میں ترقی کرے تو بس وہاں تو خوشی ہی خوشی ہے ' جو بالکل اپنے اختیار میں ہے۔

تو اس کی فکر کرو اور اس کی امنگیں پیدا کرو اور اس کی تدبیر کرو یعنی معصیت کو چھوڑو ' نمازیں پڑھو جو اب تک چھوٹ گئی ہیں ان کی قضا کرو ' زکوۃ دو (اسی طرح تمام اختیاری احکام کی پابندی کرو) اس کے بعد سب خوشی تمہارے ہی واسطے ہے ' اور تم کو حق ہے کہ خوشی مناؤ "۔

" اسی طرح اگر کوئی مصیبت زدہ کہے کہ یہاں کی مصیبت تو حاضر ہے اس لئے اس کا اہتمام ہے اور وہاں تو اللہ غفور رحیم ہے پھر کیوں غم کریں تو سمجھو کہ یہ بھی شیطان کا دھوکا ہے غفور رحیم نے یہ وعدہ کہاں کیا ہے کہ خواہ تم کچھ ہی کرو میں تم کو جنت میں بلاعقوبت اول ہی بار داخل کردوں گا "۔ (الرفیق ص ۳۴ ' ۳۵)

آخرت کی سعی میں ناکامی نہیں: جس طرح آخرت کی بڑی سے بڑی خوشی کا حاصل کرلینا آدمی کے خود اپنے اختیار کی بات ہے ' اسی طرح آخرت کی سعی میں ناکامی و نامرادی کا بھی قطعاً احتمال نہیں۔ کیونکہ وہاں کی کامیابی نام ہے اپنے اختیار و امکان بھر خدا کی رضا و ثواب کے حصول کی نفس سعی کا ' نہ کہ کسی خاص

نتیجہ تک پہنچنے کا ۔ اگر کوئی شخص نماز جماعت کے ارادہ سے گھر سے چلا اور مسجد پہنچنے سے پہلے ہی راستہ میں اچانک مرگیا ' تو اس کے ثواب میں قطعاً کوئی کمی نہ ہوگی کہ اصل مطلوب طلب ہے حصول نہیں ۔ حتی کہ بیماری آزادی کی معذوری میں آدمی کا وہ سارا نیک عمل لکھا جاتا ہے جو صحت و تندرستی میں کرتا تھا ۔ بخلاف دنیوی سعی کے کہ مثلاً ایک شخص نے اپنے لڑکے کو وکیل بنانے کے لئے ۲۵ ' ۲۰ سال تک پڑھوایا لکھوایا ہزاروں روپیہ خرچ کیا ' لیکن جس دن امتحان میں اس کی کامیابی کا نتیجہ نکلا اسی دن خدانخواستہ گھر سے اس کا جنازہ نکلا ' تو فرمائیے اس غریب کی عمر بھر کی محنت و مشقت اور والدین کے سینکڑوں ہزاروں کے خرچ کا دنیا و آخرت کے خسران کے سوا کیا نتیجہ نکلا !

" غرض دنیا کی یہ حالت ہے کہ کوشش سے کبھی تو حاصل ہوتی ہے (بلکہ دل بھر کر پوری کبھی کسی کو بھی حاصل نہیں ہوتی) اور کبھی کوشش ناکام ہوجاتی ہے ۔ اور آخرت کے لئے سعی کسی حال میں ناکام نہیں ۔ اگر کوئی شخص کسی عمل آخرت کا اہتمام کرے اور وہ حاصل بھی نہ ہو یا پورا نہ ہو جب بھی اس کا ثواب ملتا ہے ۔ یہاں سے عوام کی ایک اور غلطی بھی معلوم ہوگئی کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن صحیح کرلو تو جواب میں کہتے ہیں کہ اب بوڑھے طوطے کیا پڑھیں گے ۔ یہ جواب بالکل غلط ہے ۔ آپ کا کام صرف کوشش ہے ۔ صحت ہو یا نہ ہو ۔ اگر تم کوشش میں لگ جاؤ ' پھر کامیابی کا درجہ حاصل نہ ہو ' تب بھی ثواب ملے گا ۔ بلکہ دونا ثواب ملے گا ۔ ایک محنت کا اور ایک ناکامی کی حسرت کا ' یا یہ کہو کہ ایک پڑھنے کا اور ایک زیادہ مشقت کا اور ناکامی پر ثواب ملنے سے حیرت نہ کیجئے ۔ حدیث میں تصریح ہے والذی یتتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران یعنی جو قرآن میں اٹکتا ہے اور وہ اس پر دشوار معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو دو اجر ملیں گے ۔ اسی بناء پر اہل اللہ نے ناکامی کو سبب ثواب قرار دیا ہے ۔

"حضرت رابعہ نے جب حج کیا تو حج سے فارغ ہو کر جناب باری میں عرض کیا کہ میں نے حج کرلیا اب ثواب دیجئے خواہ حج قبول ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ۔ اگر قبول ہوا ہو تب تو حج مبرور پر ثواب دینے کا آپ کا وعدہ ہی ہے اور اگر قبول نہیں ہوا ' تو یہ سخت مصیبت ہے کہ ----

از در دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

اور مصیبت زدہ کے لئے بھی آپ نے ثواب کا وعدہ فرمایا ہے ۔ اس لئے بہرحال ثواب دینا پڑے گا ۔ اور حضرت رابعہ نے جو یہ عنوان اختیار فرمایا یہ ناز کا مقام ہے ' جو ہر ایک کا مقام نہیں ۔ ہمارے لئے تو نیاز ہی زیبا ہے کہ ۔ ع ۔
زشت باشد روئے نازیبا و ناز ۔
بے شک یہ ناز تو مقام ناز ہی والوں کو زیبا ہے ۔ لیکن ہم گنہگار بھی اگر راستہ چلتے رہتے ہوں خواہ گرتے پڑتے سہی تو اس کی رحمت کے سہارے ایسی صورت کو اپنا مقام رجا تو بنا ہی سکتے ہیں ۔

نامرادی میں بھی مزہ : اور یہ مضمون سالکین کے بڑے کام کا ہے کہ دین کے راستہ میں اگر کوشش ناکام بھی ہو یا کمزور ہو جب بھی اجر ملے گا -------- اگر تم نے قرآن صحیح کرنے کی کوشش کی اور نہ ہوا تو حرج کیا ہے خدا تو راضی ہوگیا ۔

" ہمارے ایک مجمع نے ایک موقع پر ایک دینی کام کی کوشش کی تھی اور ناکام رہے تو ایک بددین نے اعتراض کیا کہ ان لوگوں کو کیا حاصل ہوا ۔ ایک اللہ کے بندہ نے جھلا کر جواب دیا ۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا

مولانا فرماتے ہیں ----

گر مرادت را مذاق شکرست

بے مرادی نے مراد دلبرست

مراد میں تو مزہ ہے ہی نامرادی میں بھی ایک مزہ ہے وہ یہ کہ محبوب نے تو

دیکھ لیا کہ ہم نے کسی کو طلب کیا تھا اور وہ نہیں ملا ----

ہمنیم بسکہ داند ماہ رویم

کہ من نیز از خریداران اویم (۱)

حقیقت یہ ہے کہ " با آخرت " و " بے آخرت " یا دین و بے دینی کی دنیا کے رنج و راحت ' خوشی و غم میں یہ بڑا زمین و آسمان کا فرق ہے کہ دینی زندگی کی سعی و طلب کا ہر قدم عین منزل و مراد اس لئے عین کامیابی ہے اور بے دینی کی زندگی اپنی سعی و طلب کی اگر مظنون و مشکوک مراد تک نہ پہنچی تو بیگار یا بے مزد کی مزدوری و مشقت کے حرمان و حسرت کے سوا کیا ملا! تجارت میں آخرت یا خدا کے احکام و رضا مندی کو پیش نظر رکھنے والے کو اگر خسارہ بھی رہا تو ظاہری و عارضی خسارہ ہے ' لیکن اگر بے آخرت والے کی تجارت بیٹھ گئی تو اس کا کلیجہ ہی پھٹ جاتا ہے پھر جب انسان کی دنیاوی خواہشوں اور ارمانوں کا قدم ہمیشہ اس کی کامیابیوں سے آگے ہی رہتا ہے ' تو عقل و تجربہ دونوں سے معلوم و مشاہدہ ہے کہ دنیا کا کامیاب سے کامیاب آدمی بھی ناکامی ہی کے غم میں مرتا ہے کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان و لیکن پھر بھی کم نکلے

---

(۱) وعظ الفانی ص ۱۶ ' ۱۵ - ۱۴

غرض اگر اس زندگی کا دامن آخرت سے کاٹ دیا جائے تو پھر نہ اس کے غم اور آلام و مصائب کی کوئی حد رہتی ہے ۔ اور نہ اس کی خوشیاں خوشیاں رہتی ہیں الا آنکہ کوئی بے حس و بے حیا " حلوہ خوردن مفت " اور " سواری خر و فوج طفلان " ہی کو عزت کا معیار بنا اور سمجھ لے !

بخلاف اس کے دین و آخرت کے تعلقات و تصورات کو جس پہلو سے بھی دیکھو وہ مسرت تو مسرت مصیبت میں بھی مسرت کی چاشنی پیدا کر دیتے ہیں ۔ اولاد کی موت سے بڑھ کر کون سا صدمہ جانکاہ ہوگا ۔ جس کے بدلے آدمی خود مرنے کو تیار ہوجاتا ہے ۔ لیکن

" اگر آخرت یاد ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف سرائے کی دو روزہ تکلیف سے زیادہ نہیں ستاسکتی اور وطن اصلی کو یاد کرکے راحت ہو جایا کرتی خواہ کتنی ہی بڑی مصیبت ہوتی ۔ مثلاً اس شخص کا پیارا بچہ مر جاتا ہے ' تب بھی اس کو پریشانی نہ ہوتی ۔ اگر کوئی شخص سفر میں ہو اور اس کا کوئی بچہ گم ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ گھر چلا گیا ہے جہاں میں بھی جا رہا ہوں تو کیا وہ روئے پیٹے گا ۔ ہرگز نہیں ۔ بلکہ یہ معلوم ہو کر اطمینان ہو جائے گا کہ اب کوئی دن میں میں بھی اس سے جا ملتا ہوں ۔ تو اگر آخرت کو ہم اپنا وطن سمجھتے تواولاد کے جاتے رہنے پر اتنا بڑا قصہ لے کر نہ بیٹھا کرتے " ۔

البتہ عارضی مفارقت کا غم ایسی صورت میں طبعًا و قدرۃً ہوگا ' جیسے سفر کا کوئی رفیق وطن ہم سے پہلے پہنچ جائے تو رفاقت کی اس عارضی جدائی کا طبیعی رنج ہوگا ' لیکن ساتھ ہی خوشی بھی کہ وہ اپنی آرام کی جگہ جا پہنچا اور اس سے تسلی ہوگی کہ ہم بھی عنقریب اس سے جا ملنے والے ہیں ۔ اسی کو آگے فرمایا کہ

" جدائی کا غم ہوتا ہے ' سوا اس کا مضائقہ نہیں ' اس کی اجازت ہے ۔ لیکن جیسے جدائی کا غم ہوتا ہے تسلی بھی تو ہونی چاہئے کہ وہ اپنی راحت کی جگہ پہنچ گیا ' ہم بھی وہیں جائیں گے اور مل لیں گے ۔ خدا تعالیٰ نے یہی مضمون اس

آیت کے دوسرے جملہ میں سکھلایا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ یعنی جو چیز گئی خدا کے پاس گئی اور ہم بھی خدا کے پاس جائیں گے اور سب کے سب جمع ہو جائیں گے تو اس کو سوچ کر تسلی ہونی چاہئے تھی ۔ لیکن اب تو وہ مار دھاڑ ہوتی ہے کہ گویا خدا تعالیٰ نے ان کی جائیدا چھین لی ۔

بڑی بھاری غلطی : "پس بڑی بھاری ہماری غلطی یہ ہے کہ ہم نے دنیا کو اپنا گھر سمجھ رکھا ہے' اس لئے یہاں سے جدا ہونے کا رنج و غم ہوتا ہے ورنہ جب آدمی سفر میں جاتا ہے تو جتنا گھر سے قریب ہوتا جاتا ہے خوشی بڑھتی جاتی ہے ۔ اور یہاں یہ حالت ہے کہ جوں جوں مرنے کے دن قریب آتے ہیں روح فنا ہوتی ہے ۔ بخلاف اہل اللہ کے کہ ان کو اس کا ذرا غم نہیں ہوتا' نہ اپنے مرنے کی پروا ہوتی ہے نہ اولاد کے مرنے کی ۔ حتیٰ کہ بعض دفعہ جہلا کو ان کے سنگدل ہونے کا شبہہ ہوجاتا ہے ۔ ان سے زیادہ تو کوئی رحم دل ہی نہیں ہوتا ۔ مگر اس پریشانی نہ ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ آخرت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں' اس لئے ان کو اولاد کے مرنے کا غم اتنا ہی ہوتا ہے' جتنا سرائے سے لڑکے کے گھر چلے جانے پر مسافر باپ کو ہوتا ہے کہ ایک گونہ مفارقت سے قلق ہوا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ خود مرنے کے قریب ہوتا ہے تو خوشیاں مناتے ہیں' جس طرح سفر سے واپس آتے گھر کے قریب پہنچ کر خوشیاں منائی جاتی ہیں ۔ اسی خوشی کو ایک بزرگ کہتے ہیں ۔

خرم آن روز کزیں ویران بروم
راحت جان طلبم و زپئے جاناں بروم ۰
نذر کردم کہ اگر آید بسرزیں غم روزے
تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بزدم

احقر راقم نے خود اپنی آنکھوں حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدری آبادی رحمتہ اللہ علیہ (جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے) کے اس حال کو دیکھا کہ موت کے

لئے بے تاب معلوم ہوتے تھے ۔ کبھی کبھی فرماتے کہ خودکشی حرام نہ ہوتی تو اب ضبط نہیں کر سکتا تھا ۔ احقر کے علاوہ بھی حیدآباد میں حضرت موصوف کے اس حال کے دیکھنے والے اور جاننے والے بہت سے موجود ہیں ۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمتہ نے اسی طرح مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی قدس سرہ کا حال نقل فرمایا ہے کہ " ایک شخص نے کہا کہ حضرت اب تو آپ بوڑھے ہوگئے ' آپ نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرمایا کہ الحمد للہ اب وقت قریب آیا " ۔

" مگر ان حکایات سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان کو اپنے اعمال یا مقبول ہونے پر ناز ہوتا ہے ' اس لئے اعمال کا مواخذہ نہ ہونے سے خوش ر۔ہ ہیں ۔ استغفر اللہ ناز کی مجال کسی کو ہے ۔ بلکہ خوشی صرف اس لئے ہوتی ہے کہ وہ آخرت کو گھر سمجھتے ہیں ۔ رہی یہ بات کہ ان کو اپنے داروگیر کا اندیشہ ہوتا ہے یا نہیں ' تو سمجھو کہ اندیشہ ضرور ہوتا ہے ' لیکن رحمت خداوندی سے امید بھی ہوتی ہے کہ انشاء اللہ پھر چھوٹ جائیں گے ' جیسے کسی کا گھر ٹوٹا پھوٹا پڑا ہوا اور سرائے کا نہایت پختہ ہو تو وہ اپنے گھر ہی کو پسند کرے گا اور سوچے گا کہ اگرچہ اس وقت میرا گھر ٹوٹا پھوٹا ہے ۔ لیکن انشاء اللہ اس کو پختہ کرلوں گا ۔ اس طرح اگرچہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے ' مگر جانتے ہیں کہ ایمان کی سلامتی تو ضرور رحمت ہوگی ۔ غرض وطن سے طبعی محبت ہوتی ہے گو وہاں کچھ تکلیف بھی ہو ۔ تو کوئی یہ شبہہ نہ کرے کہ ان کو ناز ہوتا ہے " ۔

علیٰ ہذا اگر سرائے پختہ نہ ہو اس میں راحت کا سامان نہ ہو یعنی سفر آرام سے نہ گزر رہا ہو ' لیکن آدمی چونکہ سفر کو سفر ہی اور سرائے کے قیام کو عارضی و چند روزہ ہی جانتا ہے ' اس لئے اس کی تکلیف کی چنداں پروا نہیں کرتا ۔ لہٰذا اس زندگی کی سرائے دنیا میں بھی

" سارے غم اس لئے ہیں کہ دنیا کو گھر بنا رکھا ہے ۔ ورنہ اس کو گھر نہ سمجھتے تو کوئی غم بھی نہ ہوتا ۔ دیکھو جب کبھی سفر میں جاتے ہیں اور کسی سرائے

میں قیام ہوتا ہے تو وہاں کی چارپائی میں کبھی کھٹمل ہوتے ہیں کبھی ٹوٹی پھوٹی ہوتی ہے ۔ مگر سوچتے ہیں کہ ایک شب تو قیام ہی کرنا ہے ' جس طرح ہو گزار دو ------ یہی حال دنیا کی تکلیفوں کا ہے ۔ سو اگر آپ دنیا کو اپنا گھر نہ سمجھتے تو اسی طرح اس کے ساتھ بھی برتاؤ ہوتا ہرگز اس کے متعلق ہر وقت تذکرہ نہ ہوتا ' نہ اس کا اس قدر سلسلہ کھینچتے ۔ بلکہ ہر بات میں زبان پر یہ ہوتا کہ ہمارا گھر آخرت ہے وہاں چین و آرام کریں گے ۔ یہاں کی ذرا سی تکلیف کیا ہے " (۱)۔

دنیا کو گھر بنانے کی حماقت : کی ذرا اور تفصیل سن لیں ' جس کی بدولت یہ ساری مصیبت ہے ۔

" ہم جو دنیا میں چاہتے ہیں کہ یہ بھی ہو جائے وہ بھی ہوجائے یہ ایسا ہی ہے ' جیسے سرائے میں کوئی یہ تمنا کرے کہ یہاں جھاڑ فانوس سب لگا دیئے جائیں اور پھر اپنی کمائی سے خرید کر لگا بھی دے تو کتنی بڑی حماقت ہے خاص کر جب یہ بھی حکم ہو کہ مثلاً چار دن سے زیادہ کوئی سرائے میں قیام نہیں کرسکے گا ۔ اس وقت تو اپنی کمائی وہاں کی آرائش میں لگانا پورا خلل دماغ ہے اور دنیا ایسی ہی محدود قیام کی سرائے ہے ۔ جس کے بعد بلا اختیار یہاں سے نکل جانا پڑے گا ۔ اول تو سرائے کا قیام اگر اختیاری ہو تب بھی یہی ہونا چاہئے کہ اس کے ساتھ گھر کا سا معاملہ نہ کرے اور جب اختیاری بھی نہ ہو تب تو ہرگز بھی اس میں دل نہ لگانا چاہئے بلکہ اس سے توحش رہنا چاہئے ۔

الدنیا سجن المومن کے معنی : اور یہی معنی ہیں میرے نزدیک الدنیا سجن المومن (۱) کے ۔ لوگوں نے اس حدیث کے مختلف معنی لئے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ جیل خانہ تکلیف وغیرہ کی وجہ سے نہیں فرمایا ۔ کیونکہ بعض مومنین

---

(۱) الرفیق ص ۳۶٬۳۷ ۔ ۱۲

(۱) دنیا مومن کے لئے جیل خانہ ہے ۱۲

کو دنیا میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی ۔ بلکہ اس لئے فرمایا کہ جیل خانہ میں کبھی جی نہیں لگا کرتا ' اگرچہ کیسا ہی عیش ہو تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں اس کا جی نہ لگے ۔ کیونکہ جی لگنے کی جگہ گھر ہے ۔ پھر جب جی نہ لگے گا تو کیوں سوچے گا کہ یوں ہو یہ ہو اور وہ ہو ۔ بلکہ اب یہ سوچے گا کہ دنیا تو پردیس ہے یہاں جس طرح بھی گزر جائے " ۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپاہج اور بے عمل ہو جائے گا ' بلکہ اس کا سارا فکر و عمل اصل گھر کی آرام و آسائش اور اس کے بناؤ سنگار کی طرف متوجہ ہو جائے گا ۔

اور دنیا کی سوچ کے بجائے اب یہ ہوگا کہ آخرت کی سوچ ہوگی کہ اس کے لئے یہ سامان ہونا چاہئے یہ فکر ہونی چاہئے اپنے نفس کی اصلاح ہونی چاہئے (قدم قدم پر حق و شریعت کے موافق عمل ہونا چاہئے) اگر یہ سامان ہوگیا تو پھر یوں بہار ہوگی یوں عیش ہوگا ' ورنہ یوں مصیبت ہوگی یوں پریشانی ہوگی ۔ اب دیکھ لو کتنے آدمی ہیں جو یہ سوچتے ہیں دنیا دار تو الگ رہے دینداروں کو بھی آخرت کے متعلق نہ امنگیں پیدا ہوتی ہیں نہ اندیشے ۔ خدا تعالیٰ صاف صاف فرماتے ہیں **یا ایھا الذین امنو اتقوالله ولتنظر نفس ماقدمت لغد واتقو الله** ۔ (۱)

آخرت کو گھر سمجھنے کا اثر : دیکھو ایک دن کا سفر ہوتا ہے تو اس میں ناشتہ بھی ہمراہ لیا جاتا ہے اور سامان بھی ہوتا ہے ۔ آخرت کا اتنا بڑا سفر درپیش ہے اس کے لئے کیا زادراہ تیار کر رکھا ہے ' بالخصوص جب کہ وہ وطن اور گھر بھی ہے تو اس صورت میں تو اس کے لئے بہت کچھ سامان ہونا چاہئے تھا یعنی قطع سفر کے لئے زاد و ناشتہ اور گھر پر بیٹھنے کے لئے کمائی اور ذخیرہ ۔

---

(۱) اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ غور کرے سوچے کہ کل کے لئے اس نے کیا تیاری کی ہے ۱۲

" پس ایک اثر تو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہئے تھا اور دوسرا اثر یہ ہونا چاہئے کہ دنیا کے حوادث سے غم نہ ہوتا نہ اپنے واسطے نہ لگے سگے کے واسطے۔ گھر تو وہاں ہے۔ اب جو موت سے ہم کو موت آتی ہے، یہ صرف اس لئے کہ اس کو گھر نہیں سمجھتے، بلکہ موت کے خیال سے ایسی حالت ہوتی ہے، جیسے کسی کو جیل خانے میں لے جاتے ہوں۔

" ہمارے حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک بوڑھا شخص آیا کہ میری بیوی مرتی ہے۔ حضرت فرمانے لگے اچھا ہوا جیل خانہ سے چھوٹتی ہے۔ کیوں غم کرتا ہے، تو بھی چلا جائے گا۔ کہنے لگا روٹی کون پکائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کیا ماں کے پیٹ سے وہی روٹی پکاتی ہوئی آئی تھی۔

" تو موت کے متعلق اس تمام رنج و کرب کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں، ورنہ اگر وہ یاد ہوتی تو موت کا کیا غم ہوتا۔

" اور ایک اثر آخرت کو گھر سمجھنے کا یہ ہونا چاہئے تھا کہ کسی سے رنج و عداوت نہ ہوتا۔ اگرچہ معمولی طور پر کسی بات پر لڑائی بھی ہو جایا کرتی۔ دیکھو ریل میں مسافروں میں لڑائی تو ہوتی ہے۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ سفر کے سامان کو چھوڑ کر کسی سے الجھنے لگیں۔ کیونکہ جانتے ہیں کہ اس سے سفر کھوٹا ہوگا۔ مگر اس طرح دنیا کے فضول قصوں میں کسی نے سوچا ہے کہ ان میں پھنسنے سے آخرت کا سفر کھوٹا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کو گھر نہیں سمجھتے۔

نیز اگر آخرت کو گھر سمجھتے تو دنیا کے سامان پر اترایا نہ کرتے۔ اگر سفر میں کہیں بیچ بند کسا ہوا پلنگ ملے تو کوئی بھی اس پر اتراتا نہیں کیونکہ جانتا ہے کہ یہ تو مانگی ہوئی چیز ہے۔ اور ہماری یہ حالت ہے کہ اگر ہمارے پاس چار پیسے ہوں تو ہم ان پر اتراتے ہیں۔ (الرفیق ص ۳۹، ۳۸)

ایک اور پہلو: یہ ہے کہ آدمی ہر کام کم و بیش تجارت کے نقطہ نظر سے کرتا ہے۔ یعنی جس کام میں مال و محنت اور وقت کا جو کچھ سرمایا لگاتا ہے، تو اس کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے اور جتنا زیادہ نفع یا نفع کی امید ہو اتنا ہی مال و وقت کے لگانے اور محنت و مشقت اٹھانے میں کلفت کم اور مسرت زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ تاجر کی تاجرانہ ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ کاروبار میں جو مصیبت و مشقت اٹھاتا ہے اگر دلخواہ اس کا نعم البدل یعنی بہترین بدل مل جائے تو وہ اس مصیبت کو سرے سے خاطر ہی میں نہیں لاتا، نہ اس کو مصیبت محسوس کرتا ہے الجبر بالصبر نام وعظ میں آیت یا ایھا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسرے ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یوتکم خیرا مما اخذ منکم و یغفرلکم (۱) کے تحت مصیبت کی اسی حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ وہ دراصل تجارت ہے۔ ارشاد ہے کہ

مصیبت کی حقیقت تجارت ہے: آیت سے یہ قاعدہ مفہوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ ہر مصیبت کا نعم البدل ہے۔ اور اس قاعدہ کو ملحوظ رکھ کر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے یہی حقیقت ہماری نظر سے غائب ہوتی ہے۔ اس لئے مصیبت سے رنج زیادہ ہوتا ہے ———— تو صاحبو اگر میں یہ ثابت کردوں کہ واقعات رنج و مصیبت تمام تر تجارت ہیں، اور تجارت بھی ایسی جس سے بڑھ کر نفع کسی تجارت میں نہیں ہوتا، تو کیا پھر بھی نالہ و شیون باقی رہے گا۔ میں رنج طبعی کا مانع و منکر نہیں جو فطری طور پر ہوتا ہے، بلکہ طبعی رنج تو ہونا چاہئے ورنہ ثواب و اجر ہی نہ ہوگا

---

(۱) اے نبی تمہارے قبضہ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ اگر اللہ کے علم میں تمہارے دل میں نیکی ہے تو وہ تم کو اس سے بہتر دولت دے گا، جو تم سے لی گئی ہے اور تمہارے مغفرت فرمادے گا ۱۲

۔ مگر واقعات رنج و مصیبت کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد رنج عقلی نہ ہونا چاہئے ۔

چار قسم کے حالات : خلاصہ یہ کہ حالات کی دو قسمیں ہیں گوارا اور ناگوار اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں اختیاری و غیر اختیاری یہ کل چار قسم کے حالات ہوئے ' جن میں سے ہر ایک کے متعلق جدا جدا حقوق ہیں ۔ اور مومن اگر ان حقوق کو ادا کرتا ہے تو اس کو نعم البدل ملتا ہے ' اس لئے مومن کو کسی حالت میں بھی نقصان نہیں ۔ بلکہ ہر حالت میں نفع ہے ۔ اسی لئے حدیث میں ہے ' کہ نعم الرجل المومن ان اصابتہ سراء حمد فان اصابتہ ضراء صبر وفی کل اجرا وکما قال ۔ یعنی مومن آدمی بڑی اچھی حالت میں ہے ' اگر اس کو راحت پہنچتی ہے حمد و شکر کرتا ہے اگر تکلیف پہنچتی ہے صبر کرتا ہے اور ہر ایک میں اجر ملتا ہے ۔ یعنی شکر میں بھی اور صبر میں بھی ۔

امور غیر اختیاریہ میں اجر کی وجہ : اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ امور غیر اختیاریہ میں جو اجر ہے ' وہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو اختیارا اس وقت مومن سے صادر ہوتے ہیں ۔ یعنی راحت میں حمد جس کی حقیقت یہاں شکر ہے اور وہ ایک عمل ہے جو حق تعالی کے حضور پیش کیا ۔ اس کے عوض میں اجر ملتا ہے ۔ اور مصیبت میں صبر کرنا بھی ایک عمل ہے ' جس پر اجر ملتا ہے ۔ بس دونوں صورتوں میں نعم البدل اس عمل پر ملا جو اختیاری ہے ۔

البتہ اللہ تعالی کے ساتھ سودا و معاملہ کرنے میں وہ نفع و نعم البدل یا اجر ملتا ہے کہ اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر (یعنی میں نے اپنے نیکو کار بندوں کے لئے جو کچھ تیار کر رکھا اس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا ' نہ کسی بشر کے دل میں خیال آیا) لہذا نماز روزہ حج زکوۃ جملہ اعمال صالحہ کا بجا لانا بھی ایک تجارت ہوئی ' جس کی شان یہ ہے کہ

خود کہ یابد این چنین بازار را
کہ بیک گل می خرد گلزار را
نیم جان بستاند و صد جان دہد
آنچہ در ہمت نہ آید آن دہد

اور اگر عبادت کا تعلق اموال سے ہو تو وہ بھی تجارت ہے' جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے صراحۃً لفظ ارشاد فرمایا ہے ان اللہ اشترے من المومنین انفسہم واموالہم بان لہم الجنہ جس میں تجارت کی حقیقت پر صاف طور پر تنبیہہ ہے۔ وقال تعالی فلیقاتل فی سبیل اللہ الذین یشرون الحیوۃ الدنیا بالاخرۃ ----- وقال تعالی اولئک الذین اشتروا لضللہ بالھدی فماربحت تجارتھم وما کانوا مھتدین وقال تعالی بئس ما شرو بہ انفسھم لو کانوا یعلمون چونکہ تجارت کی طرف طبائع عام طور پر راغب ہیں' اس لئے تجارت کا عنوان اللہ تعالیٰ نے اختیار فرمایا کہ تم جو اعمال کرتے ہو وہ درحقیقت ایک تجارتی معاملہ ہے' جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تم کر رہے ہو۔

" افسوس نماز کو ہم لوگوں نے اس لئے مصیبت سمجھ لیا ہے کہ اس کی حقیقت نہیں سمجھی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ اس کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز دے دی اور ایک لے لی تو کبھی گرانی نہ ہو اور نہ اس کو بیگار کی طرح ٹالا جائے۔ بلکہ جس طرح تاجر اپنے مال کو صاف ستھرا رکھتا ہے اور خوبصورت بنا کر خریدارکو دیتا ہے' اسی طرح ہم بھی نماز خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا کرتے "۔

غرض آخرت کے یقین و اعتقاد کے ساتھ ایمان و عمل کی ساری زندگی ایک ایسی تجارت بن جاتی ہے' جس میں نہ نفع کی کوئی انتہا نہ گھاٹے کا کوئی امکان لیکن یہاں خصوصیت سے مصائب کے متعلق گفتگو ہے۔ اس لئے

" سنئے احادیث میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصائب میں بھی تجارت کے الفاظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے ہیں۔ چنانچہ آپ کی

صاحبزادی کا بچہ مرنے لگا انھوں نے حضور کو بلایا تو آپ نے فرمایا ان اللہ ما اخذ و للہ ما اعطی و کل عندہ باجل مسمی فلتصبر و لتحتسب کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ دیا اور اللہ ہی کا ہے جو لے لیا پس صبر اور ثواب کی امید رکھیں۔

یہاں اخذ و اعطاء (یعنی لین دین ہے) اور لین دین ہی تجارت کی حقیقت۔

عجیب تجارت کہ سرمایہ بھی خریدار ہی کا: البتہ مومن کے لئے اس تجارت کی ایک اور ایسی عجیب و غریب خصوصیت ہے' جو دنیا کی کسی تجارت میں نہیں پائی جاتی کیونکہ دنیا کی تجارت میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی چیز دیتا اور دوسرے کی لیتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی تجارت ہے کہ جو چیز دی وہ بھی دراصل انہیں کی تھیں اور جو اس کے بدلے میں ملی وہ بھی انہیں کی۔ ایسا خریدار کون ہوگا جو سرمایہ بھی ہم کو خود ہی دے اور پھر زیادہ سے زیادہ نفع دے کر خود ہی خرید بھی لے لہٰذا اس اعتبار سے یہ

" محض صوری تجارت ہے حقیقی تجارت نہیں۔ کیونکہ حقیقی تجارت تو یہ ہے کہ اپنی چیز دے اور دوسرے کی لے اور یہاں جو کچھ بھی ہے سب خدا ہی کا اس کی ایسی مثال ہے' جیسے ہم بچے کو کوئی چیز بطور اباحت دیں (اباحت کی قید لگائی تاکہ آگے شرعی اعتراض نہ ہو) پھر کسی مصلحت سے اس سے لے لیں اور دوسری دے دیں۔ مثلاً کسی کو اپنی اولاد کو اصول تجارت سکھلانا ہے وہ اس کو آبگینہ کا ٹکڑا دیتا ہے اور ایک اشرفی کے بدلے میں اس کو خرید لیتا ہے تاکہ وہ آبگینہ کی حقیقت اور روپیہ اشرفی کی حقیقت سے واقف ہو جائے تو یہ درحقیقت تجارت نہیں بلکہ صورت تجارت ہے ---------

" اسی طرح حق تعالیٰ نے بعض مصالح کی وجہ سے بعض اشیاء کو ہمارے نامزد فرما دیا ہے۔ ایک مصلحت تو یہ ہے کہ نامزدگی میں بندہ کو حظ آتا ہے کہ میرا مال" میری بیوی' میرا بچہ' میری زمین' میرا مکان وغیرہ وغیرہ دوسرے یہ کہ اس سے کوئی چھین نہ سکے۔ اگر نامزد نہ ہو اور بندہ کی ملک نہ ہو تو کسی کے

پاس کوئی چیز سلامت نہ رہے۔

جاہل صوفیوں کی "حقیقت" کی حقیقت: اور یہیں سے میں کہتا ہوں کہ "حقیقت" شریعت کی محتاج ہے۔ یعنی وہ حقیقت جو عام طور پر صوفیہ کے ذہن میں ہے، ورنہ طریقت و حقیقت شریعت ہی کے اجزاء ہیں۔ مگر جس حقیقت کو جہلاء صوفیہ گاتے پھرتے ہیں میں کہتا ہوں وہ بھی شریعت کے محتاج ہے اگر شریعت نہ ہو، تو صوفی صاحب کی تسبیح و مصلی اور نذرانے اگر کوئی ملانا لے جائے پھر وہ برا نہ مانے کیونکہ

در حقیقت مالک ہر شے خداست
این امانت چند روزہ نزد ماست

جب بندہ کی کوئی شے نہیں نہ اس کو حق ملک حاصل ہے تو ملانوں کو یہ کہنے کا حق ہے کہ کچھ دنوں خدا کا یہ مال تم نے برتا اب ہم برتیں گے۔ اعتراض و ناگواری کی کیا بات۔ جیسے مولانا نے ایک جبری کی حکایت لکھی کہ وہ ایک شخص کے باغ میں گھس کر مالک کے سامنے انگور توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ اس نے کہا یہ کیا حرکت نہ اجازت لی نہ قیمت دی۔ جبری نے کہا بس خاموش بیٹھا رہ باغ بھی خدا کا، پھل بھی خدا کے، میں بھی خدا کا تو روکنے والا کون، مالک باغ ہوشیار تھا اس نے اپنے غلام کو آواز دی کہ ایک رسی اور ڈنڈا لانا۔ غرض دونوں نے جبری کو باندھا اور کٹائی شروع ہوئی اب لگا چلانے۔ مالک باغ نے کہا کہ رسا بھی خدا کا، ڈنڈا بھی خدا کا میں بھی خدا کا تو بھی خدا کا پھر چلاتا کیوں ہے۔

" تو صاحبو اگر حقیقت واضح کر دی جائے تو سب آدمی بالشویک ہوجائیں جن کا دعویٰ ہے کہ سب انسان مساوی ہیں کسی کو کسی سے زیادہ مالدار بننے کا حق نہیں، بلکہ جس کے پاس زیادہ مال ہوتا ہے، اس سے لے کر غریبوں کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب نے مثنوی کے اس شعر کا کہ

سر پنہاں ست اندر زیر و بم
فاش گر گویم جہاں برہم زنم

یہی مطلب بیان فرمایا تھا کہ اگر مسئلہ وحدۃ الوجود ظاہر کردوں تو عالم میں فساد برپا ہو جائے ۔ کم فہموں کی نظر سے امتیاز اٹھ جائے ۔ یہ جو عالم میں نظام و امن قائم ہے شریعت ہی کی بدولت ہے کہ یہ زید کا حق ہے یہ عمر کا حق ہے ' اور دوسرے کے حق میں تصرف حرام ہے ۔

خیر یہ تو درمیان میں ایک مزیدار جملہ معترضہ تھا ' جس کو چھوڑنے کا جی نہ چاہا ورنہ گفتگو یہ تھی کہ رحمت نے اپنے بندوں کے ساتھ تجارت کا ایسا عجیب معاملہ فرما رکھا ہے کہ خود ہی سرمایہ عطا فرماتے اور خود ہی اس کو خرید کر الٹے بندہ کو نفع عطا فرماتے ہیں ۔ گویا ہم کو اپنے پاس سے کچھ لگائے یا خرچ کئے بغیر نفع ہی نفع ملتا ہے ۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہ ہونا چاہئے کہ

" اگر کوئی آقا اپنے غلام سے کہہ دے کہ پلنگ تمہارا ہے ' جس میں مصلحت یہ ہو کہ دوسرے غلام اس کو تنگ نہ کریں بلکہ اس کی نامزد چیز میں بلاتکلف اس کو تصرف کرنے دیں ۔ اب اگر یہ غلام آقا کو بھی اس پلنگ پر بیٹھنے سے روکنے لگے تو یقیناً وہ بڑا نمک حرام ہوگا ۔ صاحبو یہی حالت ہماری ہو رہی ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ کہ خدا تعالیٰ نے ہماری مصلحت کے لحاظ سے نامزدگی فرمائی تھی لیکن ہم خود خدا کے تصرف کو بھی ان چیزوں سے روکنا چاہتے ہیں ۔ اور اگر وہ کوئی تصرف کرتے ہیں تو ہم پیٹ پھاڑ کر مرے جاتے ہیں ۔ حالانکہ جو چیز خزانے میں پہنچ جائے وہ تو زیادہ محفوظ ہو جاتی ہے " ۔

حاصل یہ کہ اگر ہمارے پیش نظر آخرت کی تجارت اور وہاں کا سود و زیان ہو تو دنیا کی کوئی مصیبت حقیقی مصیبت نہیں رہ جاتی ۔ خصوصاً جب یہ بھی معلوم کہ جس جان و مال کے ضرر و زیاں سے ہم کو مصیبت پہنچتی ہے ' وہ سرے سے ہمارا تھا کب ' اور جو کچھ تھا بھی تو ایسی جگہ اور ایسے کے پاس پہنچ گیا ' جہاں

ہمارے پاس سے زیادہ محفوظ و بے خطر ہے ۔ ایمان و اعتقاد کی دولت نصیب ہو تو یہ ایسی موٹی بات ہے کہ ایک عامی اور دیہاتی بھی اس کو بے تکلف سمجھتا ہے ۔ چنانچہ جب

ایک بدوی کی عجیب تعزیت : حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور حضرت عبداللہ بن عباس کو بہت صدمہ ہوا تو ایک بدوی (دیہاتی) نے آکر اشعار میں ان کو تسلی کی ۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس بدوی سے بہتر کسی نے تسلی نہیں دی ۔ کہتا ہے کہ

خیر من العباس اجرک بعده
واللہ خیر منک للعباس

آپ کے لئے حضرت عباس کے زندہ رہنے سے وہ اجر بہتر ہے ' جو ان کے وصال پر آپ کو ملا ۔ کیونکہ حضرت عباس اگر زندہ رہتے تو بہت سے بہت حضرت عباس آپ کو ملتے اور آپ کے حق میں ثواب اس سے بہتر ہے ۔ کیونکہ ثواب کی حقیقت ہے رضائے خدا ' تو یوں کہئے کہ حضرت عباس کے وصال پر صبر کرنے سے خدا آپ کو ملا ۔ اور یقیناً خدا تعالیٰ سب سے بہتر ہیں ۔ اور حضرت عباس کے لئے خدا آپ سے بہتر ہے ۔ کیونکہ وہ خدا کے پاس پہنچ گئے اور اگر نہ مرتے تو دنیا میں رہتے ۔ جس میں رویت الٰہی نہ ہوسکتی ۔ اور اگر آج نہ بھی مرتے تو کسی نہ کسی دن ضرور مرتے ۔

" اور سنئے حدیث میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو صحابہ کو غیب سے اس طرح تسلی دی گئی کہ ان فی اللہ عزاء من کل مصیبۃ و خلفا من کل فائت فباللہ فثقوا و ایاہ فارجوا فانما المحروم من حرم الثواب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر مصیبت سے تسلی کے لئے کافی ہے ' اور وہ ہر فوت ہونے والی چیز کا عوض ہیں ۔ اس پر بھروسہ رکھو اور اسی سے امید رکھو ۔ کیونکہ محروم تو وہ ہے جو ثواب (یعنی رضائے حق) سے محروم رہے صاحبو یہ

کیا تھوڑی بات ہے کہ تمہارے عزیز کے بدلے خدا ملتا ہے ۔ پس اب تو ایسے موقع پر یوں کہنا چاہئے کہ

روز ہاگر رفت گو رو باک نیست
تو بمان اے آنکہ جز تو پاک نیست

صوفیوں کی بڑی ہوشیاری : کیا اس سے بھی آپ کی تسلی نہ ہوگی کہ آپ کو اپنے عزیز کے بدلے خدا مل جائے ' (۱) جس کی جنت بھی ہے دوزخ بھی ۔ یقیناً جنت کے ملنے سے خدا کا ملنا بدرجہا بہتر ہے اور جس کو خدا مل گیا اس کو ساری خدائی مل گئی ۔ حضرات صوفیاء کی یہی تو سب سے بڑی معرفت و ہوشیاری ہے کہ انہوں نے اصل مطلوب و مقصود جنت سے بھی بڑھ کر خود خدا کو بنالیا ۔ اس پر حضرت علیہ الرحمہ ایک بڑے مزے کی حکایت نقل فرمایا کرتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید نے ایک دفعہ عید کے جشن میں یہ اعلان کر دیا کہ

" دربار میں جتنی چیزیں موجود ہیں ان میں سے جس چیز پر جو ہاتھ رکھ دے وہ اس کی ہو جائے گی ---------- کسی نے جواہرات پر ہاتھ رکھا ۔ کسی نے سونے چاندی پر ۔ ایک باندی نے جو ہارون الرشید کو پنکھا جل رہی تھی خلیفہ کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا ۔ خلیفہ نے برہم ہو کر سوال کیا کہ یہ کیا حرکت ۔ کہا حضور کا اعلان عام تھا اس میں کوئی استثناء نہ تھا تو میں نے دیکھا یہ درباری بیوقوف ہیں ' جو سونے چاندی اور جواہرات پر ہاتھ دھر رہے ہیں ۔ میں نے سوچا ایسی چیز پر ہاتھ دھرنا چاہئے جس کے ہاتھ میں سب چیزیں ہیں اس لئے حضور پر ہاتھ رکھ دیا کہ جب آپ میرے ہوں گے تو یہ سب چیزیں میری ہو جائیں گی " ۔

(تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبی کچھ مل جائے)

---

(۱) الجبر بالصبر ۲۵٬۲۷ ۔ ۱۲

تو بتلاتے ئے کہ ان واقعات مصیبت میں کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ ان کے ذریعہ سے خدا ملتا ہے ۔ جس کی جنت بھی دوزخ بھی ۔ یہاں ایک وسوسہ کا ضمناً کیسا دلچسپ ازالہ فرمایا گیا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ

" شاید کسی کے دل میں یہ وسوسہ آیا کہ دوزخ ہماری ہوگئی تو کیا نفع ہوگا ۔ کیا ہم دوزخ میں رہیں گے ۔ افسوس آپ نے بات کو سمجھا ہی نہیں دنیا میں جیل خانہ بادشاہ کی ملک ہوتا ہے تو کیا بادشاہ جیل خانہ میں رہتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ تم جس کو چاہو گے بخشوا لو گے اور جہنم سے نکلوالو گے ۔ اس پر شاید کہیں کہ کیا کفار کو بھی بخشوائیں گے اس کا جواب (اور کیسا عجیب و غریب جواب) یہ ہے کہ جس کے تعلق سے جہنم بواسطہ آپ کی ملک ہوگی ہے جب وہ کفار کو بخشا نہ چاہئیں گے تو تم بھی نہ چاہو گے " ۔

مصیبت کی تجارت دنیا میں بھی نفع سے خالی نہیں : بہرحال خدا کامل جانا یا جنت و دوزخ کا ہماری ملک میں آ جانا یہ تو آخرت کا وہ نعم البدل یا بہترین بدل و نفع تھا جو مصیبت کے سرمایہ تجارت سے ہم کو ملتا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں اس تجارت کا کوئی نفع یا نعم البدل سرے سے نہیں ملتا ۔

" دنیا میں بھی ہر فوت ہونے والی چیز کا نعم البدل ہم کوملتا ہے ۔ خواہ مال و اولاد فوت ہو یا کوئی عزیز و قریب ۔ چنانچہ حضرت ام سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصیبت کے وقت کے لئے ہم کو یہ دعا تعلیم فرمائی ہے کہ انالله وانا اليه راجعون اللهم عندک احتسب مصیبتی فاجرنی فيها و ابدلنی بها خيرا منها (اے اللہ میں آپ سے اس مصیبت کا ثواب مانگتا ہوں ۔ پس مجھ کو اس کا اجر عطا فرمائیے اور اس کا نعم البدل دیجئے)

" حضرت ام سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ جب میرے شوہر ابو سلمیٰؓ کا انتقال ہوا تو میں نے یہ دعا پڑھی ۔ مگر وابدلنی بها خير منها کہتے ہوئے دل کہتا تھا کہ ابو سلمیٰؓ سے بہتر کون ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملنے کا وہم بھی نہ ہوتا تھا کیونکہ ۔ ع ۔ آرزوی خواہ لیک اندازہ خواہ ۔ لیکن فرماتی ہیں کہ میں نے دل

پر جبر کرکے یہ بھی کہا تو خدا نے مجھے ابو سلمیٰؓ کے عوض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائے۔

" اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کی حقیقت تجارت ہے کہ ایک چیز لی گئی اور دوسری دی گئی۔ نصوص میں اس تجارت پر صاف اشارات موجود ہیں۔ اسی لئے اعمال کا وزن ہوگا۔ جیسا تجارت میں وزن ہوا کرتا ہے۔ اور جب وہاں اعمال بھی جو اعراض ہیں اعیان بن جائیں گے جیسا کہ وزن کا مقتضیٰ ہے تو اعیان تو اعیان ہیں ہی۔ اور مصائب کے بارے میں لفظ اخذ و اعطا و ابدال وارد ہے یہ بھی تجارت کے معنی پر دال ہیں اور تصدیق اموال میں لفظ اقراض اور بذل نفس و بذل مال میں لفظ اشترٰے وارد ہے غرض جو چیز بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی ہے۔ اس کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے۔ اعمال کے متعلق ایک اور نص یاد آئی جس میں ایتاء بمعنی اعطاء ہے والذین یوتون ما اتوو قلوبھم وجلہ انھم الی ربھم راجعون اولئک یسارعون فی الخیرات و ھم لھا سابقون یعنی جو لوگ اس حال میں کچھ دیتے ہیں کہ ان کے دل لرزاں و ترساں ہوتے ہیں کہ ان کو اپنے پروردگار کے پاس واپس جانا ہے تو یہ بھلائی میں ترقی کرتے ہیں اور اس میں سبقت کرنے والوں میں ہوتے ہیں۔

" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ وہ لوگ ہیں جو گناہ کرکے ڈرتے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ جو تصدق اور صوم صلوٰۃ بجا لا کر ڈرتے ہیں کہ شاید قبول نہ ہوا ہو اور خدا کے سامنے شرمندگی ہو کہ تم نے کیسا عمل ہمارے ہاں بھیجا۔ حضرت عائشہؓ کے سوال سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یوتون اعطاء مال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر عمل کو شامل ہے جب ہی تو انہوں نے اس کو اعمال گناہ پر محمول کیا "۔

یہ ہیں وہ نصوص جن سے اعمال و احوال کا تجارت ہونا معلوم ہوتا ہے۔

ان ہی میں سے ایک وہ آیت ہے ' جس کو میں نے (ابتدائے وعظ میں) تلاوت کیا کہ یا ایھا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسرائے ان یعلم اللہ فی قلوبکم خیرا یوتکم خیرا مما اخذ منکم کہ ان قیدیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تمہارے دلوں میں خیر (یعنی ایمان) ہوگی تو اللہ تعالیٰ تم کو اس سے بہتر چیز دیں گے ' جو تم سے لی گئی ہے ۔ یہاں بھی نقصان مالی پر نعم البدل کا وعدہ ہے جس کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے ۔ حاصل یہ ہوا کہ مومن کو ہر نقصان کا عوض اور نعم البدل ملتا ہے " ۔

تکوینی معاملات کی حقیقت بھی تجارت ہے : " خلاصہ یہ کہ معاملات تشریعیہ کا تجارت ہونا تو ظاہر ہے کہ ایک عمل ہم نے پیش کیا اور ادھر سے اس کی قیمت مل گئی ۔ مگر اس کے علاوہ ہمارے ساتھ جس قدر معاملات تکوین میں بھی ہوتے ہیں ان سب کی حقیقت بھی تجارت ہی ہے جیسا مذکور ہوا ۔ اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر غم بہت ہلکا ہو جائے گا ۔ باقی طبعی غم وہ تو ہو گا اور ہونا چاہئے کیونکہ اسی کی وجہ سے اجر ملتا ہے " ۔

صرف یہی نہیں کہ طبعی غم بھی اگر نہ ہو تو پھر اجر کس چیز کا ہو سکتا ہے ۔ بلکہ دنیا میں اگر انسان کو طبعی رنج و غم سے بھی آزاد کر دیا گیا ہوتا ' تو انسان واقعی ایسا فرعون ہو جاتا کہ عجز و عبدیت جو مقصود تخلیق تھا وہی باطل ہو جاتا ۔ اس لئے نفس طبعی رنج و غم میں بڑی حکمت یہ ہے کہ

طبعی غم اجر کے علاوہ عبدیت کے لئے ضروری ہے : " اس سے شان عبدیت ظاہر ہے کہ انسان پر رنج و غم وارد نہ ہو تو یہ فرعون بے سامان ہو جائے ۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس غم کو ہلکا کیا جائے اور غم ہلکا ہونے کی وہی تدبیر ہے ' جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی جب انسان یہ سمجھے گا کہ ہر معاملہ میں حق تعالیٰ مجھ کو نعم البدل عطا فرماتے ہیں ' تو غم ہلکا ہو جائے گا ۔ پھر نعم البدل بھی اس قدر کہ اس کا اندزہ لگانا دشوار ہے ' اور مصائب پر صبر کرنا تو

نہایت دشوار اس پر وہ اجر غیر متناہی ملنا کیا عجب ہے ' جس پر آیت انما یو فی الصابرون اجرھم بغیر حساب میں متنبہ فرمایا ہے ۔ وہاں تو خفیف خفیف عمل پر بھی بے اندازہ اجر مل جاتا ہے چنانچہ حدیث ترمذی میں ہے کہ ایک بار اللہ اکبر کہنے سے زمین و آسمان کی درمیانی فضا بھر جاتی ہے ۔ اور سبحان اللہ کہنے سے آدھی میزان عمل اور الحمدللہ کہنے سے پوری میزان عمل (۱) بھلا ایسے خریدار سے سودا کرنے سے محروم رہنا محروم ازلی کے سوا کس کا کام ہوسکتا ہے ۔ مومن نام ایسے ہی سوداگر کا ہے جس نے جان و مال سب کچھ ایسے ہی خریدار کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنہ ۔

" غرض آپ کو ہر عمل صالح پر بے انتہاء اجر ملتا ہے اور ہر معیبت میں نعم البدل عطا ہوتا ہے ۔ یہاں تک کہ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جب اہل نعمت اہل معیبت کے اجر کو دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچی سے کاٹی جاتیں تاکہ آج ہم کو یہ ثواب (بدل) حاصل ہوتا ۔ پس اس ثواب یا بدلے کے استحضار سے آپ کو غم ہلکا کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سب مصائب در حقیقت تجارت میں داخل ہیں ۔ (۲)

---

(۱) اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کلمات میں یہ خاصیت ہے جیسے طبیب یہ کہے کہ بنفشہ کی یہ خاصیت ہے کہ وہ دماغ کا تنقیہ کرتا ہے ' جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جب تک اس کے ساتھ کوئی مضر شے استعمال نہ کی جائے جو اس خاصیت کو باطل کردے ۔ اگر سنکھیا کھا کر بنفشہ پی لے تو بنفشہ سے کیا خاک نفع ہوگا ۔ ایسے ہی سبحان اللہ والحمد اللہ کی واقعی یہ خاصیت ہے بشرطیکہ ترک صلوۃ وغیرہ کوئی اس کے منافی (معاصی) نہ پائے جائیں " ۱۲

اسلام کے تمام عقائد میں غم کو دور اور ہلکا کرنے کی خاصیت ہے :

ایک عقیدہ آخرت ہی پر کیا موقوف ' اسلام کے سارے عقائد صحیحہ نہ صرف آخرت ہی کی نجات کے ضامن ہیں ' بلکہ دنیا کے آلام و مصائب کو بھی دور اور ہلکا کرنے کی ان عقائد میں ایسی خاصیت ہے کہ ان کی بدولت واقعی یہاں کی زندگی بھی مزے دار زندگی (حیات طیبہ) بن جاتی ہے ۔ الاجر النبیل علی الصبر الجمیل نام وعظ میں ارشاد ہے کہ

" صاحبو عقائد اسلامیہ میں سے ہر عقیدہ کو ازالہ غم میں بڑا دخل ہے ۔ اور اس کی لم اور وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ' بلکہ اسلام کا بالخاصہ یہی اثر ہے کہ اس سے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے ۔ اطباء جانتے ہیں کہ بعض اشیاء مفید با لکیفیت ہیں ان کے فائدہ کی وجہ بیان ہوسکتی ہے ------- اور بعض اشیاء موثر بالخاصہ ہیں اس لئے ان کی وجہ بیان نہیں ہوسکتی اور میرا خیال تو یہ ہے کہ (اور یہی جدید تحقیق بھی ہے) کہ ہر دوا مؤثر باخاصہ ہی ہے کیفیت کا نام ہی نام ہے ۔

" اور خیر طب کے متعلق کوئی میرا قول مانے نہ مانے ' لیکن عقائد و اعمال شرعیہ کے متعلق تو میں یہ کہوں گا سب مفید بالخاصہ ہیں ۔ اور میں اس پر قسم کھا سکتا ہوں اور کیوں نہ قسم کھاؤں ۔ اول تو مجھے اس کا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بھی نہ ہوتا تو حق تعالٰی کا ارشاد کافی ہے کہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب و یومن باللہ یھد قلبہ " (یاد رکھو اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے)

مثلاً تقدیر : ہی کا عقیدہ لو کہ اس سے مصائب میں کتنی تسکین و خفت ہوتی ہے ۔

" حق تعالٰی نے تقدیر کا مسئلہ جس کا حاصل تاثیر قدرت ہے ' اسی لئے ہم کو بتلایا ہے کہ حوادث میں ہم کو راحت ہو ۔ پریشانی اور گھبراہٹ حد سے زیادہ نہ ہو ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی

کتاب من قبل ان نبراھا ان ذالک علی اللہ یسیر لکیلاتا سوا علی مافا تکم ولا تفر حو ابماا تکم واللہ لا یحب کل مختار فخور کہ جو مصیبت پہنچتی ہے ' خواہ زمین میں یا تمہاری جانوں میں وہ سب ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے قبل اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں اور یہ کام خدا پر آسان ہے آگے فرماتے ہیں کہ لکیلا نا سوعلی مافا تکم --- کہ ہم نے تم کو اس مسئلہ تقدیر کی خبر اس لئے دی تاکہ جو چیز تم سے فوت ہوجائے اس پر رنج نہ کرو اور جو چیز تم کو عطا کی جائے اس پر ناز نہ کرو کیونکہ اللہ تعالٰی کسی متکبر یا اترانے والے کو پسند نہیں فرماتے ۔

" اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ اعتقاد تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمان کو دنیا میں بھی راحت رہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہوا کرے ۔ بلکہ یہ سمجھ کر تقدیر میں یوں ہی تھا صبر و شکر سے کام لیا کریں " ۔

اور نفسیاتی وجہ اس کی ظاہر ہے کہ کسی بات کی جتنی شدید تمنا و امید ہوگی اتنا ہی اس کے خلاف واقع ہونے پر غم والم ہوگا ۔ لیکن جو شخص تقدیر کا صحیح معنی میں معتقد ہے وہ ہمیشہ اپنی ہر سعی و طلب امید و تمنا میں جانب مخالف کا بھی پورا احتمال رکھتا اور اس کے لئے تیار رہتا ہے ۔ تیار ہی نہیں بلکہ جیسا اوپر معلوم ہوا عسی ان تکرھو شیئا وھو خیر لکم کے مزید اعتقاد اور بارہا کے تجربات کی بناء پر طلب و تمنا کے خلاف ہونے ہی کو اپنے حق میں خیر اور بھلائی سمجھتا اور جانتا ہے

شریعت کے متبع کو حقیقی غم نہیں ہوتا : " غرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں ان کو حقیقی غم کبھی ہوتا ہی نہیں ۔ پس

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (۱) میں تاویل کی ضرورت نہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو حقیقی خوف وحزن نہیں ہوتا ۔ کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں ۔ جس کا اثر یہی ہے کہ رنج و غم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے (کیونکہ معتقد تقدیر اپنی تجویز و تدبیر کو بالذات موثر ہی نہیں جانتا کہ اس کے خلاف سے اس کو صدمہ ہو) ۔

" پس قائل تقدیر کو آخرت میں تو حزن وخوف ہو ہی گا نہیں دنیا میں بھی نہیں ہوتا اس لئے لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے ۔ اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے اس کو دنیا میں بھی غم ہے اور آخرت میں بھی ـــ اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل واعتقاد کو کامل کرو ۔ پھر تمہارے لئے دنیا میں بھی چین ہوگی لھم البشری فی الحیوۃ الدنیا والاخرۃ " (۲) ۔ (ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی)

" مفتی عنایت احمد صاحب علم الصیغہ کے مصنف حج کو تشریف لے گئے تھے ۔ شاید واپسی کے وقت جہاز طوفان میں آگیا بعض مسافر بچ کر نکل آئے تھے وہ کہتے تھے کہ جس وقت جہاز غرق ہونے لگا تو تمام مسافروں میں کہرام مچا ہوا تھا مگر مفتی صاحب بڑی بے فکری سے بیٹھے ہوئے یہ آیت پڑھ رہے تھے قل لن یصیبنا الا ماکتب اللہ لنا ھو مولنا وعلی اللہ فلیتو کل المومنون " ۔ (کہو ہم کو وہی پیش آسکتا ہے جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے ، وہی ہمارا آقا ہے ، اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے)

ایسے لوگ بس اختیاری مامورات و منہیات کا اہتمام و فکر رکھتے ہیں ۔ اور غیر

---

(۱) یاد رکھو کہ اللہ والوں کو نہ خوف ہوتا ہے ، نہ غمگین ہوتے ہیں ۱۲

(۲) وعظ مسمی بہ خیر الحیوۃ وخیر للمات ص ۱۰ ۔ ۱۲

اختیاری باتوں کے متعلق دور دراز تجاویز اور لمبے چوڑے پروگرام بناتے ہی نہیں نہ ان کی سعی و طلب میں جان کھپاتے ہیں، کہ ان کے نہ پورا ہونے کے غم میں جان دے دیں، نہ ایسی چیزوں میں کسی کی ریس یا مقابلہ کی سوزش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ بس

" ہمیں تو یہ کرنا چاہئے کہ جو حکم ہے اس کے ادا کرنے کی فکر میں لگے رہیں۔ اور جو مامور بہ نہیں ان کی فکر ہی عبث ہے۔ ایسی چیز کے ملنے نہ ملنے کی مصلحت کس کو معلوم۔ اس کو تو حق تعالٰی ہی جانتے ہیں کہ کس کے لئے کیا مفید ہے اور کیا مضر۔

جو عطا فرما دیں وہی اس کے لئے مفید ہے حق تعالٰی نے ہر چیز کے اندر حکمت و مصلحت رکھی ہے خواہ عطا ہو یا منع۔ اس لئے فرماتے ہیں۔ " لا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض "۔ (ایسی چیزوں کی تمنا نہ کرو جن میں اللہ نے تم میں سے کسی پر کسی کو بڑا کیا ہے)

دنیا میں لوگ اسی کے پیچھے کتنا مرتے اور غم کھاتے ہیں کہ ہائے فلاں کے پاس یہ ہے وہ ہے اور ہمارے پاس نہیں حالانکہ

" یہ مسئلہ قرآن پاک نے طے فرما دیا ہے کہ تم ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو، جس میں اللہ تعالٰی نے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے ------ پس جب موہوب (بخشیدہ) میں دخل نہیں تو کیوں پیچھے پڑے اور فرماتے ہیں۔ واسئلو اللہ من فضلہ یعنی اللہ تعالٰی سے اس کے فضل کی درخواست کیا کرو۔ یہ فرما کر تعب سے بچا لیا کہ اگر کسی ایسی چیز کو جی چاہے تو مانگ لیا کرو تحصیل کے درپے مت ہو ان اللہ بکل شیئی علیم کہ بلاشبہ اللہ تعالٰی ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (کہ کیا تمہارے حق میں مفید و مناسب ہے اور کیا نہیں)

" دیکھئے جذبات کو روکا نہیں۔ یہ بھی گوارا نہیں فرمایا کہ جذبات کو روکا جائے۔ کیا ٹھکانا ہے حق تعالٰی کی اس رحمت کا یعنی اگر جی چاہے تو مانگ لو اگر

مناسب ہوگا دے دیں گے ورنہ خیر۔ تو دیکھئے تعب (رنج) سے کیسا بچایا "۔

(۱)

سبحان اللہ حضرت مجدد کا فہم قرآن بھی بالکل موہوب اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہے (واللہ ذو الفضل العظیم)

صورت مصیبت : " جو شخص تقدیر کا معتقد ہے اس کو رنج و غم کبھی نہیں ہوتا ۔ اور جو کبھی کبھی آپ ایسوں کو بھی مصائب میں غمگین دیکھتے ہیں یہ نظر بد سے بچانے کے لئے صورت رنج و غم ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ۔ ۔

دل ہمی گوید ازو رنجیدہ ام
وزنفاق ست او خندیدہ ام

ان کو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرچوں کے کھانے والے کو کلفت ہوتی ہے ' کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں مگر مزے لے لے کر کھا رہا ہے (۱)

کچھ آگے ذرا اسی کی مزید تفصیل و مثال سنئے کہ ایسے غم کو دراصل

" غم کہنا ہی غلط ہے وہ واقع میں غم نہیں محض صورت غم ہے ۔ اور جو واقعی غم ہے اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا ' یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا ' یا اس کو دنیوی نقصان نہیں ہوتا ۔ یہ سب کچھ اس کو پیش آتا ہے ' اور کلفت بھی ہوتی ہے ۔ مگر پریشانی اور حقیقی غم نہیں ہوتا ۔ کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو اور کلفت کہتے ہیں الم (دکھن) کو ' تو ان کو الم تو ہوتا ہے مگر گھٹن نہیں ہوتی ' اس کی ایسی مثال ہے ' جیسے ' کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم میں نشتر لگائے

---

(۱) الافاضات الیومیہ ص ۲۰۲ ۔ ۱۲

(۱) خیر الحیات و خیر الممات ص ۸ ۔ ۱۲

' اس وقت تم کو الم تو ہوتا ہے ۔ مگر رنج و غم نہ ہوگا ۔ گو ظاہر میں تم ہائے ہائے بھی کرو گے ' مگر دل اندر سے خوش ہوگا اور اس الم پر راضی ہوگا کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت کے موافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع و مفید خیال کرتے ہو "

ایک بڑے اشکال کا حل: غم و الم کی اس حقیقت کے فرق و تفصیل سے اکبر الاعمال نام وعظ میں ایک بڑے اشکال کا حل فرمایا ہے کہ

" مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں ۔ ایک صورت مصیبت ایک حقیقت مصیبت ۔ اس سے ایک سوال کا جواب حاصل ہو جائے گا ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مااصابتکم من مصیبہ فبما کسبت ایدیکم کہ تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اعمال کی وجہ سے آتی ہے اور ظاہر ہے کہ حوادث کا نزول انبیاء علیہم السلام پر بھی ہوا ہے ' بعض انبیاء کو قتل تک کیا ہے ۔ اور موت کو قرآن میں بھی مصیبت کہا گیا ہے فاصا بتکم مصیبہ الموت نیز غزوہ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک پر صدمہ آیا سر میں زخم یا تو کیا نعوذ باللہ حضرات انبیاء سے بھی گناہ سرزد ہوا تھا ' جس کی وجہ سے ان پر مصیبت نازل ہوئی ۔ حالانکہ اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تو معصوم ہیں گناہوں سے پاک ہیں ۔

" بس جواب اشکال کا یہ ہے کہ انبیاء کو جو کچھ پیش آیا وہ مصیبت نہ تھی بلکہ صورت مصیبت تھی اور یہ محض تاویل نہیں بلکہ اس کی ایک دلیل ہے ۔ ایک معیار بتلاتا ہوں ' جس سے حقیقت مصیبت اور صورت مصیبت میں فرق معلوم ہو جائے گا ۔ وہ یہ کہ جس مصیبت سے انقباض و پریشانی بڑھے وہ گناہوں کی وجہ سے ہے ۔ اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی اور تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقت میں مصیبت نہیں گو صورت میں ہو ۔

ناخوش تو خوش بود برجان من

دل فدائے یار دل رنجان من

دینی نقطہ نظر سے غم کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے: حاصل سب کا یہ ہے کہ دینی تعلیمات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس کے قبول و اذعان سے دنیا کی بھی کوئی مصیبت حقیقی مصیبت نہیں رہ جاتی اور صوری و طبعی درد والم کے سوا دل کی پریشانی یا حقیقی غم کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ ایک عام فرق تو دینی و دنیوی نقطہ کا وہی ہے کہ دنیا کی زندگی میں آدمی مال و جاہ کے حصول اور اپنی تمناؤں کے جو لمبے لمبے پروگرام بناتا اور ان سے اپنی راحت و مسرت کو وابستہ کرتا ہے، وہ نہ سب اس کے اختیار میں ہوتے ہیں اور نہ سب پورے ہوتے بلکہ اکثر اموال و اولاد الٹے عذاب جان ہوتے ہیں بلکہ جن کے پروگرام بظاہر بہت کچھ پورے ہوتے ہیں ان کے بھی نہ پورے ہونے والے بہت زیادہ ہوتے ہیں، اور نایافت کا غم یافت کی مسرت سے ہمیشہ زیادہ ہی رہتا ہے، اور دم اس غم ہی میں نکلتا رہتا ہے۔ کہ

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان و لیکن پھر بھی کم نکلے

بخلاف دینی نقطہ نظر والی زندگی کے کہ اس میں انسان کو اپنی وسعت اختیار کے استعمال کے علاوہ کسی خاص مقصد و مراد تک پہنچنے کی تکلیف ہی نہیں۔ اگر اس نے اپنی اختیاری سعی کا حق ادا کر دیا، جو ہر حال اس کے اختیار ہی میں ہے، اور پھر بھی بظاہر ناکام رہا تو یہ حقیقی ناکامی و نامرادی ہے ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس کی حقیقی مراد تو اجر و ثواب یا اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ہے، جو اس ظاہری نامرادی میں بھی بدستور بلکہ زیادہ حاصل ہے، کیونکہ اس صورت میں ناکامی کے رنج کا مزید اجر ملتا ہے (جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا) اس لئے دیندار آدمی دنیا اور دین کے ہر معاملہ میں بس اپنی بساط بھر سعی کر کے بے غم ہو جاتا ہے۔

مومن کی پریشانی کی صرف ایک چیز: " ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میرے لڑکے بہت ہی بدشوق ہیں تعلیم کی طرف ان کو قطعاً التفات اور

رغبت نہیں اس سے میرا قلب پریشان رہتا ہے ۔ فرمایا کہ قلب کے پریشان و مشوش رکھنے کی کیا ضرورت ہے ۔ مومن کو پریشان کرنے والی چیز بجز ایک کے اور کوئی نہیں وہ حق تعالیٰ کی عدم رضا ہے ۔ اس سے تو مومن کے قلب میں جتنی بھی پریشانی اور جو بھی حالت ہو وہ تھوڑی ہے ۔ اور جب کہ رضا کا اہتمام اپنی وسعت و قدرت کے موافق ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مومن کا قلب پریشان و مشوش ہو "۔

" اس لئے کہ ہمارے ذمہ صرف تدبیر ہے ' مثلاً تعلیم اولاد کے لئے شفیق استاد تلاش کر دینا کاغذ قلم دوات کا مہیا کر دینا ' کتابیں قرآن وشریف کا ہدیہ دینا اور مزید براں علم کے منافع اور علم دین کے فضائل سنا کر ترغیب دینا ۔ وقتاً فوقتاً دیکھ بھال کر لینا ۔ بس اگر یہ سب کچھ ہے تو ہم اسی کے مکلف تھے ۔ آگے ثمرہ کے ہم ذمہ دار نہیں اس لئے کہ ثمرہ کا مرتب ہونا نہ ہونا ہمارے اختیار سے باہر ہے "۔

پریشانی کا اصل سبب: خلاصہ یہ کہ اختیاری کاموں کو انسان کرلے اور غیر اختیاری کے پیچھے نہ پڑے ' اصل سبب پریشانی کا غیر اختیاری کاموں کے درپے ہونا ہے "۔ (۱)

مطلب وہی کہ جو شخص دیندار ہوگا اس کا نقطہ نظر چونکہ دنیا کے کاموں میں بھی دین ہی ہوگا یعنی بقدر وسعت واختیار اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی نہ کہ ثمرات و نتائج کی ذمہ داری ' جو اپنے اختیار میں نہیں ۔ اس لئے ایسے شخص کا دل دنیا کی ظاہری ناکامیوں سے پریشان و مشوش بھی نہ ہوگا ۔ ایک دوسری جگہ وعظ اصلاح ذات البین میں ارشاد ہے کہ

---

(۱) الافاضات الیومیہ ص ۱۵۶ - ۱۲

" اب میں بیانگ کہتا ہوں کہ لطف زندگی جو کچھ ہے دیندار کے پاس ہے دنیا دار کے پاس کچھ نہیں اور اگر کسی دنیا دار کو لطف میں دیکھا بھی جاتا ہے تو وہ دنیا کا اثر نہیں بلکہ اس کی ظاہری حالت سے دھوکا ہوتا ہے اندرونی حالت کی تفتیش کی جائے تو پریشانی ہی ثابت ہوگی ۔ اور یا اس نے حقیقی لطف دیکھا نہیں ' اس لئے وہ صورت لطف کو لطف سمجھتا ہے "۔

راحت اور سامان راحت : اور راز اس کا وہی ہے کہ لطف و راحت اور چیز ہے سامان لطف و راحت اور چیز ہے ۔ جن اسباب دنیا کو لوگ سامان راحت سمجھتے ہیں اگر حقیقی راحت نہ ہو تو واللہ وہ حقیقت میں عذاب ہے ۔ حق تعالٰی فرماتے ہیں ولا تعجبک اموالھم ولا اولاد ھم انما یرید اللہ ان یعذبھم بھا فی الحیوۃ الدنیا ۔ واقعی بعضے اموال و اولاد تو عذاب ہی ہو جاتے ہیں

ہائے بس اس شخص کا عمر بھر یہ حال رہتا ہے کہ ------

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

اور مولانا فرماتے ہیں ---

جان ہمہ روز از لکد کوب خیال
میشود مجروح و خستہ و پائمال
نے صفائی ماندش و نے لطف فر
نے بسوے آسمان راہ سفر

اسی سلسلہ گفتگو میں اور اسی وعظ میں کچھ آگے بڑھ کر پھر فرماتے ہیں کہ **جتنا دین کامل اتنا ہی لطف حاصل** : " اب اس مسئلہ میں کوئی شبہہ نہ رہا کہ جتنا دین کامل ہوگا اتنی ہی لذت و لطف زندگانی میں ترقی ہوگی گو سامان زیادہ نہ ہو ۔ لوگ آج کل سامان راحت کو مقصود سمجھتے ہیں ۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی پر پھانسی کا مقدمہ قائم ہو جائے اور سامان راحت اس کے پاس سب

کچھ ہو تو کیا اسے کچھ راحت ہوگی ۔ ہرگز نہیں ۔ اور ایک لنگوٹا بند بھی اس کے ساتھ قید ہوا جو چند روز کے بعد رہا ہو جائے گا تو گویا اس کے گھر میں سامان راحت کچھ نہ ہو مگر رہائی کی خبر سن کر اس کے ہاں کیسی عید آئے گی ۔ معلوم ہوا کہ راحت اور چیز ہے اور سامان اور چیز ہے ۔ یہ ضرور نہیں کہ جس کے پاس سامانِ راحت ہو اس کو راحت بھی حاصل ہو اور نہ یہ ضرور ہے کہ جس کے پاس سامان راحت نہ ہو اس کو راحت حاصل نہ ہو ۔

" اور میں فقط دلیل ہی سے نہیں بلکہ مشاہدہ سے دکھلاتا ہوں کہ آپ ایک کامل دیندار شخص کو لیں ، مگر ہم جیسا دیندار نہیں بلکہ واقع میں کامل دیندار ہو اور ایک نواب یا رئیس کو لیں پھر ان کی نجی حالت کا اندازہ کریں تو اللہ ثم واللہ وہ دیندار تو آپ کو سلطنت میں نظر آئے گا اور یہ نواب و رئیس مصیبت میں گرفتار نظر آئے گا ۔ مشاہدہ کے بعد تو آپ مانیں گے کہ راحت کا مدار سامان پر نہیں " ۔

ساری راحت بالذات منافی راحت نہیں : لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سامان راحت بذات خود منافی راحت ہے بلکہ سامان راحت کی جو طلب احکام دین کے منافی یا ان میں مخل ہو یا خدا و دین سے بے تعلقی کا موجب ہو وہ یقیناً راحت کا نہیں مصیبت ہی کا سامان ہوگا ۔ اس لئے فرمایا کہ

" میں سامان سے منع نہیں بلکہ دین کے برباد کرنے سے منع کرتا ہوں اگر دین کے ساتھ یہ سامان دنیا بھی ہو تو مضائقہ نہیں مگر دین کو برباد کرکے اس کو جمع کرنا سخت حماقت ہے ۔ جس سے خاک راحت نصیب نہیں ہوگی ۔ شریعت نے ضعفا کو سامان راحت جمع کرنے کی اجازت دی ہے ۔ بلکہ بعض عارفین بھی کمزور طبیعت کے ہوتے ہیں وہ جمعیت قلب کے لئے کچھ سامان رکھتے ہیں ۔ مثلاً کپڑوں کا چار جوڑے اور سال بھر کا اناج ، سو دین کی نگہداشت کے ساتھ اس کا بھی مضائقہ نہیں ۔ مگر عبد الدینار وعبد الدرا ہم ہونا برا ہے ۔ اس کے لئے

حدیث میں وعید وارد ہے ۔ تعس عبد الدینار و تعس عبد الدرا ہم ان اعطی رضی وان لم یعط سخط ۔ (۱)

" پس تین قسم کے لوگ ہوئے ایک تو کامل دیندار کہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں ' ایک کامل دنیادار ۔

" جو اسی میں منہمک ہے اور اس کی حالت استسقاء کے بیمار جیسی ہے جس کو پانی سے ایک منٹ صبر نہیں ہوتا ' اسی طرح اس کو دنیا کی فکر سے کسی دم فرصت نہیں ----- اور ایک وہ شخص جو دین پر قائم ہے مگر حصول اطمینان کے لئے بقدر ضرورت سامان رکھتا ہے ' یہ برا نہیں " ۔

اس میں کلام نہیں کہ دین کے صحیح عقائد و تصورات خصوصًا یوم دین یا آخرت کے یقین و اذعان کے ساتھ ظاہری سامان راحت ہو جب بھی ' نہ ہو جب بھی ' ہر حال میں دنیا کی زندگی یقینًا پر لطف و مزیدار ہی رہتی ہے اور دنیا کی ہر پریشانی و مصیبت کو دور یا ہلکا کرنے کا بہترین علاج آخرت کی راحت و مصیبت کا استحضار ہی ہے ۔

خود غم آخرت کا کیا علاج : لیکن آخرت کی مصیبت خود جو سب سے بڑی مصیبت ہے اس کا کیا علاج ؟ اس مصیبت کے تصور و احضار کے بعد تو دنیا کی بڑی سے بڑی راحت تلخ ہو جانی چاہئیے ۔ وہی کہ اگر کسی کو پھانسی کا حکم مل چکا ہو ' تو اس کو بادشاہت میں کیا راحت محسوس ہوسکتی ہے ۔ یہ سب بالکل ہیچ ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو مصیبت آخرت ہی کی مصیبت ہے دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کے آگے بے حقیقت ہے ۔ جواب بالکل آسان ہے کہ وہاں کی مصیبت دنیا کی بیماری و آزاری دوستوں عزیزوں کی موت و زندگی وغیرہ کے اکثر مصائب اپنے

---

(۱) برا ہو سیم وزر کے بندوں کا کہ ملا تو خوش ورنہ ناخوش ! ۱۲

(۲) ص ۲۹ ' ۲۸ ۔ ۱۲

اختیار سے باہر ہوتے ہیں نہ ان کا آنا اپنے اختیار میں نہ دور کرنا۔ بخلاف آخرت کی مصیبت کے کہ اس کا دور کرنا تمام تر اپنے اختیار میں ہے۔ اس لئے کہ اس کا مدار تمام تر معصیت سے اجتناب اور طاعت کے اہتمام پر ہے۔ اور ان دونوں چیزوں میں ہم سے مطالبہ یا ہم کو تکلیف صرف اسی قدر کی ہے جس قدر کہ ہماری طاقت و اختیار میں ہے' وہ بھی بقدر تحمل اور سہولت کے ساتھ۔ یہ نہیں کہ قمار و شراب کا ترک کھانے پانی کے ترک کی طرح ہماری طاقت سے باہر ہو' یا کذب و فریب' ظلم و جبر' بغض و عداوت کبر و غرور وغیرہ کوئی ایسی معصیت ہو جس کو سہولت یا بقدر تحمل مجاہدہ و کوشش سے چھوڑا نہ جاسکتا ہو۔ غرض اسی طرح اعمال صالحہ خواہ وہ صوم وصلوٰۃ کے عبادات ہوں یا بیع و شراء کے معاملات یا اخلاق و معاشرت' ان میں سے کون سا شعبہ ہے جس کا ایک حکم بھی ہماری قوت و برداشت سے باہر ہو۔ ایک نماز ہی کو لیجئے کہ کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکتے ہوں تو بیٹھ کر اجازت ہے۔ بیٹھنے کی قوت نہ ہو تو لیٹ کر' حرکت کی قوت نہ ہو تو اشارہ سے۔ پانی نہ ملتا ہو یا کسی مرض میں مضرت کا اندیشہ ہو تو تیمم کی اجازت ہے۔ اور اس کا بالکل وہی حکم و اجر ہے جو پانی سے وضو کا۔ حدیہ کہ کوئی شخص اپنی صحت و تندرستی میں نیکی و طاعت کے و اعمال بجا لاتا ہے' بیماری سے اگر معذور ہو جائے' تو بھی اجر کے اعتبار سے نامہ اعمال میں صحت و تندرستی ہی کے زمانہ کے اعمال لکھے جاتے رہیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ آخرت کی مصیبت سے بچنا یا وہاں کی راحت کا خریدنا' اس سے ارزاں و آسان تو دنیا کا کوئی حقیر سودا بھی نہیں۔ حق یہ ہے کہ وہاں کوڑیوں کے مول بادشاہت ملتی ہے وہی کہ "نیم جان بستاندو صد جان دہد" اور یہاں کی بادشاہت بھی درد سر سے خالی نہیں رہا یہ احتمال کہ ایسا کون ہے جو تمام چھوٹی بڑی طاعات کا اہتمام کرسکے یا تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے محفوظ رہ سکے اور اوامرو نواہی کی کوئی کوتاہی نہ ہو۔ حالانکہ وہاں تو ذرہ ذرہ نیکی و بدی کی جزا وسزا ملے گی۔ " فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرایرہ و من یعمل مثقال

ذرۃ شرا یرہ " پھر وہاں کی ذرا سی مصیبت بھی یہاں کی بڑی مصیبت سے بڑی ہوگی ۔ لیکن ساتھ ہی دوسرا قانون یہ بھی تو ہے " ان الحسنات یذھبن السیئات " (۲) جس کا مطلب یہ ہے کہ میزان میں حساب کا پلہ بھاری رہا تو بس انشاء اللہ بیڑا پار ہے ۔ اس کے علاوہ کفارہ سیئات کا باب کتنا وسیع ہے کہ کانٹے کی معمولی خلش اور خواب کی تکلیف بھی اجرو کفارہ سے خالی نہیں ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انابت و استغفار کا دروازہ کسی وقت بند نہیں ۔ بڑے سے بڑے معاصی سے بھی صحیح اور سچی توبہ کرکے آدمی اسی طرح پاک وصاف ہو جاسکتا ہے کہ گویا ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ۔ کفروشرک سے بڑھ کر کون سی معصیت ہوگی ' جب اس تک کو توبہ نیست و نابود کر دیتی ہے تو دوسرے معاصی کا ذکر ہی کیا ! غرض یہ احتمال محض احتمال ہے اور اتنا احتمال رہنا عین مطلوب ہے ورنہ آدمی سرے سے نڈر اور بے خوف ہو جائے ۔ ایمان کی شان یہی ہے کہ بین الخوف و الرجاء ہے ۔

اور اتنا خوف و احتمال نہ دنیا میں ہمارے غم ومصیبت کو بڑھاتا ہے اور نہ راحت و مسرت میں مخل ہوتا ہے ۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے ' جیسے کسی محنتی و شوقین طالب علم کو بھی باوجود محنت وشوق اور پوری تیاری کے امتحان میں ناکامی کا کچھ نہ کچھ احتمال وخوف لگا ہی رہتا ہے ۔ لیکن یہ خوف چونکہ اس کی رجایا یا امید کامیابی پر غالب نہیں ہوتا ' اس لئے نہ اس امید کی مسرتوں میں مخل ہوتا ہے ' اور نہ ان مسرتوں کے مقابلہ میں امتحان کی محنت و مشقت کوئی معتدبہ مصیبت معلوم ہوتی ہے ۔ بلکہ اس سے ذوق و شوق میں اضافہ ہوتا ہے ۔ یہی حال دنیا کے تمام کاموں ملازمت تجارت ' صنعت وحرفت سب ہی کا ہے کہ اسباب کامیابی کی

---

(۱) نیکیاں بدیوں کو مٹا دیتی ہیں ۱۲

زیادہ سے زیادہ فراہمی کے باوصف ناکامی کا اندیشہ و احتمال کچھ نہ کچھ باقی ہی رہتا ہے۔

انتہائی تسلی: ان سب باتوں کے باوجود خود راقم کے ضعف قلب و ضعف تحمل کا یہ حال ہے کہ آخرت و جہنم کی مصیبتوں کا حال پڑھ کر ایک دن کیا ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی برداشت کا یارا نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے گو یہ سچ ہے کہ "مان بھی لو کہ کچھ دن کے لئے جہنم ہی میں جانا پڑا تو پھر عقلی قاعدہ یہ ہے کہ جو تکلیف منقطع ہونے والی ہو وہ ہلکی ہو جاتی ہے۔ اور مسلمانوں کا عذاب یقیناً ایک نہ ایک دن منقطع ہوگا' اس لئے بعد کی حالت کو یاد کرکے اور جنت میں جانے کی امید سے یہ کلفت سہل ہو جائے گی"۔ لیکن احقر جیسے کم حوصلہ وکم ہمت کی اس سے بھی کیسے تسلی ہوسکتی ہے۔ اس لئے آگے حضرت نے ایسے کم ہمتوں کی تسلی کے لئے عجیب بات بیان فرمائی جس کے دہرانے سے گو طبیعت جھجکتی ہے کہ خدا نخواستہ کسی پڑھنے والے کی جراءت کا باعث ہو جائے' جس پر خود اپنی پکڑ ہو جائے تاہم بقول حضرت ہی کے کہ جس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں چھپایا "میں اس کو کیوں چھپاؤں"۔

"وہ یہ کہ مسلم کی صحیح حدیث میں ہے کہ جو مسلمان جہنم میں داخل کئے جائیں گے حق تعالیٰ ان کو ایک قسم کی موت دے دیں گے اماتھم اللہ اماتہ یہ الفاظ ہیں حدیث کے۔ اس کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی موت نہ آئے گی مگر کوئی حالت مشابہ موت کے ہوگی۔ مثلاً یہ کہ جسم بے حس ایسا کر دیا جائے جیسا موت سے بے حس ہو جاتا ہے یا کم حس کر دیا جائے' سو اب اس کو عذاب وغیرہ کا احساس ہی نہ ہو یا کم ہو۔ بہر حال مسلمان کا عذاب بھی دوسروں کے عذاب کی طرح نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب مسلمان پل صراط سے گزریں گے جس کا رستہ جہنم کی پشت پر سے ہوگا تو جہنم مسلمانوں سے کہے گی جزیا مومن فان نورك اطفأ ناری اے مسلمان جلدی سے پار ہو جا تیرے نور کی

ٹھنڈک نے تو میری آگ ہی کو بجھا دیا جب پشت پر سے گزرنے کا یہ اثر ہے تو جب مسلمان جہنم کے اندر ہوگا۔ اس وقت بھلا کیا حال ہوگا۔ کچھ عجب نہیں کہ برد ایمان کی وجہ سے نار جہنم اثر ہی نہ کرے یا اثر کرے اور اس کا احساس نہ ہو یا احساس ہو اور کم ہو۔ گو وہ کم بھی خدا کی پناہ کہ بہت کچھ ہے"۔ (۱)

ایک بڑا غم آدمی کو خود اپنی موت کا ہوتا ہے' اور گو غفلت کی وجہ سے عام لوگوں کو بس کبھی کبھی اور بہت کم محسوس ہوتا ہے' تاہم بہت سے اچھے اور نیک عمل والوں کو بھی اس سے اس لئے وحشت ہوتی ہے کہ خدا جانے وہاں کیا معاملہ پیش آئے تقریر بالا زیادہ ایسے ہی لوگوں کے لئے تھی چنانچہ فرماتے ہیں کہ

" میں ان باتوں سے معاصی پر جرات نہیں دلاتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ موت سے جو آپ کو وحشت ہے کہ اس کے تصور سے بھی ڈرتے ہیں۔ اس کو دور کروں۔ مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری رحمتہ اللہ علیہ نے ایک بار اپنے خدام سے تفریح و تفریع کے لئے دریافت کیا کہ کیوں بھائی آخرت میں وہی خدا ہے' جو یہاں دنیا میں ہے' سب نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا پھر تو انشاء اللہ تعالیٰ کچھ اندیشہ نہیں' کیونکہ یہاں تو بڑے مہربان ہیں' بس وہاں بھی ایسے ہی مہربان ہوں گے"۔

محبت کی پڑیا: " میں کہتا ہوں بلکہ وہاں سے زیادہ مہربان ہوں گے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رحمت کے سو حصوں میں سے ایک حصہ ظاہر کیا ہے۔ اور آخرت میں پورے سو حصوں کے ساتھ مسلمانوں سے برتاؤ کریں گے۔ دیکھئے کیسی اچھی بات ہے کہ جب آخرت میں وہی خدا ہے' جو دنیا میں ہے' تو پھر ڈرنا کا ہے کا اور یہ اثر محبت کا تھا"۔

" مولانا کو حق تعالیٰ سے محبت تھی ۔ اس واسطے کہتا ہوں کہ تم محبت کی پڑیا کھالو پھر سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے بعد تم پٹو گے نہیں ۔

" بلکہ یہ کہتا ہوں کہ اگر پٹو گے تو اس طرح پٹو گے جس طرح عشاق پٹا کرتے ہیں عشاق کو غیروں کی طرح نہیں پٹوایا کرتے ' بلکہ یوں ہی برائے نام کچھ سزا دے دیتے ہیں ۔ محبوب کو ان کی محبت و عشق کی بھی لاج ہوتی ہے ۔

دوسری ایک اور بات ہے گو کہنے کی نہیں مگر جب زبان پر آگئی تو چھپاؤں کیوں وہ یہ کہ عشاق کو محبوب کے ہاتھ سے پٹنے میں مزہ آتا ہے بلکہ محبوب کے سامنے پٹنے میں بھی مزہ آتا ہے ۔ اسی کو ایک عاشق کہتا ہے کہ

بجرم عشق تو ام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سربام آکہ خوش تماشائیست

" ایک عاشق کا قصہ ہے کہ اس کو کسی سے محبت تھی اس کی اطلاع محبوب کے اقارب کو ہوئی تو انہوں نے اس کو سو درے لگائے ۔ ننانوے تک تو اس نے ایک آہ بھی نہ کی ۔ اس کی بعد جو ایک لگا تو آہ کی ۔ کسی نے ملامت کی کہ ننانوے تک تو تحمل کیا اخیر میں ایک کا تحمل نہ ہوسکا ۔ کہنے لگا بات یہ ہے کہ ننانوے دروں تک تو محبوب مجھ کو اور میری اس حالت کو دیکھ رہا تھا اس وقت مجھ کو یہ حظ آرہا تھا کہ محبوب دیکھ رہا ہے کہ اس کی محبت میں میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جارہا ہے ۔ اس حظ نے ضرب کے الم کو محسوس نہ ہونے دیا جب ننانوے درے لگ چکے تو وہ چلا گیا ' اس وقت مجھے ضرب کا احساس ہوا ' اس لئے اخیر درہ پر آہ کی ۔

" گو یہ عشق مجازی کا واقعہ ہے ' مگر عشق حقیقی و عشق مجازی کے بعض آثار متحد ہیں ۔ کیونکہ عشق تو دونوں جگہ مشترک ہے ' اس لئے ایک سے دوسرے کی تفسیر ہوتی ہے ۔ **العشاق یفسر بعضھم بعضا** اور یہی تو وجہ ہے کہ

حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا واصبر لحکم ربک فانک باعیننا کہ اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کئے رہو اور استقلال سے جمے رہو کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں ۔ فانک باعیننا اس لئے بڑھایا تاکہ آپ پر کفار کی ایذائیں آسان ہو جائیں اور ان سے بجائے کلفت کے لذت حاصل ہو ۔ بتلا دیا کو جو کچھ آپ کے ساتھ برتاؤ ہو رہا ہے ہم سب دیکھ رہے ہیں ۔ اس مراقبہ کا اثر لازمی ہے کہ کلفت مبدل بہ لذت ہو جائے ۔ یہاں تک کہ سب سے بڑھ کر مکروہ و ناگوار چیز موت ہے ' مگر عشاق کو وہ بھی لذیذ ہو جاتی ہے

عارف شیرازی فرماتے ہیں ۔۔۔

خرم آن روز کزین منزل و یران بردم
راحت جان طلبم و زپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسراین غم روزے
تادر میکدہ شاداں و غزلخوان بردم (۱)

از محبت تلخہا شیریں شود : اس " محبت کی پڑیا " سے پہلے ایسے باطنی و قلبی اخلاق و فضائل یا ایسے دینی و اسلامی عقائد و تصورات کا بیان تھا کہ ' جن کے کسب و استحضار سے انسان کے دنیوی غم و مصیبت یا پریشانیاں اگر دور نہیں تو ہلکی اور بہت ہلکی ضرور ہو جاتی ہیں ۔ مسلمان اپنے ایمان و عمل میں اگر اوسط درجہ کا بھی مسلمان ہو تو اس کی دنیا کی زندگی بھی یقیناً " حیات طیبہ " بن جاتی ہے ۔ لیکن اسلامی تصوف جیسا کہ اور اوپر جابجا معلوم و مذکور ہوتا رہا ۔ دراصل نام ہے کمال اسلام کا اس لئے کمال حیات طیبہ بھی یہ ہوگا ' کہ مصیبت کا دور یا ہلکا ہونا

---

(۱) خیر الحیات وخیر الممات ص ۴۵ ' ۴۴ ۔ ۱۲

گئی ۔

" وہ حکمت یہ ہے کہ مجھے سفر سے بہت کلفت تھی کچھ تو طبعاً اور کچھ اس لئے کہ سفر میں بد مذاق لوگوں سے پالا پڑتا ہے ----- اب حق تعالیٰ نے غیب سے یہ عذر پیدا کر دیا (جس کی وجہ سے لوگ سفر پر اصرار نہیں کرتے) ------- تو اس کلفت میں یہ حکمت معلوم ہو کر مجھے اس قدر راحت ہے ' جسے بیان نہیں کرسکتا --------- اب کوئی اس قسم کا خط آتا ہے کہ ہم نے فلاں شخص سے سنا ہے کہ آپ کو تکلیف ہے تو جواب میں لکھ دیتا ہوں کہ صدق و کذب یعنی عذر کے بیان میں تو راوی سچا ہے لیکن تکلیف کی روایت میں غلط ۔ کیونکہ مجھے اس عذر سے الم و پریشانی نہیں بلکہ حظ حاصل ہوتا ہے " ۔ (۱)

حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی کا یہ رنگ اپنی آنکھوں کا دیکھا ہے کہ اکثر بیماری و تکلیف میں جوش و خروش کے ساتھ بے تکلف اپنے خاص رنگ توحید کی باتیں مزہ لے لے کر فرماتے رہتے ۔ ایک دفعہ غالباً نمونیا میں مبتلا تھے ۔ احقر مولانا گیلانی کے ساتھ عیادت کو حاضر ہوا تو جب تک پردہ کا انتظام ہو حضرت خالی ململ کا معمولی کرتا پہنے فوراً باہر آگئے اور حسب معمول ذوق و مستی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوگئے مزاج پرسی تک کا ہم لوگوں کو اطمینان کے ساتھ موقع نہ دیا ۔ ایک دفعہ زہریلے بچھو نے ڈس لیا ' تو کبھی کبھی فرماتے کہ بڑا مزہ آیا ۔ سب سے بڑی مصیبت آدمی موت کو سمجھتا ہے ' لیکن محبت میں موت بھی محبوب ہوجاتی ہے ' مولانا موصوف کو دیکھا ' جیسا اوپر بھی کہیں ذکر آچکا ہے کہ موت کے مشتاق معلوم ہوتے تھے ۔ بلکہ کبھی کبھی ایسا فرماتے بھی کہ خود کشی حرام نہ ہوتی تو اب تاب نہ تھی ۔ اور جب موت ہی حیات ہو تو کیسے تاب ہو ۔

---

(۱) خیر الحیات و خیر الممات ص ۴۰ ' ۳۹ ۔ ۱۲

حق تعالٰی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مراقبہ تعلیم فرمایا واصبر لحکم ربک فانک باعیننا کہ اپنے رب کے فیصلہ پر صبر کئے رہو اور استقلال سے جمے رہو کیونکہ آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں ۔ فانک باعیننا اس لئے بڑھایا تاکہ آپ پر کفار کی ایذائیں آسان ہو جائیں اور ان سے بجائے کلفت کے لذت حاصل ہو ۔ بتلا دیا کو جو کچھ آپ کے ساتھ برتاؤ ہو رہا ہے ہم سب دیکھ رہے ہیں ۔ اس مراقبہ کا اثر لازمی ہے کہ کلفت مبدل بہ لذت ہو جائے ۔ یہاں تک کہ سب سے بڑھ کر مکروہ و ناگوار چیز موت ہے ، مگر عشاق کو وہ بھی لذیذ ہو جاتی ہے

عارف شیرازی فرماتے ہیں ---

حرم آن روز کزین منزل و یران بردم
راحت جان طلبم و زپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسرایں غم روزے
تادر میکدہ شاداں و غزلخوان بردم (۱)

از محبت تلخہا شیریں شود : اس " محبت کی پڑیا " سے پہلے ایسے باطنی و قلبی اخلاق و فضائل یا ایسے دینی و اسلامی عقائد و تصورات کا بیان تھا کہ ، جن کے کسب و استحضار سے انسان کے دنیوی غم و مصیبت یا پریشانیاں اگر دور نہیں تو ہلکی اور بہت ہلکی ضرور ہو جاتی ہیں ۔ مسلمان اپنے ایمان و عمل میں اگر اوسط درجہ کا بھی مسلمان ہو تو اس کی دنیا کی زندگی بھی یقیناً " حیات طیبہ " بن جاتی ہے ۔ لیکن اسلامی تصوف جیسا کہ اور اوپر جابجا معلوم و مذکور ہوتا رہا ۔ دراصل نام ہے کمال اسلام کا اس لئے کمال حیات طیبہ بھی یہ ہوگا ، کہ مصیبت کا دور یا ہلکا ہونا

---

(۱) خیر الحیات وخیر الممات ص ۴۵ ، ۴۴ ۔ ۱۲

کیا معنی مصیبت سرے سے مصیبت ہی نہ رہے عین راحت و لذت بن جائے "
محبت کی پڑیا اسی کا نسخہ ہے کہ از " محبت تلخہا شیریں شود "۔

اب یہ معلوم ہے کہ تصوف میں کمال عشق و محبت کی تعلیم و حصول پر اتنا زور ہے کہ تصوف کا سارا دفتر کہنا چاہئے کہ داستان عشق ہی ہے۔ اس لئے بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ دین کا تو کہنا ہی کیا دنیا کے بھی سارے آلام و مصائب کا کامل علاج و استیصال اگر چاہتے ہو تو بس پکے صوفی ہو جاؤ پھر تو یہ کہنے لگو گے کہ

ناخوش تو خوش برجان من
دل فدائے یار دل رنجان من

عشاق صوفیاء اور اہل اللہ کے مصائب کی مثال حضرت علیہ الرحمہ اکثر یہ دیا کرتے ہیں کہ

دیکھو اگر ایک شخص کا محبوب مدت سے بچھڑا ہوا اچانک مل جائے اور اس عاشق کو بہت زور سے اپنی بغل میں دبائے ، حتی کہ اس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں ، تو بظاہر یہ نہایت تکلیف میں ہے ، لیکن دل کی یہ حالت ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اور دبائے تو اچھا ہے۔ اور اگر محبوب کہے کہ تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دوں تو یہ جواب میں کہے گا کہ

اسیرت نخواہد رہائی زبند
شکارت نخواہد خلاص از کمند

اور اگر وہ کہے کہ تم کو دبانے سے تکلیف ہوئی تو تم کو چھوڑ کر تمہارے رقیب کو اسی طرح دباؤں تو کہے گا کہ

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

حتی کہ اگر اس کا دم بھی نکل جائے تو اس کے لئے عین راحت ہے "۔

اور یہ نری شاعری نہیں بلکہ اس رنگ کے اہل محبت کے واقعات سے اہل اللہ کے تذکرے بھرے ہیں۔ خود حضرت علیہ الرحمہ نے اپنے استاد رحمہ اللہ (مولانا محمد یعقوب صاحب) کی زبانی ایک واقعہ بیان فرمایا کہ

"ایک بزرگ سخت مرض میں مبتلا تھے اور ساتھ ہی زخمی تھے، کوئی جگہ زخم سے خالی نہ تھی۔ زمین پر پڑے تھے، زخموں پر مکھیاں بھن بھن کر رہی تھیں۔ ایک دوسرے بزرگ وہاں سے گزرے تو انہوں نے پہچانا کہ یہ صاحب نسبت اور عالی مقام ہیں۔ وہ خدمت کے لئے ان کے پاس آگئے اور پنکھا جھلنے لگے۔ ان کو افاقہ ہوا تو گھبرائے اور فرمایا کہ یہ کون شخص ہے جو مجھ میں اور میرے محبوب میں حائل ہوگیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میں خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا نہیں مجھ کو اس کی ضرورت نہیں تم اپنے کام میں لگو اور مجھے اور میرے محبوب کو چھوڑو۔

" بتلایئے اس شخص کو اس تکلیف میں کچھ تو لذت تھی جو دوسرے کی خدمت راحت رسانی تک گوارا نہ ہوئی بلکہ تکلیف میں پڑا رہنا پسند ہوا۔ تو بات یہ ہے کہ مصیبت میں بھی اسرار و حکم ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے مصیبت مصیبت نہیں رہتی بلکہ لذت ہو جاتی ہے"۔

اس کے ساتھ ہی حضرت خود اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ

"اس کی چھوٹی سی نظیر اپنا ہی واقعہ بیان کرتا ہوں۔ گو مجھے بزرگوں سے کیا نسبت، مگر ان کی جوتیاں سیدھی کرنے سے اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کو تحدث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس سال آنت کے درد کی سخت تکلیف ہوئی، کلفت تو بعض وقت ایسی ہوتی تھی جیسی نزع میں سنی جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے قلب کو اپنے متعلق کرکے اس کلفت کو آسان کر دیا۔ پھر اس میں جو حکمت معلوم ہوئی تو اس نے کلفت کو عقلاً لذیذ کر دیا۔ پھر جسمانی تکلیف جاتی رہی اور صرف عذر رہ گیا، تو وہ عقلی لذت طبعی فرحت بن

گئی ۔

" وہ حکمت یہ ہے کہ مجھے سفر سے بہت کلفت تھی کچھ تو طبعاً اور کچھ اس لئے کہ سفر میں بد مذاق لوگوں سے پالا پڑتا ہے ---- اب حق تعالیٰ نے غیب سے یہ عذر پیدا کر دیا (جس کی وجہ سے لوگ سفر پر اصرار نہیں کرتے) ------- تو اس کلفت میں یہ حکمت معلوم ہو کر مجھے اس قدر راحت ہے ' جسے بیان نہیں کرسکتا --------- اب کوئی اس قسم کا خط آتا ہے کہ ہم نے فلاں شخص سے سنا ہے کہ آپ کو تکلیف ہے تو جواب میں لکھ دیتا ہوں کہ صدق و کذب یعنی عذر کے بیان میں تو راوی سچا ہے لیکن تکلیف کی روایت میں غلط ۔ کیونکہ مجھے اس عذر سے الم و پریشانی نہیں بلکہ حظ حاصل ہوتا ہے " ۔

(۱)

حضرت مولانا محمد حسین صاحب حیدر آبادی کا یہ رنگ اپنی آنکھوں کا دیکھا ہے کہ اکثر بیماری و تکلیف میں جوش و خروش کے ساتھ بے تکلف اپنے خاص رنگ توحید کی باتیں مزہ لے لے کر فرماتے رہتے ۔ ایک دفعہ غالباً نمونیا میں مبتلا تھے ۔ احقر مولانا گیلانی کے ساتھ عیادت کو حاضر ہوا تو جب تک پردہ کا انتظام ہو حضرت خالی ململ کا معمولی کرتا پہنے فوراً باہر آگئے اور حسب معمول ذوق و مستی کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوگئے مزاج پرسی تک کا ہم لوگوں کو اطمینان کے ساتھ موقع نہ دیا ۔ ایک دفعہ زہریلے بچھو نے ڈس لیا ' تو کبھی کبھی فرماتے کہ بڑا مزہ آیا ۔ سب سے بڑی مصیبت آدمی موت کو سمجھتا ہے ' لیکن محبت میں موت بھی محبوب ہوجاتی ہے ' مولانا موصوف کو دیکھا ' جیسا اوپر بھی کہیں ذکر آچکا ہے کہ موت کے مشتاق معلوم ہوتے تھے ۔ بلکہ کبھی کبھی ایسا فرماتے بھی کہ خود کشی حرام نہ ہوتی تو اب تاب نہ تھی ۔ اور جب موت ہی حیات ہو تو کیسے تاب ہو ۔

---

(۱) خیر الحیات و خیر الممات ص ۴۰ ' ۳۹ ۔ ۱۲

جب منصور سولی پر چڑھائے جانے کیلئے بڑھائے جانے لگے تو یوں کہتے جا رہے تھے

" اقتلونی یا ثقاتی ان فی قتلی حیاتی (۱) ۔ غلبہ محبت کے بعد موت کا اشتیاق بھی غالب ہو جاتا ہے ۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمتہ اللہ علیہ جس دن صبح کو شہید ہونے والے تھے ' اس کی رات میں آپ کو مکشوف ہوگیا تھا کہ کل کو شہادت کا دن ہے ' تو رات کو آپ کی یہ حالت تھی کہ غسل کرکے عمدہ کپڑے پہنے خوشبو لگائی اور وصال حق کے لئے تیار ہوگئے اور جب باہر تشریف لاتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے ہیں ---

سرجدا کرد از تنم یارے کہ باما یار بود
قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود (۲)

اسی طرح کسی " دوسرے بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب وہ مرنے لگے تو خوش ہو کر یہ شعر پڑھتے تھے ---

وقت آن آمد کہ من عریاں شوم
جسم بگذارم سراسر جان شوم

غرض عشق و محبت کی خاصیت یہ ہے کہ موت و مصیبت ' موت و مصیبت ہی نہیں رہ جاتی حیات و راحت بن جاتی ہے ۔ اور محبوب حقیقی کے عشق میں یہ حال کیوں نہ ہو جب کہ

" مجنون نے ایک ادنی مخلوق کی محبت کے غم سے نجات نہ چاہی ۔ جب اس کا عشق مشتہر ہوا اور سوز و گداز سے کھانا پینا تک متروک ہوگیا اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا ' تو اس کا باپ اس کو مکہ معظمہ لایا اور کہا بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر خدا سے دعا کر کہ لیلی کی محبت میرے دل سے نکال دے تو اس

---

(۱) ثقہ لوگو مجھے قتل کر ڈالو ۔ میرے قتل ہی میں میری زندگی ہے ۱۲

(۲) خیر الحیات و خیر الممات ص ۴۰ ' ۳۹ ۔ ۱۲

نے رو کر کہا کہ

یا رب لا تسلبنی حبھا ابدا
ورحمتم اللہ عبدا قال آمینا

اور کہا

الٰھی تبت عن کل المعاصی
ولکن حب لیلیٰ لا اتوب (۱)

تو جب ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت میں غم لذیذ ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت ہو تو کیا عجب "۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

یعنی کیا خدا کی محبت لیلیٰ کی محبت سے بھی کم ہے ۔ ہرگز نہیں تو اب غور کیجئے کہ وہ کیسی لذت کی ہوگی "۔

اور ہمارے کتاب و سنت کے مجدد وقت کو کتاب و سنت سے جو عشق ہے ' اس کی کرامت یہ ہے کہ ایسی چیزوں کی بھی سند بے تکلف کتاب و سنت سے پیش فرما دیتے ہیں ۔ چنانچہ خود حضرات صحابہؓ میں سے اس رنگ کے ایک صحابی کا حال حدیث میں آتا ہے ۔ کہ

" نماز میں قرآن شریف پڑھ رہے تھے کہ ایک تیر آ کر لگا ' لیکن قرآن پڑھنا ترک نہیں کیا ۔ آخر ایک دوسرے صحابی جو سوتے تھے جاگنے کے بعد انہوں نے اس حالت کو دیکھا اور بعد سلام ان سے پوچھا تو فرمایا کہ جی نہ چاہا کہ قرآن شریف کی تلاوت کو منقطع کر دوں ۔

" غرض محبت ایسی چیز ہے ۔ لیکن چونکہ ہم نے محبت کا مزہ چکھا نہیں '

---

(۱) پروردگار لیلیٰ کی محبت میرے دل سے کبھی نہ نکالنا ' خدا کی رحمت اس بندہ پر جو میری اس دعا پر آمین کہے خداوندہ سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں ۔ لیکن لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کر سکتا ۱۲

اس لئے سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ مصیبت میں ہیں "۔(۱)

اہل محبت کی دنیا ہی الگ ہے: جب محبت سے مصیبت تک لذیذ ہو جاتی ہے تو اس سے محبت کے دوسرے احوال کا اندازہ کیجئے ۔ اصل میں محبت کی دنیا ہی الگ ہے ان کو محبوب کا نام لینے میں بھی مزہ آتا ہے ۔ حضرت ہی سے کسی بزرگ کا حال سنا جو فرماتے تھے کہ جب اللہ اللہ کہتا ہوں تو منہ میٹھا ہو جاتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں محبت سے محروم و نا آشنا اللہ کا نام لینے والے ہم مسلمانوں کا حال دیکھئے کہ دس پانچ منٹ کی نماز تک ہمارے اوپر پہاڑ ہے خدا کا منادی (موذن) زور زور سے پکار رہا ہے اور ہم ہیں کہ کان رکھ کر بہرے بن جاتے ہیں ۔ کھیل تماشے اور گپ شپ تک کو خدا کی پکار پر چھوڑنا گوارا نہیں کرتے ۔

ہمارے اسی عہد کے ایک مشہور بزرگ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمتہ اللہ علیہ گزرے ہیں ' ان کی شان عشق و محبت کی یہ عجیب و غریب تمنا حضرت علیہ الرحمتہ کی زبان سے سنی کہ فرمایا کرتے تھے ' بس آرزو یہ ہے کہ قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت مل جائے !

جب ہم اہل غفلت رات کو خراٹے لیتے ہوتے ہیں ' تو اہل محبت ' محبت کے مزے لوٹتے ہیں ' اس کے سامنے سلطنت بھی بے حقیقت ہوتی ہے ۔ اسی مذکورہ

---

(۱) خیر الحیات وخیر الممات ص ۴۳۔ ۱۲

صدر آیت فلنحیینہ حیوۃ طیبہ کا ایک تفسیری حاشیہ سنئے

" ذکر اللہ کی لذت ' حب الٰہی کا مزہ ' عبودیت کی خوشی ' تعلق مع اللہ کی حلاوت ' جس کا ذائقہ چکھ کر ایک عارف نے کہا

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوس چتر سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

سچ ہے اہل اللیل فی لیلھم الزمن اہل اللھوفی لھو ھم ۔

اسی لئے ایک بزرگ نے فرمایا کہ سلاطین کو خبر ہو جائے کہ شب بیداروں کو رات کے اٹھنے میں کیا لذت و دولت حاصل ہوتی ہے ' تو اس کے چھیننے کے لئے اسی طرح لشکر کشی کریں جیسے ملک گیری کے لئے کرتے ہیں " ۔

حد اس لذت کی یہ ہے کہ بعض دفعہ عارفین اس لذت سے پناہ مانگتے اور استغفار کرتے ہیں ' کہ محبوب کے بجائے کہیں خود یہ لذت ہی محبوب و مقصود بالذات نہ ہو جائے

" کیونکہ لذت طاعات بھی مقصود بالذات نہیں ' بلکہ بالغیر ہے ۔ عارف کو بعض دفعہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ کہیں میں تہجد و ذکر اس لذت ہی کے واسطے نہ کر رہا ہوں ' اس لئے وہ اس لذت پر التفات کرنے سے بھی استغفار کرتے ہیں ۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا ۔ وبا لاسحار ھم یستغفرون کا ربط کانوا قلیلاً من الیل ما یھجعون سے ۔

---

(۱) از حاشیہ مولانا شبیر احمد عثمانی بر ترجمہ قرآن مجید شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ ۱۲

" ظاہر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ رات کو تہجد پڑھنے سے استغفار بالا سحار کو کیا تعلق ہے ۔ بعض مفسرین نے تو یہ کہا کہ وہ معاصی سے استغفار کرتے ہیں ' اور اسحار کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ وقت اجابت دعا کا ہے اور تہجد سے استغفار کا تعلق یہ ہے کہ وہ جلب منفعت ہے اور یہ دفع مضرت ہے ۔ اور بعض نے کہا کہ وہ تہجد پڑھ کر خود اس طاعت ہی سے استغفار کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ طاعات بھی (کما حقہا ادا نہ ہوسکنے سے) معاصی ہیں ۔

" مگر میں کہتا ہوں کہ زیادہ سہل اور ظاہر یہ ہے کہ وہ رات کو اٹھ کر تہجد پڑھتے ہیں اور اخیر شب میں لذت طاعات یا اس لذت کے آثار سے استغفار کرتے ہیں ۔ کیونکہ اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے
کہ یارے بر خورداز وصل یارے

اور وصل کی لذت جیسی ہوتی ہے معلوم ہے ۔ اس لذت میں کبھی انہماک ہو کر اس کی مقصودیت کا شبہہ ہو جانا بعید نہیں ۔ اور اس دولت وصل سے مشرف ہو کر عجب کا پیدا ہو جانا بھی جو آثار لذت سے ہے ' عجب نہیں اس لئے استغفار کرتے ہوں ۔

خلاصہ یہ کہ محبت کی بدولت طاعات میں ایسی لذت ہونے لگتی ہے کہ سلطنت بھی ہیچ ہو جاتی ہے ۔

" یہ تو دین کا نفع ہوا اور دنیا کا نفع یہ ہوگا کہ محبت سے تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی میں یہ نہیں کہتا کہ محبت کے بعد بیماری نہ ہوگی یا کوئی تکلیف نہ پیش آئے گی ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت حوادث کا رنگ دوسرا ہوگا ۔ اس وقت آپ کو کلفتوں میں بھی مزہ آئے گا " ۔ (۱)

از محبت تلخہا شریں شود

---

(۱) خیرالحیات وخیرالممات ص ۳۹ '۳۸ ۔ ۴۲

حاکم و حکیم کا مراقبہ : محبت ہی کی طرح ذات و صفات کی توحید بھی جب قال سے گذر کر صوفی کا حال بن جاتی ہے، تو اس کی تفویض کا خاصہ تلخیوں کو شیریں بنا دیتا ہے ۔ جیسا کہ مضمون ہذا کی ابتداء ہی میں " اثر توحید " کے عنوان سے اس کا مجملاً ذکر آچکا ہے ۔ البتہ حضرت حکیم الامت کی حکیمانہ مصلحت شناسی اس کی صوفیانہ تعلیم و تفصیل کی تفہیم کو پسند نہ فرماتی تھی ۔ اولاً تو اس کی فہم کے لئے ذرا تجربہ پسند یا فلسفیانہ ذہن درکار ہے (جس کا وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود کے مباحث سے اندازہ ہوسکتا ہے) دوسرے اس توحید کا لازمہ یہ ہے کہ خیر و شر کے سارے افعال و آثار کا منشا حق تعالیٰ ہی کی ذات اور اس کے صفات جمال و جلال کو سمجھائے جائے جس میں خدا سے سوء ظن و شکایت کا شدید خطرہ رہتا ہے ۔

اسی خطرہ کی بناء پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ عام طور سے مراقبہ توحید کی اجازت نہیں دیا کرتے تھے ۔ الا آنکہ کسی پر محبت کا رنگ غالب ہو ۔ کیونکہ محبت کے یہ بالکل منافی ہے کہ محبوب سے کسی حال میں بھی شکایت پیدا ہو

لیکن ہمارے حضرت علیہ الرحمہ نے اپنے حکیمانہ رنگ میں اس مراقبہ کا بھی نچوڑ دو لفظوں میں نکال کر اس کو عام و تام دونوں بنا دیا تھا کہ بس ہرامر میں حق تعالیٰ کے " حاکم و حکیم " ہونے کا خیال رکھا جائے ۔ حاکم ہونے کی حیثیت سے تو ان کو ہمارے اندر ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے ، اور حکیم ہونے کی حیثیت سے یہ تصرف حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا تو پھر اعتراض و شکایت کی کیا گنجائش ۔ بلکہ اس مراقبہ کا لازمہ تو خالص تفویض یا بے چوں و چرا تسلیم و رضا ہے ۔ تاہم ہے مصائب کا یہ علاج ہے خاص ہی ۔

اس کا لازمہ تفویض : " جس کو خواص استعمال کرتے ہیں ۔ اس کا نام تفویض ہے جس کی حقیقت قطع تجویز ہے ۔ یعنی وہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں کہ وہ جو چاہئیں ان میں تصرف کریں ۔ اپنی طرف سے وہ کوئی حالت یا نظام تجویز نہیں کرتے اور تمام تر پریشانی کا سبب تجویز ہی ہے کہ ہم نے ہر ایک

چیز کا ایک خاص نظام (پروگرام) اپنے ذہن میں قائم رکھا ہے کہ یہ کام اس طرح ہونا چاہئے مثلاً اولاد کو اس طرح پڑھانا چاہئے۔ پھر اس نظام کے خلاف واقع ہونے سے کلفت ہوتی ہے۔ اور زیادہ حصہ اس نظام کا جو ہماری طرف سے تجویز ہوتا ہے غیر اختیاری ہوتا ہے تو غیر اختیاری امور کے لئے نظام تجویز کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔

" اسی قطع تجویز کے لئے حدیث میں آیا ہے اذا اصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء و اذا امسیت فلا تحدث نفسک بالصباح کہ جب صبح ہو تو شام کے متعلق اپنے دل میں خیال نہ لاؤ اور شام ہو تو صبح کے متعلق خیال نہ لاؤ۔ راحت اسی میں ہے، اسی لئے اہل اللہ نے تجویز کو قطع کرکے یہ مذہب اختیار کرلیا ہے کہ

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

اور یہ مذہب بنا لیا ہے کہ

ناخوش تو خوش بود برجان من
دل فدائے یار دل رنجان من (۱)

مگر دیکھئے اس توحیدی تفویض کے ساتھ وہی محبت کا رنگ شریک بلکہ غالب ہے، جس کے بغیر تفویض کا نباہنا ہی دشوار ہے کہ " انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم خدا کے ہیں ان کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہئیں تصرف کریں " ساتھ ہی اس تفویض و محبت میں کچھ ایسا لازم و ملزوم کا علاقہ ہے کہ جس طرح غلبہ محبت میں یہ تفویض پیدا ہو جانا لازم ہے، اسی طرح اس تفویض کے ساتھ محبت کا پیدا ہو جانا لازم ہے۔

---

(۱) الجبر بالصبر ص ۷-۳۔ ۱۲

اسی لئے اس کو عاشقانہ تفویض یا تفویلفی عشق دونوں کہا جاسکتا ہے۔
لیکن دراصل یہ تفویض توحید ذات و صفات کی لازمی تفریع اور وہی عبدیت ہے جو انسان کی تخلیق کا خاص مقصد اور " خواص کا مردانہ مقام ہے۔ جو اس مردانہ مقام پر کھڑا رہ سکے اس کے لے رنج و مصیبت خوف و حزن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا الذین قالو اربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکۃ الا تخافوا ولا تحزنواوابشر بالجنۃ التی کنتم توعدون عبد یا غلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ رب یا مالک کو حق ہے ' جس طرح اور جس حال میں چاہئے غلام کو رکھے اور وہ راضی رہے۔ لہٰذا آخر میں اپنے رب کے ساتھ عبد کے اس رشتہ عبدیت و بندگی کو (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) ایک مرتبہ اور سن لیں۔

" حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون پر اشکال کیا گیا کہ جن و انس کی تخصیص کی کیا وجہ عبادت تو ساری مخلوق ہی کرتی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ایک تو عبادت ہے اور ایک طاعت۔ اول ایک مثال میں فرق سمجھ لو وہ یہ کہ ایک نوکر ہے ایک غلام۔ نوکر کا کام معین ہوتا ہے خواہ ایک خواہ متعدد مثلا باورچی کے لئے پکانے کی خدمت معین یا مکان پر بازار اور گھر کا کام کرنے کے لئے کوئی نوکر ہے ' تو جس خدمت کے واسطے یہ نوکر ہیں ان سے وہی خدمت لی جاسکتی ہے۔ خود آقا بھی اس کا لحاظ رکھتے ہیں۔ حتی کہ اگر آقا باورچی سے کہے کہ یہ خط لے کر گنگوہ چلے جاؤ تو نوکر ضابطہ سے انکار کر سکتا ہے۔

" اور غلام کی کوئی خدمت معین نہیں تمام خدمات اس کے ذمہ ہیں ' جس کا حکم ہو جائے ' چنانچہ ایک وقت اس کو آقا کا پاخانہ بھی اٹھانا پڑتا ہے ' اور ایک وقت میں آقا کی پوشاک پہن کر آقا کا قائم مقام ہو کر جلسہ یا دربار میں جانا پڑتا ہے۔ غرض غلام کو کسی وقت کسی خدمت سے بھی انکار نہ ہوگا۔ اسی طرح جن و انس کے سوا تمام مخلوق کی طاعت معین ہے۔ ہر شے مخلوقات میں

سے ایک خاص کام پر معین ہے کہ اس کے سوا اس سے دوسرا کام نہیں لیا جاتا

" مگر انسان کی کوئی خدمت معین نہیں ۔ چنانچہ ایک وقت میں انسان کا سونا عبادت ہے اور ایک وقت میں پاخانہ پھرنا بھی عبادت ہے ۔ مثلاً جماعت تیار ہو اور پاخانہ پیشاب کا زور ہو تو اس وقت پیشاب وغیرہ سے فراغت حاصل کرنا واجب ہے اور نماز پڑھنا حرام ہے ۔ اس وقت بیت الخلاء جانا ہی عبادت ہے ۔ ایک تو یہ حالت ہے اور ایک وقت انسان کی یہ شان ہے کہ **مظہر حق** بنا ہوتا ہے ' اس وقت اس کی زبان سے مردہ دل زندہ ہوتے ہیں ۔ غرض جو شان غلام کی ہوتی ہے وہی انسان کی ہے ۔ عبدشدن کے لئے انسان ہی ہے ۔ باقی تمام مخلوق ذاکر و شاغل ہے مگر **عابد** صرف انسان ہے " ۔

لہٰذا اس کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ

" یہ کسی خاص حالت اور کسی خاص کام کو اپنے لئے تجویز نہیں کرسکتا ۔ بلکہ حضرت حق جس حالت میں بھی رکھیں اسی میں اس کو رہنا چاہئے کمبل **اڑھائیں تو کمبل اوڑھے دوشالہ اڑھائیں تو دوشالہ اوڑھے ۔ بھوکا رکھیں تو بھوکا رہے ' گھی دودھ کھلائیں تو گھی دودھ کھائے ۔ یہی شان تھی حضور کی " ۔**

مگر اس مقام سے نا آشنا دین کے نام سے بھی آج کل کیسی غلطی و غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اپنی اپنی

" تجویز و اختیار کا نام بزرگی رکھ لیا ہے کہ فلاں شخص بہت بزرگ ہیں گھی نہیں کھاتے ۔ فلاں بزرگ گائے کا گوشت نہیں کھاتے ' قربانی نہیں کرتے بڑے رحم دل ہیں جانور کے گلے پر چھری رکھنے کو اچھا نہیں سمجھتے ۔ حالانکہ قربانی میں تو جانور کو خدا کے نام پر فدا کرنا ہے ---------- اگر حق تعالیٰ ہماری جان بھی طلب فرماتے تو اس میں بھی دریغ نہ ہونا چاہئے تھا چہ جائیکہ وہ ہمارے بجائے جانوروں کی جانیں طلب فرماتے ہیں -------- اور حکم فرماتے ہیں قربانی کرو ۔

آنکہ جان بخشد اگر بکشد رواست
نائب است و دست او دست خداست

"غرض تفویض کلی عبدیت ہے اور اپنی تجویز سے امتیازی شان بنانا عبدیت کے بالکل خلاف ہے ۔ مثلاً جب حق تعالیٰ کھانے پینے کو اچھا دیں اس وقت خستہ حالت میں رہنا ناشکری ' نعمت کی ناقدری اور خلاف اطاعت ہے ' کیونکہ جیسے شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنے نوکروں کو تنخواہ دو کھانا کپڑا دو ویسے ہی یہ بھی حکم دیا ہے کہ اپنی جان کو بھی راحت دو ۔ پس جیسے نوکر خدا کی مخلوق و مملوک ہے ' تمہاری جان بھی خدا کی مخلوق و مملوک ہے اس لئے تم کو اپنے اندر بھی بدون اجازت کسی تصرف کا حق نہیں ۔ اگر نوکر کو حکم الہی سے کھانا کپڑا دیتے ہو ' تو اسی آقا کے حکم سے تم اپنی خدمت بھی کرو ۔ کیونکہ تمہاری جان بھی خدا کی ہے ۔ اس حقیقت پر نظر کرکے ایک عارف فرماتے ہیں کہ

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

کہ مجھ کو اپنے اعضاء پر اس وجہ سے ناز ہے اور ان کی قدر ہے کہ آپ سے ان کا تعلق ہے ۔ صاحبو ہم کو اپنی آنکھ سے اس وجہ سے تعلق نہ ہونا چاہئے کہ وہ ہماری آنکھ ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ حق تعالیٰ کی چیز ہے ' ان کی خدمت کرتی ہے اس سے ان کا جمال دیکھا ہے گو بواسطہ مظاہر ہی سہی ۔

آگے فرماتے ہیں ۔

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را
کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

اس اعتبار سے عارف کو اپنے نفس سے بھی محبت ہوتی ہے اور اسی لئے حدیث میں ہے ان لنفسک علیک حقا کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے ۔ تو عارف کو اپنے نفس سے اس لئے محبت ہے کہ وہ سرکاری چیز ہے دیکھو اگر

کوئی مشین سرکاری کسی کے سپرد ہو تو اس کے آلات صاف رکھنا اور تیل دینا ضروری ورنہ باز پرس ہوگی ۔ البتہ اگر اپنی ہو تو اختیار ہے چاہے صاف کر کے تیل دے چاہے نہ دے ------ غرض عارف اس اعتبار سے حقوق نفس ادا کرتا ہے کہ خدا کا کام کرے ۔

" کہتے ہیں کہ فلاں شخص چلہ کھینچ رہا ہے اور گوشت سے پرہیز ہے ۔ سبحان اللہ -------- حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل نبوت کچھ ایام کے لئے بغرض خلوت غار حرا میں تشریف لے جانا ثابت ہے اور بعد نبوت کے اعتکاف ثابت ہے ۔ مگر آپ نے کبھی گوشت سے پرہیز نہیں کیا پھر یہ کیسی بزرگی ہے کہ چلہ کی وجہ سے گوشت چھوڑ دیتے ہیں ۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ سید الطعام اللحم ۔ دست کا گوشت کھانا حضور سے ثابت ہے بلکہ مرغوب تھا ' اس لئے اتباع سنت ہے ۔

حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے ایک تبحر عالم نے کہا کہ "میرا ارادہ ہے کہ ترک حیوانات کے ساتھ چلہ کھینچوں حضرت حضرت نے فرمایا کہ مولانا توبہ کیجئے بدعت ہے ۔ حالانکہ حاجی صاحب اصطلاحی عالم نہ تھے مگر عالم گر تھے ۔ اسی لئے حضرت مولانا قاسم صاحب نے فرمایا تھا کہ لوگ حضرت حاجی صاحب کے مختلف کمالات کے معتقد ہیں ۔ مگر میں علم کی وجہ سے معتقد ہوں ۔ اصل یہ ہے کہ جب قوت حاسہ درست و صحیح ہو تو کھانے میں کتنا ہی باریک بال کیوں نہ ہو محسوس ہوجاتا ہے ۔ اسی طرح جب فہم درست ہو تو حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے ۔ حضرت اپنے زمانہ میں صدیق اعظم تھے (جو بہت بڑا مرتبہ ہے مراتب ولایت سے) "

غرض اس طرح اپنی رائے و تجویز سے گوشت وغیرہ سے پرہیز۔

" یہ بھی ایک مکر ہے شیطان کا کہ عبادت کے رنگ میں دھوکا دیتا ہے -------- باقی کاملین کی نظر ہر وقت عبدیت پر ہے اس لئے وہ پلاؤ اور متنجن

اور چٹنی ایک ہی رغبت سے کھاتے ہیں " ۔(۱)

اور یہی کمال عبدیت یا توحیدی تفویض کی کامل سپردگی اور تسلیم و رضا کا وہ کٹھن مقام ہے کہ

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید وبس

باقی خالی زبان سے اسرار و معارف بگھاڑ لینا یہ تو ہر تصوف خواں ' بلکہ فلسفہ خواں بھی کر سکتا ہے ۔

---

(۱) وعظ سارۃ الجزین از ص ۱۴ تا ص ۱۸۔۱۲

بعض اکابر تصوف کی بدنامی کی حقیقت

الحمد للہ کہ تصوف و سلوک کے اصولی اور بعض اہم فروعی مسائل و مباحث سے متعلق حضرت مجدد وقت کی تجدیدات و تحقیقات نے پوری طرح واضح کر دیا کہ تصوف کے بغیر کمال دین یا حسنہ آخرت کیا حسنہ دنیا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس سے بڑھ کر سچ یہ ہے کہ صوفی بنے بغیر انسان ہی نہیں بنتا یا حیوان رہتا ہے یا شیطان بن جاتا ہے۔ لیکن جس طرح بہت سے نام کے صوفیوں نے تصوف کو بدنام کیا ہے ' اسی طرح بعض اکابر صوفیاء کی بے جا بدنامیوں نے بھی بہتوں کی راہ ماری۔ اس لئے اس کی تحقیق و تنقیح بھی ضروری تھی۔

حضرت شیخ اکبر: ان اکابر میں اکبر الاکابر حضرت شیخ اکبر (محی الدین ابن عربی) رحمہ اللہ علیہ ہیں۔ جن کی کتابوں میں ذات و صفات رسالت و آخرت وغیرہ کے باب میں بعض باتیں ایسی ہیں کہ ان کے ظاہری معنی لے کر اور ان کو جھنڈے پر چڑھا کر ایک طرف تو جاہل صوفیوں یا نفس پرستوں نے دین کو بے دینی کا مرادف بنا دیا ' اور دوسری طرف بعض اہل علم نے خود حضرت شیخ کی تضلیل و تکفیر کی جراء ت کرکے معادات اولیاء کا خطرہ خریدا۔ حضرت مجدد وقت علیہ الرحمہ کی نظر میں یہ دونوں چیزیں اتنی اشد تھیں کہ پہلے تو حضرت شیخ کی مشہور کتاب فصوص الحکم کی (جو تصوف کی گویا درسی کتاب بن گئی ہے) اسی نقطہ نظر سے خصوص الکلم کے نام سے شرح لکھنا شروع کی ' اور جس کو الحل الاقوم کی صورت میں صرف بعض مقامات کی شرح پر اکتفا کرکے درمیان میں چھوڑ دیا گیا "۔ یہ کتاب اور اس کی شرح و حل خاص اس مذاق کے اہل علم کے مطالعہ و ملاحظہ کے لائق ہے۔ باقی عوام تو عوام عام اہل علم کی سلامتی ایسی کتابوں اور ایسے مضامین سے احتراز ہی میں ہے ' جس کا اندازہ خود حضرت علیہ الرحمہ جیسے صاحب علم و تحقیق

۔ کے اس تجربہ سے فرمائیں کہ

فصوص سے توحش اور اس کی شرح کا ترک: " اس (شرح و حل کے لکھنے) کے زمانہ میں مجھ کو جو توحش و انقباض ان مضامین سے ہوتا تھا، عمر بھر یاد رہے گا ۔ بعض مقامات پر قلب کو بے حد تکلیف ہوتی تھی، چنانچہ اس میں کہیں کہیں اس کا ذکر بھی کیا ہے ۔ اور یہ بھی وجہ تھی اس شرح کے چھوڑ دینے کی " ۔

یہ توحش و انقباض ایسا شدید تھا کہ پھر حضرت اس کام کی طرف سالہاسال طبیعت کو رجوع نہ فرما سکے، بایں ہمہ اس معاملہ میں وہ جادہ اعتدال سے جو حضرت کی خصوصیت خاصہ ہے، قلم کو اتنی لغزش بھی نہ ہوئی کہ خود حضرت شیخ کے ساتھ کسی ادنیٰ سوء ظن کا ترشح تک ہوتا ۔ بلکہ بالآخر سات سال بعد التنبیہ الطربی فی تنزیہ ابن العربی کے نام سے ایک کتاب مستقلاً شیخ کے تبریہ و حمایت میں سپرد قلم فرمائی ۔ جس کی تمہید میں ارشاد ہے کہ

شیخ کا تبریہ خود شیخ کے کلام سے: " ایام حاضرہ میں قلب پر دفعۃً وارد ہوا کہ شیخ کے کلام کی شرح جس غرض سے کی جاتی تھی کہ لوگ نہ خود ضلالت میں واقع ہوں نہ شیخ کی تضلیل کریں یہ غرض گو تفصیلاً اس شرح ہی سے حاصل ہوتی جو کہ مکمل نہیں ہوئی ۔ مگر اجمالاً ایک اور طریق سے بھی حاصل ہو سکتی ہے وہ یہ کہ خود شیخ کے کلام سے وہ حقائق جمع کئے جائیں جو ان اقوال موہمہ کے مضاد و معارض ہیں ۔ اور چونکہ قائل واحد کے کلام میں (خصوصا جب کہ وہ عاقل و عالم اور متدین اور صاحب کمال بھی ہو) تعارض خلاف اصل ہے " ۔

لہذا تطابق کی دو ہی صورتیں ہیں

" یا تو ایسے اقوال جن کی دلالت و صحت ظاہرہ و قطعی ہے ان کو ایسے اقوال کی طرف راجع یا ان کا تابع کر دیا جائے جن کی دلالت و صحت محتمل و مشکوک ہے ۔ یا اس کے بالعکس کیا جائے ۔ ظاہر ہے کہ پہلے صورت عقلاً و نقلاً

مردود ہے ۔ اس لئے دوسری ہی قابل قبول رہ جائے گی ۔

" بلکہ یہ طریق کہ شیخ پر اعتراضات کا تبریہ و ازالہ شیخ ہی کے کلام سے کیا جائے صاحب البیت ادری بمافیہ کے اعتبار سے زیادہ نافع و قوی ہے ' جس سے شیخ کی ضلالت و گمراہی کا حکم جو شیخ کے ساتھ سوء ظن اور کلام شیخ کو ظاہر پر حمل کرنے سے پیدا ہوا تھا وہ تو اس طرح رفع ہو جائے گا کہ " خود شیخ ہی کے دوسرے اقوال اس سوء ظن کے رافع موجود ہیں ۔ اور اپنی ضلالت و گمراہی جو شیخ کے ساتھ حسن ظن اور کلام شیخ کو ظاہر پر محمول کرنے سے پیدا ہوتی تھی ' وہ اس طرح رفع ہوجائے گی کہ دوسرے اقوال ان اقوال کی دلالت کو مشتبہ و مشکوک کر دیں گے ۔

" اور اگر ان متضاد و متعارض اقوال میں سے ایک کو دوسرے کی طرف راجع نہ کیا جائے اور ان کی تاریخ تحریر نہ معلوم ہونے سے ان کی تقدم و تاخر کو محتمل کہا جائے ' تب بھی زیادہ سے زیادہ اشتباہ کی حالت رہے گی ' جس کا مقتضاء احتیاط ہے اور ظاہر ہے کہ احتیاط یہی ہے کہ ایسے اقوال خلاف ظاہر سے نہ شیخ پر طعن ہو نہ حجت ۔ بلکہ اصولاً ظاہر الصواب کو اصل اور ظاہر الخطا کو تابع قرار دیا جائے ۔

" بہرحال یہ طریقہ حضرت شیخ کے ایسے اقوال سے خود گمراہ ہونے والوں یا حضرت شیخ کو گمراہ ٹھہرانے والوں کو نافع اور حقیقت و شریعت کی حفاظت اور حقوق اولیاء کی حفاظت کا جامع ہوگا ۔(۱)

شیخ پر سب سے بڑا اعتراض : اور الزام مسئلہ وحدۃ الوجود کے باب میں عینیت یا حلول و اتحاد کا ہے ۔ لیکن خود فتوحات مکیہ باب ۵۵۷ میں اس کی کیسی

---

(۱) از تمہید (تلخیصا و تسہیلا) ۱۲

صاف و صریح تردید موجود ہے ۔ کہ

" ان العالم ماھو عین الحق تعالی اذ لوکان عین الحق تعالی ماصح کون الحق تعالی بدیعا "

عالم حق تعالیٰ کا عین نہیں، اس لئے کہ اگر وہ حق تعالیٰ کا عین ہوتا تو حق تعالیٰ کا بدیع ہونا صحیح نہیں ہوتا ۔

جس کی حقیقت ہے عدم سے وجود میں لانے والا ۔ کیونکہ عالم اگر عین حق ہوتا اور حق تعالیٰ کبھی عدم کے ساتھ متصف نہیں ہوا تو عالم بھی عدم کے ساتھ متصف نہ ہوگا، پھر اس کو عدم سے وجود میں لانے کے کیا معنی ہوتے ۔

" پس ثابت ہوا کہ عالم اور حق متحد نہیں اور عینیت و اتحاد اگر ان کے کلام میں ہے تو بمعنیٔ اصطلاحی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خلق کا وجود حق کے وجود کے تابع ہے ۔

اسی طرح فصوص الحکم کی " فص آدمی " میں ہے کہ

" وان وصفنا بما وصف بہ نفسہ من جمیع الوجوہ فلا بد من فارق ولیس الا افتقارنا الیہ فی الوجود توقف وجود نا علیہ لا مکاننا و غنائہ عن مثل ما افتقرنا الیہ ۔

اگرچہ حق تعالیٰ نے ہم کو بھی تمام وجوہ سے ان چیزوں کے ساتھ موصوف فرمایا ہے جن سے اپنے کو موصوف فرمایا ہے پھر بھی کوئی بات فرق کی ضرور ہے ۔ کہ ہم وجود میں اس کے محتاج ہیں ہمارا وجود اس پر موقوف ہے بوجہ اس کے ہم ممکن ہیں اور وہ ایسی چیز سے غنی ہے جس میں ہم اس کے محتاج ہیں ۔

(اس سے بڑھ کر عینیت کے ابطال اور تباین یا غیرت کے اثبات پر کیا نص ہوگی)

علیٰ ہذا ایسی ہی صریح تردید حلول و اتحاد کی خود شیخ ہی کے العقیدۃ الصغرے میں موجود ہے کہ

" تعالی الله ان تحله الحوادث اویحلها -------

یعنی اللہ تعالیٰ اس سے برتر ہیں کہ اس میں حوادث حلول کریں ۔ یا وہ حوادث میں حلول کرے --------

" اور شجرۃ الکون میں فرمایا کہ وہ فرد ہے صمد ہے نہ کسی شے کے اندر ہے ' نہ کسی شے پر ہے ' نہ کسی شے کے ساتھ قائم ہے ' نہ کسی شے کا محتاج ہے ۔ نہ وہ ہیکل ہے ' نہ شبیہہ ہے ' نہ صورت ہے ' نہ جسم ہے ' نہ حیز والا ہے ' نہ ذی کیفیت ہے نہ مرکب ہے لیس کمثلہ شی وھو السمیع العلیم ۔

" اور شیخ نے ایک کلام میں فرمایا ہے کہ اتحاد کا وہی قائل ہوگا جو ملحد ہوگا اور جو لوگ حلول کے قائل ہیں وہ جاہل اور فضول گو ہیں ۔

" امام شعرانی نے اس کو نقل فرمایا ۔ بس جھوٹا ہے وہ شخص جس نے شیخ پر افترا کیا کہ وہ حلول و اتحاد کے قائل ہیں ---------

" اور فتوحات کے باب **اسرار** میں ہے کہ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بلا اختلاف واحد (حقیقی) ہے اور واحد (حقیقی) کا مقام اس سے عالی ہے کہ اس میں کوئی شے حلول کرے یا وہ کسی شے میں حلول کرے ۔

" اور باب الاسرار ہی میں فرمایا کہ کسی عارف کو یہ کہنا جائز نہیں کہ میں اللہ ہوں اگرچہ قرب میں انتہائی درجہ کو پہنچ جائے عارف کو ایسے قول سے کیا تعلق ۔ اس کا قول تو یہ کہ میں حرکت و سکون سب میں ایک ذلیل بندہ ہوں "

جس شخص کی مختلف کتابوں اور ان کے مختلف مقامات پر عینیت یا حلول و اتحاد کی اس شدومد سے تردید و ابطال موجود ہو اس کو اس کا قائل قرار دینا بہتان عظیم نہیں تو اور کیا ہے ۔ یہ ایک مثال مشتے نمونہ از خروارے ہے ' ورنہ التنبیہ الطربی کے پورے ملاحظہ سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ شیخ پر مسلمات شریعت کے خلاف اور بھی جتنے الزامات و اعتراضات ہیں سب کا کم و بیش یہی حال ہے کہ خود حضرت شیخ ہی کے کلام میں ان کا رد موجود ہے ۔

شریعت کی تعظیم و تحفظ : اس کے علاوہ خود شیخ ہی کے کلام میں جا بجا نفس شریعت کی تعظیم و تحفظ کے اہتمام پر کثرت سے اقوال موجود ہیں ۔ التنبیہ الطربی کی فصل اول میں صوفیائے محققین کا مسلک اتباع علوم شریعت کے معاملہ میں جو بیان فرمایا گیا ہے ، اس سلسلہ میں حضرت شیخ کے بعض اقوال ملاحظہ ہوں ۔ مثلاً

" جو حقیقت شریعت کے خلاف ہو وہ زندقہ ہے " ۔ ہمارے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ نہیں بجز اس طریقہ کے جو مشروع فرمایا ہے ۔ " جو شخص کہے کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا شریعت کے سوا کوئی راستہ ہے اس کا کہنا جھوٹ ہے " ۔ جو شخص میزان شریعت کو ایک لحظہ کے لئے بھی اپنے ہاتھ سے پھینک دے گا وہ ہلاک ہو جائے گا " ۔

" علم شریعت کو لازم پکڑو کیونکہ شریعت ہی تمہاری وہ کشتی ہے ، کہ جب اس میں رخنہ پڑ جائے تو تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے اور جتنے بھی اس میں سوار ہیں وہ سب ہلاک ہوں گے " ۔ (۱)

بھلا جس شخص کے یہ اقوال ہوں ، کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ اس کا کوئی عقیدہ مسلمات شریعت کے خلاف رہا ہوگا ۔ ہاں کسی پر کوئی خاص حال غالب ہو جائے تو وہ معذور ہے ۔ اس کی نسبت بھی خود شیخ ہی کا ارشاد ہے کہ

" شرع کی جو میزان دنیا میں موجود ہے وہ وہی شریعت ہے جو علماء کے ہاتھ میں ہے ۔ پس جب کوئی ولی عقلی تکلیف کے ہوتے ہوئے اس میزان سے خارج ہوگا ، اس پر اعتراض واجب ہوگا البتہ اگر کوئی حال غالب ہوگا تو اس کے لئے اس حال کو مسلم رکھیں گے اور اعتراض نہ کریں گے ۔ کیونکہ کوئی عقلمند آدمی ایسے شخص کا اتباع نہ کرے گا (اور اعتراض اسی مصلحت سے تھا کہ اس کا کوئی

---

(۱) الطربی ص ۱۲ ۔ ۱۴

اتباع نہ کرنے لگے)

" لیکن اگر اس سے کوئی امر ظاہر ہو جو ظاہر شرع کی رو سے موجب حد ہو اور وہ امر حاکم کے نزدیک ثابت بھی ہو جائے تو اس پر حد قائم کی جائے گی اور ضرور ایسا کیا جائے گا ۔ اور اس پر حد قائم کرنے سے یہ دعوے مانع نہ ہوگا کہ میں اہل بدر کے مثل ہوں (جن کے لئے ارشاد ہوا تھا اعملو ما شئتم فقد غفرت لکم) کیونکہ اہل بدر سے بھی دنیا میں مواخذہ ساقط نہیں ہوگیا تھا (پھر ان کے حق میں تو نص تھی اور اس مدعی کے پاس تو کوئی نص بھی نہیں)

" علاوہ بریں اگر کسی بندہ سے (بالفرض) یہ بھی کہہ دیا جائے کہ تو جو چاہے کر میں نے تیری مغفرت کر دی (جیسا کہ اہل بدر سے کہہ دیا تھا) تب بھی وہ شریعت میں گنہگار ہی ہے ۔ کیونکہ مغفرت تو گناہ کے بعد ہی ہوا کرتی ہے اور اسی لئے (اہل بدر سے) فقد غفرت لکم فرمایا گیا تھا ۔ اور یوں نہیں فرمایا کہ حدود (شرعیہ) کے ساقط کر دیا ۔ لہٰذا جو حاکم ایسے شخص پر حدود و تعزیر کو قائم کرے گا اس کو اجر ملے گا) ۔

" اور کبریت احمر میں حضرت شیخ سے اتنا اور زائد نقل کیا ہے کہ حسین ابن منصور حلاج کا بعینہ یہی واقعہ ہوا (کہ ان سے ایک امر ظاہر شرع کے خلاف ثابت ہوا اور عذر ثابت نہیں ہوا اس لئے حاکم نے تعزیر جاری کر دی) " (۱)

ایک بڑا مغالطہ : کشف کا ہے ' جس کی بعضوں میں طبعی صلاحیت ہوتی ہے اور مجاہدہ و ریاضت سے بڑھ جاتی ہے ۔ لیکن جیسا کہ پہلے معلوم ہوچکا کشف کوئی بے خطا ذریعہ علم نہیں زیادہ سے زیادہ اس کی حیثیت ایک حاسہ اوراک کی ہوسکتی ہے ' اور جس طرح انسان کے دیگر حواس اوراکات بہر حال انسانی یعنی محدود و ناقص یا خطا پذیر ہوتے ہیں ' وہی حال کشفی اوراکات و معلومات کا ہے ۔ اس لئے ان کا

---

(۱) الطربی ص ۱۰'۹ ۔ ۱۲

وحی و شریعت کے منصوصات و قطعیات کے مقابلہ میں رد اور ترک کرنا ہی واجب ہوگا۔ دیکھو کہ شیخ نے اس کو بھی کس شدومد سے واضح فرمایا ہے کہ

"جب کسی صاحب کشف پر کوئی ایسا کشف الہی وارد ہو، جو اس کے لئے ایسے امر کو حلال کرے، جس کی حرمت شرع محمدی میں ثابت ہوچکی ہو تو اس وارد کا ترک دینا جزماً واجب ہے۔ کیونکہ وہ تلبیس ہے اور ثابت شدہ شرعی حکم کی طرف رجوع کرنا واجب ہے اور یہ بات تمام اہل کشف کے نزدیک ثابت ہے کہ انقطاع نبوت و رسالت کے بعد حلال و حرام کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں --- بھائیو بڑی ہوشیاری سے کام لو اور کشف کی خرابیوں سے اپنی حفاظت کرو"۔ (۱)

شیخ کے فضل و کمال کی شہادتیں: مزید براں الطربی کی ایک مستقل فصل میں حضرت شیخ کے فضل و کمال کے متعلق بہت سے اساطین امت کی شہادتیں نقل فرمائی ہیں جن میں صرف صوفیاء ہی نہیں، بلکہ علمائے محدثین و فقہاء اور قضاۃ تک کی شہادت موجود ہے۔ اور بقول صاحب قاموس مجد الدین فیروز آبادی کے "شیخ پر صرف بعض ایسے فقہائے خشک ہی نے نکیر کیا ہے، جن کو محققین کے مشرب سے کچھ بہرہ نہ تھا باقی جمہور علماء صوفیا نے تو اس کا اقرار ہی کیا ہے کہ وہ اہل تحقیق و توحید کے امام ہیں اور علوم ظاہرہ میں یکتا و یگانہ ہیں"۔ (۱)

علامہ حافظ ذہبی (صاحب اسماء و الرجال) جو علامہ ابن تیمیہ کی طرح خود شیخ اور دیگر صوفیہ پر شدت سے اعتراض کرنے والوں میں ہیں، ان سے جب شیخ ابن عربی کے اس قول کی نسبت پوچھا گیا جو انہوں نے اپنی کتاب فصوص میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو حضرت نبویہ کے اذن سے لکھا ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ "میں گمان نہیں کرتا کہ ایسا شخص جھوٹ کہتا ہو۔ (۳) اسی طرح امام

---

(۱) الطربی ص ۱۱ - ۱۲ (۲) ایضاً ص ۱۸ - ۱۲ (۳) ایضاً ص ۲۰ - ۱۲

نودی سے شیخ کی نسبت پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا

"کہ ہمارے نزدیک یہ حرام ہے کہ اولیاء اللہ میں کسی کے ساتھ بدگمانی رکھے (بلکہ) واجب ہے کہ ان کے افعال و اقوال کی تاویل کرتا رہے، جب تک کہ ان کے درجہ تک نہ پہنچے۔ اور جس کو اتنی بھی توفیق نہ ہو وہ بالکل ہی گیا گذرا ہو ------- پھر جب تاویل کرے تو ان کے کلام کی ستر وجوہ تک تاویل کرے (تاکہ جس طرح بھی ممکن ہو ان پر سے اعتراض کو اٹھائے) اور ہم صرف ایک دو تاویل کو قبول نہ کریں گے (کہ ایک دو احتمال نکال کر پھر ان کو رد کرکے اعتراض کو قائم رکھے)۔ ایسا کرنا محض تعنت (عناد) ہے"۔

"خود فصوص کی شرح جن لوگوں نے کی ان میں مشاہیر شافعیہ بھی ہیں --- قاضی القضاۃ شیخ شمس الدین خونجی شافعی ابن عربی کی خدمت غلاموں کی طرح کرتے تھے"۔

"شیخ سراج الدین بلقینی اور شیخ تقی الدین سبکی ابتداء میں شیخ ابن عربی پر نکیر رکھتے تھے۔ پھر جب ان کے کلام کی تفسیر و مراد کی تحقیق ہوگئی تو دونوں نے رجوع کیا اور نادم ہوئے ---- (حتیٰ کہ) امام سبکی نے لکھا ہے کہ شیخ محی الدین اٰیۃ من اٰیات اللہ تھے اور فضیلت نے ان کے زمانہ میں اپنی کنجیاں ان کی طرف پھینک دی تھیں اور کہہ دیا تھا کہ میں ان کے سوا کسی کو نہیں جانتا (جس کو یہ کنجیاں سپرد کروں)

حضرت مجدد الف ثانی کی شہادت: سب سے بڑھ کر شیخ کی ولایت و مقبولیت کی سند حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی شہادت ہے کہ شیخ کے بہت سے علوم و معارف کی شدت سے تردید کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں اور بڑے تعجب سے فرماتے ہیں کہ "عجائب کاروبار است شیخ محی الدین از مقبولان در نظرمی آید و اکثر علوم او کہ مخالف آرائے حق اند خطاو ناصواب ظاہرمی شود"۔ یہی نہیں

بلکہ فرماتے ہیں کہ " ردکنندہ شیخ در خطراست و قبول کنندہ او نیز در خطرست " اور اپنا طریق توسط و تحقیق یہ قرار دیتے ہیں کہ

" شیخ را قبول باید کرد و سخناں خلاف اور اقبول نباید کرد ۔ این است طریق وسط در قبول و عدم قبول شیخ کہ اختیار این فقیرست (مکتوب ہشتا دوہفتم جلد ثالث) (۱)

سب سے بڑا اور خاص مسئلہ حضرت شیخ کا وحدۃ الوجود کا ہے ۔ مگر حضرت مجدد صاحب رحمتہ اللہ علیہ اس میں بھی ان کی بڑی رعایت فرماتے ہیں ۔ جیسا کہ اجمالاً ان کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ

آرے در مسئلہ وحدت وجود جم غفیر ازین طائفہ باشیخ شریک اند ۔ ہر چند شیخ درین مسئلہ نیز طرز خاص واردوا قابل توجہ است و شایان جمع این حقیر بعنایت اللہ سبحانہ درشرح رباعیات حضرت ایشان این مسئلہ را بمعتقدات اہل حق جمع ساختہ است ونزاع فریقین را بلفظ عائد داشتہ و شکوک و شبہات طرفین راحل ساختہ بر نحجیکہ محل ریب واشتباہ نماند (مکتوب 226 جلد اول) (۲)

دقیق یاوجدانی مسائل : پھر بعض مسائل قدرۃً نہایت دقیق اور عام سطح عقل سے بلند ہوتے ہیں ' یا ان کا منشا الہام و وجدان ہوتا ہے اس لئے بھی ان میں غلطی اور غلط فہمی زیادہ واقع ہوتی ہے ' اور اسی لئے حضرات صوفیا نے ان کی تعبیر کے لئے خاص خاص اصطلاحات و رموز اختیار کئے تاکہ عام لوگوں کی ضلالت واضلال کا باعث نہ ہوں ۔ بلکہ ہر کس و ناکس کو اپنی کتابوں اور کلام کے مطالعہ سے روکا ہے ۔ اور یہ طرز حضرت شیخ کے ساتھ خاص نہیں ' بلکہ صوفیائے متقدمین سے چلا آتا ہے ۔ حتیٰ کہ امام قشیری (متوفی 465 ھ) فرماتے ہیں کہ

---

(۱) الفرقان ص ۲۳ ' ۲۲ ۔ ۱۲

" صوفیہ نے رموز میں تعبیر کرنے کا کام بہت اچھا کیا کہ اہل اللہ کا طریق غیر اللہ پر ظاہر ہونے سے غیرت کی کہ وہ اس کو غلط سمجھ کر خود بھی گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ۔ اور اس لئے ان حضرات نے مرید (مبتدی) کو اس سے منع کیا کہ صوفیہ کے رسائل کو بدون کسی شیخ سے پڑھے ہوئے خود مطالعہ کرے ۔

" بعض عارفین کہتے ہیں کہ عشاق کی زبان غیر عشاق کے لئے عجمی (یعنی غیر مفہوم) ہے اور وہی زبان اپنے ہم طریق کے لئے عربی (یعنی مفہوم) ہے ۔ اور یہ حکم اولیاء اہل تمکین کے لئے ہے کہ (ان کی زبان اہل طریق کی سمجھ میں آتی ہے) باقی جن پر حال غالب ہے ' سو اہل طریق کے آداب میں سے یہ ہے کہ اس کے حال کو مسلم رکھیں (اور معذور سمجھیں) کیونکہ وہ عشق کی زبان بول رہا ہے ' نہ کہ علم صحیح کی (۱) (بخلاف اہل تمکین کے کہ انہوں نے عشق کے ساتھ علم صحیح کو جمع کر رکھا ہے)

علوم کی تین قسمیں : " جملہ علوم تین قسم کے ہیں ۔ علم عقل و علم احوال اور علم اسرار ـــــ علم اسرار وہ علم ہے جو عقل سے بلند ہے ' اور اس لئے اس علم والے پر جلدی سے انکار کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ طریق الہام سے حاصل ہوتا ہے ۔ اور اکثر عقول ضعیفہ یا متعصبہ اس علم کو رد کر دیتی ہیں اور اس وجہ سے (کہ وہ عقل سے خارج ہے) جو شخص یہ علم دوسرے کو سمجھانا چاہتا ہے ' وہ کمزور فہم والوں تک اس کو پہنچانے پر کسی طرح قادر نہیں ہوتا بجز اس کے کچھ مثالیں یا خطابیات شعریہ استعمال کرے (جن میں اور بھی بعد بڑھ جاتا ہے) اور کاملین کے اکثر علوم اسی قبیل کے ہیں " ۔ (۱)

" حضرت جنید و حسن بصری (ان علوم کو نہایت احتیاط سے بند مکان میں ظاہر کرتے تھے اور) فرماتے تھے کیا تم (ان علوم کو ظاہر کرکے چاہتے ہو کہ اولیاء اللہ (جن سے ہم نے

---

(۱) الطربی ص ۳۶ ـ ۱۲

یہ علوم لئے ہیں) ایسے لوگوں کے نزدیک جھوٹ اور بہتان کے طور پر زندقہ کے ساتھ متہم کئے جاویں جو ان کی اصطلاحات نہیں جانتے " ۔ (۲)

متاخرین میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ جیسے مستند و محقق اس حقیقت کو اپنی تفسیر میں اس طرح واضح فرماتے ہیں کہ

" جو شخص ان پر گفتگو کرنا چاہتا ہے اس کو ایسے مجازات و استعارات سے کام لینا پڑتا ہے جن کے مقصود تک عوام کی رسائی نہیں ہوتی ' اس لئے وہ لوگ اس کو فاسق و کافر بنا دیتے ہیں " ۔

رہا یہ سوال کہ پھر ایسی باتوں پر گفتگو یا تصنیف کی ضرورت ہی کیا ہے ' تو اس کا جواب یہ ہے کہ

" ان تصنیفات سے غرض ان علوم کا افادہ نہیں ' اور نہ ان کے مطالعہ سے قرب وولایت حاصل ہوتی ہے بلکہ مقصود تو ان عارفین کو جو ان علوم کو جذب اور سلوک سے حاصل کر رہے ہیں بعض تفصیلات پر متنبہ کرنا ہوتا ہے اور مریدین کے احوال و مواجید کو اکابر کے احوال و مواجید پر منطبق کرنا ہوتا ہے ۔ تاکہ ان کے احوال کا صحیح ہونا ظاہر ہو جائے اور ان کے قلب کو اطمینان ہو جائے ۔ اور بسا اوقات ان معارف کے ساتھ غلبہ احوال میں گفتگو کرتے ہیں ۔ پس عوام کے لئے ان حضرات کا کلام سننے اور ان کی کتابیں دیکھنے میں طریق مستقیم یہ ہے کہ اعتراض نہ کریں اور بقدر امکان تاویل کرکے ظاہر شریعت پر محمول کریں ۔ کیونکہ ان کا کلام رموز و اشارات ہوتے ہیں یا اگر تاویل سمجھ میں نہ آئے تو علام الغیوب کے حوالہ کردیں ' جیسا کہ متشابہات کی شان ہوتی ہے ۔ کیونکہ ان کے کلام میں مجازات و استعارت ہوتے ہیں ' جن کا ظاہری مطلب

---

(۱) ا۔لعربی ص ۳۸ ' ۳۷ ۔ ۱۲

(۲) ایضا ص ۴۰ ۔ ۱۲

نہیں ہوتا ۔ (ورنہ درحقیقت) ان میں کوئی بات شرع کے خلاف نہیں ہوتی ' بلکہ کتاب وسنت کا مغز ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل و احسان سے نصیب فرمائے " ۔ (۱)

ایک اور احتمال : ایسے مشاہیر و اکابر کے اقوال و تصانیف کے باب میں یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے بعض معاندین حق و دین ان کی طرف خلاف حق و دین باتیں منسوب یا ان کی کتابوں میں الحاق کر دیتے ہیں ' اور حضرت شیخ کے متعلق تو یہ نرا احتمال ہی نہیں ' بلکہ امام عبد الوہاب شعرانی صاف صاف فرماتے ہیں ۔ کہ

" جس قدر ان کا کلام ظاہر شریعت اور طریق جمہور کے خلاف ہے ' وہ خارج سے داخل کر دیا ہے ۔ چنانچہ شیخ ابو طاہر مغربی نزیل مکہ نے پہلے تو مجھ سے یہ بیان کیا اور پھر بعد میں میرے دکھلانے کو فتوحات کا وہ نسخہ نکالا جس کو حضرت شیخ کے اس نسخہ سے مقابلہ کیا تھا ' جو خود شیخ کے خاص قلم کا لکھا ہوا شہر قونیہ میں تھا ' تو میں نے ان عبارتوں میں سے کوئی عبارت نہیں دیکھی ' جن میں مجھ کو تردد تھا اور فتوحات کے اختصار کے وقت میں نے ان کو حذف کر دیا تھا " ۔

اس کے علاوہ بھی امام شعرانی نے ایسے واقعات بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے ' کہ مفسدوں نے بزرگوں کے کلام میں کچھ نہ کچھ عبارتیں ملحق کر دی ہیں ' اس لئے حضرت علیہ الرحمتہ کا ارشاد ہے کہ

" جہاں کوئی اور تاویل نہ ہوسکے وہاں بجائے بزرگوں پر اعتراض کرنے کے بھی احتمال تجویز کرلے کہ شاید کسی نے یہ مضامین ٹھونس دیئے ہوں " ۔

غرض حدیث قدسی کی اس شدید وعید کی بناء پر کہ جس نے میرے کسی ولی سے عداوت رکھی اس کو میں اعلان جنگ دیتا ہوں (من عادی لی ولیا فقد اذنتہ بالحرب)

حضرت علیہ الرحمتہ کا مسلک ہر معاملہ کی طرح اس میں بھی غایت حزم واحتیاط کا ہے کہ تابہ امکان مشہور و مسلم اولیاء اللہ سے سوء ظن وعداوت سے بچنا لازم ہے اور التنبیہ الطربی کی فصل سوم کی مذکورہ عبارات و اقتباسات کے تحت آخر میں صوفیاء اور ان کی کتابوں کے ساتھ معاملہ رکھنے کا خلاصہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ

حضرت کا مسلک احتیاط واعتدال : " جن حضرات میں قبول کے علامات ظاہر ہیں ' اور منجملہ ان علامات کے علمائے محققین کا حسن ظن بھی ہے ' ان کے ساتھ حسن اعتقاد رکھے ۔ اور ان کے کلام میں اگر کوئی امر ظاہرا خلاف سواد اعظم دیکھے تو اپنا اعتقاد اس کے موافق نہ رکھے ' نہ اس کو کسی کے سامنے نقل کرے ' نہ ایسی کتابوں کا مطالعہ خود کرے ' جب تک کسی شیخ سے نہ پڑھ لے ۔ کیونکہ ان حضرات کا مقصود عوام کے لئے تدوین نہیں ' بلکہ عوام سے اخفا فرماتے تھے ۔ لہٰذا اعتقاد سواد اعظم کے موافق رکھے اور اس کلام میں اگر تاویل ممکن ہو تاویل کرے ' ورنہ غلبہ حال پر محمول کرلے یا دشمنوں کے ملحق کر دینے کا احتمال کرے ' یا مثل متشابہات کے اس کو مفوض بحق کرے ۔

غرض جہاں تک ممکن ہو ایسے حضرات پر اعتراض اور ان کے ساتھ گستاخی سے بچے ۔

" کیونکہ گو وہ معصوم نہ تھے ' لیکن شریعت کے بے حد متبع تھے چنانچہ غیر معذور سے اگر کوئی فعل خلاف شریعت ظاہر ہو تو اس پر خود ان سے نکیر منقول ہے ۔ اور اس لئے احکام میں خود ان سے ایسا امر منقول نہیں (جو شریعت کے خلاف ہو) صرف بعض اسرار منقول ہیں ' جن کی بنیاد ذوق وکشف پر ہے ' اور تعبیر خاص اصطلاحات میں کی گئی ہے ۔ اور ان دونوں چیزوں سے چونکہ عوام اور اہل ظاہر بے بہرہ ہیں ' اس لئے ان کے کلام کے معارض شریعت ہونے کا یہ لوگ فیصلہ نہیں کرسکتے گو ظاہری (علم وفضل کے اعتبار سے) ان سے بڑھے ہوئے ہوں ۔ اس لئے ان کو اجمالاً تسلیم کرلینا چاہئے ورنہ گستاخی سے سوء خاتمہ

کا اندیشہ ہے۔

" البتہ جو شخص ایسا ہی محقق ہو اس کو حق ہے کہ ایسے کلام پر مفصلاً رد کرے خواہ خطاء اجتہادی کے درجہ میں اور خواہ ابطال کی حد تک۔ (۱)

حضرت کا مسلک خاص حضرت شیخ کی نسبت : آخر میں خاتمہ کتاب پر تحقیقات بالا ہی کے موافق حضرت علیہ الرحمہ نے خود اپنا مسلک حضرت شیخ کی نسبت جو تحریر فرمایا ہے، وہ اس لحاظ سے سننے کے لائق ہے کہ ہر ہر جز کتاب و سنت کے کیسا تابع ہے۔ خصوصًا ان حضرات کے لئے جو کتاب و سنت ہی کا نام لے کر حضرت شیخ یا ایسے دیگر حضرات پر زبان دراز کرتے ہیں ارشاد ہے کہ

" میرا مسلک حضرت شیخ قدس اللہ سرہ کے باب میں یہ ہے کہ بنابر شہادت جم غفیر اکابر امت، جس کی حجت انتم شهداء الله فی الارض سے ثابت ہے، شیخ کی مقبولیت و ولایت کا عقیدہ کامل رکھتا ہوں، اور شیخ کے اکثر علوم جواز قبیل اسرار ہیں، اور میرے فہم سے خارج ہیں عقلا نہ ان کے اثبات کا حکم کرتا ہوں بامتثال آیت لاتقف مالیس لک به علم اور نہ ان کی نفی کا باتماء آیت بل کذبوا بمالم یحیطو بعلمه۔ اور بلا ضرورت شرعیہ ان کی اشاعت و اشتغال کو مضر سمجھتا ہوں بحکم آیت واما الذین فی قلو بهم زیغ فیتبعون ماتشابه منه ابتغاء الفتنه و ابتغاء تاویله اور طبعًا ان کے اقوال کی طرف توجہ کرنے سے قلب میں اطمینان نہیں پاتا ہوں اس لئے مطابق حدیث دع مایریبک الی مالایر یبک ان کا استحصار نہیں کرتا اور جن علماء نے حفاظت شریعت کے لئے حدود شرعیہ کے اندر رہ کر اقوال شیخ بلکہ شیخ پر نکیر کیا ہے ان کو حسب آیت لا یکلف الله نفسا الا وسعها اور حدیث انما الاعمال بالنیات معذور جانتاہوں۔

---

(۱) الطرائف ص ۱۴۱ ۔ ۱۴

" اور اس مجموعی مسلک میں اپنے کو حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ متوافق دیکھتا ہوں ' جیسا کہ ان کے بعض مکتوبات سے ظاہر ہے (جس کے کچھ جملے اوپر نقل ہوئے) البتہ مجدد صاحب میں یہ امر مزید ہے کہ وہ ان کے اقوال پر کلام بھی کرتے ہیں ' جو بوجہ ان کے محقق و صاحب کشف ہونے کے ان کا حق ہے اور ہم یہ منصب نہیں رکھتے بقول عارف رومی رحمتہ اللہ علیہ

آرزو میخواہ لیک انداز خواہ
برنتا بد کوہ را یک برگ کاہ

حضرت منصور : اس زمرہ عشاق میں سب سے زیادہ بدنام شخصیت حضرت منصور کی ہے ' جو اصل ابن منصور ہیں ' لیکن شہرت منصور ہی کے نام سے ہوگئی ۔ ان کے ایک ہی قول (اناالحق) نے ان کو اہل باطن کی نظر میں عرفان و ولایت کی سند دلوائی اور اسی نے اہل ظاہر کی نظر میں مستوجب دارورسن ٹھہرایا ۔

ان کی صفائی : حضرت علیہ الرحمہ کو ان کی صفائی کی شہادت کا اتنا اہتمام تھا کہ اولاً تو ان کے کلام (اشعار) کی ایسی شرح تحریر فرمائی " جس کے بعد کوئی بات شریعت مقدسہ کے خلاف ان کے کلام میں باقی نہیں رہتی " ۔ ساتھ ہی ان کے دیگر حالات و واقعات کی تحقیق کے لئے القول المنصور فی ابن منصور کے نام سے ایک رسالہ کا بھی مواد جمع کرایا ' اور حد یہ کہ وصیت فرمائی کہ " اگر یہ کام میرے سامنے پورا نہ ہو تو بعد میں کوئی صاحب اس کی تکمیل کر دیں " ۔ (۱) اس

---

(۱) الطرائف ص ۴۲ ۔ ۱۲

سے اندازہ فرمائیے کہ حضرت کی نگاہ میں ان حضرات اہل اللہ کی حمایت و تبریہ کا کام کتنا مہتم بالشان تھا جس کی وجہ بھی کیسی معقول و دلنشین بیان فرمائی کہ

"کسی غیر مقبول کے ساتھ حسن ظن رکھنا مضر نہیں ۔ اور مقبول سے بلاوجہ بدگمانی کرنا مضر ہے اس کی مثال، ہے کہ کسی رذیل کے ساتھ شریفوں جیسا معاملہ کرنا برا نہیں ۔ لیکن کسی شریف سے رذیلوں جیسا برتاؤ بہت برا ہے ۔" (۲)

ان کی مقبولیت کے گواہ : لیکن حضرت کی یہ وصیت الحمد اللہ ان کی زندگی ہی میں حضرت کے صاحب علم وفضل بھانجے مولانا ظفر احمد صاحب نے ایسے طریق پر پوری فرما دی کہ حضرت فرماتے ہیں کہ " میں خود ایسے طرز سے لکھنے پر قادر نہ تھا " بلکہ اس حدیث کی رو سے ابن اخت القوم منهم ان کے قلم یا ہاتھ کو حکماً اپنا ہی ہاتھ قرار دیا ۔ (۳) اور حق یہ ہے کہ مولانا موصوف نے کوئی قریب و بعید پہلو داد تحقیق کا اٹھا نہیں رکھا جتنے مشکوک و مشتبہ اقوال و ملفوظات مل سکے سب کی ایک ایک کرکے تحقیق و توجیہ کی گئی ہے ۔ متقدمین و متاخرین میں بہت سے ظاہر و باطن کے مسلم اکابر کی شہادتوں کو حضرت ابن منصور کی براءت ہی میں نہیں بلکہ ان کی مقبولیت و ولایت کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے ۔ مثلاً امام قشیری ۔ امام غزالی ' حضرت غوث اعظم ' شیخ عبد القادر جیلانی ' مولانا رومی ' علامہ شیخ عبد الوہاب شعرانی ' حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی ' حضرت مولانا عبد الرشید گنگوہی وغیرہ ہم ۔ راقم سطور کے نزدیک سب سے زیادہ تحقیق اس باب میں حضرت شیخ ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ کی فیصلہ کن ہے ' جو اس حیثیت سے اور بھی دلچسپ و قابل نقل ہے کہ اس سے خود حضرت شیخ پر طعن کرنے والوں کو معلوم ہوگا ' کہ شیخ کی نگاہ میں کتاب و سنت کے اتباع واحترام کا کیا مقام ہے فرماتے ہیں کہ

---

(۱) القول المنصور ص ۴ ۔ ۱۲

(۲) ایضا ص ۵ ۔ ۱۲

(۳) ایضا ص ۵ ۔ ۱۲

شیخ اکبر کا قول فیصل: "مشائخ صوفیہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک جو کتاب و سنت کے عارف ہیں' ظاہر میں کتاب و سنت کے موافق باتیں کرتے ہیں اور باطن میں کتاب و سنت سے رنگے ہوتے ہیں۔ اللہ کے حدود کی نگہبانی کرتے' اس کے عہد کو پورا کرتے' احکام شرع کی پابندی کرتے ہیں' امت پر شفقت کرتے ہیں۔ کسی گنہگار کو حقیر و ذلیل نہیں کرتے۔ اللہ کو جو مبغوض ہے' اس سے بغض رکھتے ہیں۔ اللہ کے راستہ میں کسی ملامت کی پروا نہیں کرتے' اچھی باتوں کا امر کرتے ہیں' اور متفق علیہ منکر سے منع کرتے ہیں۔ یہ حضرات وہ ہیں جن کا اقتداء کیا جاتا ہے' ان کا احترام واجب ہے۔ یہی ہیں جن کی صورت دیکھنے سے خدا یاد آتا ہے"۔

"اور دوسری قسم کے وہ مشائخ ہیں جو صاحب احوال ہیں' ان کی حالت بدلتی رہتی ہے۔ ظاہر میں ان کے اندر (شریعت کا وہ) تحفظ نہیں (جو پہلی قسم کے مشائخ میں ہوتا ہے' نہ وہ احتیاط ہے' جو ان میں ہوتی ہے) ان کے احوال کو تو تسلیم کرلیا جائے' مگر ان کی صحبت نہ اختیار کی جائے اگر ان سے کچھ کرامات بھی ظاہر ہوں تو ان پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے جب کہ ان کے اندر شریعت کے ساتھ کے ساتھ سوء ادب موجود ہے۔ کیونکہ ہمارے لئے اللہ تک پہونچنے کا راستہ اس راستہ کے سوا کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ نے شریعت میں مقرر فرما دیا ہے' تو جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تک پہنچنے کا راستہ شریعت کے خلاف بھی ہوسکتا ہے' اس کا قول غلط اور جھوٹ ہے۔ بس جس شخص میں (شریعت کا) ادب نہ ہو اس کی اقتدا نہ کی جائے گی اگرچہ وہ اپنے حال میں سچا ہو' اس کا احترام کیا جائے گا"۔ (فتوحات باب ۱۸۱)

بس اس تقسیم کے رو سے قول فیصل یہی ہے کہ حضرت منصور کا شمار قسم ثانی کے مشائخ میں کیا جائے' جیسا کہ فتوحات ہی کے ایک دوسرے باب کرامات میں ارشاد ہے کہ "جس طرح رسول کے ذمہ معجزات و کرامات کا اظہار واجب ہے' کیونکہ وہ (رسالت و نبوت کا) مدعی ہے اسی طرح ولی کے ذمہ کرامات کا اخفا واجب ہے'

کیونکہ وہ مدعی نہیں ' نہ اس کو دعوئی کرنا جائز ہے کیونکہ وہ صاحب تشریع نہیں
-------- اور یہ ولی اگر کسی وقت شریعت کے مقرر کردہ میزان سے باہر قدم
نکالے تو اگر وہ عاقل و مکلف ہے ' (مغلوب الحال نہیں) تو اس کے حال کو تسلیم
کیا جائے گا ' کیونکہ اس کے متعلق نفس الامر میں احتمال ہے کہ (قوی عذرات
سے اس کے حق میں شریعت کی مخالفت مضر نہ ہو) اور وہ احتمال بھی (بے اصل
نہیں بلکہ) میزان شرع میں موجود ہے " ۔

" لیکن اگر اس سے کسی ایسے امر کا صدور ہو جس پر ظاہر شرع میں حد
واجب ہوتی ہے اور حاکم کے نزدیک ثبوت بھی ہوگیا ' تو اس پر حد قائم کی جائے
گی ' اور وہ احتمال حدود سے نہ بچائے گا ۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے بارے
میں اعملو ما شئتم فقد غفرت لکم فرمایا ہے (کہ تم جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش
دیا) یہ نہیں فرمایا کہ میں نے تم سے دنیا میں حدود بھی ساقط کر دیں (تو اگر
فرض کرلیا جائے کوئی اہل بدر کی طرح مغفور ہوگیا ہے سو ممکن ہے کہ آخرت میں
اس سے مواخذ نہ ہو لیکن دنیا میں جب تک وہ حد تکلیف کے اندر ہے ضرور
مواخذہ کیا جائے گا)

" بس احکام ظاہر میں جو حاکم اس ولی پر حد جاری کرے گا ثواب کا مستحق ہوگا
۔ " جیسے (منصور حلاج اور ان جیسے دوسرے) ' (فتوحات باب ۱۹۶)

مولانا روم کی توجیہہ اناالحق : غرض قسم ثانی کے اولیاء یا بزرگوں سے اگر کوئی
بات ظاہر شریعت کے خلاف ظاہر ہو تو چونکہ وہ صاحب احوال ہیں یعنی ان کی
حالت تمکین کی نہیں کبھی کسی حال میں ہوتے ہیں کبھی کسی حال میں ' اس لئے ان
کا کسی وقت کسی حال سے مغلوب ہو جانا بالکل بعید نہیں اور زیادہ تر غلبہ حال کی
معذوری ہی ان حضرات سے بعض بظاہر خلاف ادب اقوال و افعال کے صدور کا
باعث ہو جاتی ہے ۔ حضرت مولانا روم نے بھی اس غلبہ حال ہی کو منصور کے
اناالحق کا عذر قرار دیا ہے جس کو مستی یا غلبہ وفا (یعنی عشق و محبت) سے تعبیر

فرمایا ہے کہ

گفت فرعونے اناالحق گشت پست
گفت منصور اناالحق گشت مست
لعنۃ اللہ این انارا درقفا
رحمۃ اللہ این انارا دروفا

اور اپنے ملفوظات " فیہ مافیہ " میں اس غلبہ حال و استغراق کی عجیب توجیہ فرمائی ہے کہ انا الحق میں اناالعبد سے بھی زیادہ تواضع و تذلل ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

" استغراق آن باشد کہ او درمیان نباشد ' اور اجہد نماند و حرکت نماند غرق آب باشد ہر فعل کہ ازو آید آن فعل او نباشد فعل آب باشد۔ اگر ہنوز درآب دست و پازند آن راغرق نگویند یا بانگے می زند کہ آہ غرق شدم این رانیز استغراق نگویند۔ آخر این انا الحق گفتن منصور ہم ازین معنی است مردم پندارند کہ دعویٰ بزرگ است۔ انا العبد گفتن دعوے بزرگ است انا الحق عظیم تواضع است۔ آنکہ می گوید کہ من عبد خدایم د وہستی اثبات می کند یکے خودرا ویکے خدارا اما آنکہ انا الحق گوید خودرا عدم کرود بباددادی گوید کہ من نیستم ہمہ اوست جز خدا ہستی نیست من بکلی عدم محضم و ہیچم تواضع درین جابیشتراست۔ این ست کہ مردم فہم نمی کنند " (ص ۱۱۷)

یعنی پانی میں پوری طرح غرق ہو جانا یہ ہے کہ آدمی میں اپنے ارادہ کی کوئی حرکت باقی نہ رہ جائے جو حرکت بھی ہو وہ پانی کا فعل ہو۔ حتی کہ جب تک وہ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے یا یہ شور مچا رہا ہے کہ میں ڈوبا ' اس وقت تک وہ ڈوبا نہیں (استغراق کامل نہیں) اور منصور کے " اناالحق " کا منشایہ استغراق کامل ہی تھا لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی بڑا دعوے ہے۔ حالانکہ بڑا دعوے " اناالعبد " کہنا ہے کیونکہ اس میں خدا کے ساتھ اپنی یا عبد کی ہستی کا بھی دعوے ہے ' اور انا الحق

کے معنی یہ ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں عدم محض ہوں ' وجود صرف خدا ہی کا ہے
- اس میں تواضع زیادہ ہے - بس یہ بات ہے کہ لوگ اس کو سمجھتے نہیں -

حضرت باقی باللہ کی تائید: اسی کو خواجہ باقی باللہ فرماتے ہیں کہ ''معنی عبارت انا الحق نہ آنست کہ من حقم بلکہ آنست کہ من نیستم و وجود حق ست سبحانہ۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ علیہ سے بڑھ کر شریعت اور کتاب و سنت کا پاس کس کو ہوگا مگر حضرت مکتوبات باقی باللہ کے اس قول کو بلا کسی رد و نکیر کے نقل فرماتے ہیں (دیکھو دفتر اول حصہ ۴ ص ۱۱ مطبوعہ امرتسر)

عارف الہ آبادی کا نکتہ: اس نکتہ کو عارف الہ آبادی حضرت اکبر نے اور تیز کرکے ''حضرت منصور'' پر مواخذہ اور اجرائے حد کو کیسا حق بجانب ثابت فرمایا کہ

حضرت منصور کہتے ہیں انا بھی حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں اگر اتنا ہوش ہے

یعنی انا الحق کہنے میں خدا کی ہستی کے ساتھ انا کا بھی اثبات ہے' جو ہوش اور تکلیف کی دلیل ہے اس ''انا'' کو بھی فنا کرکے خالی حق کہتے تو عین حق تھا۔ کون اعتراض کر سکتا تھا۔

استغراق کی عام فہم توجیہ: لیکن حال یا استغراق تام کی سب سے سہل اور عام فہم توجیہہ عشق و محبت کا استیلائی غلبہ ہے' جس کا اثر جب مجازی عشق میں یہاں تک ہو سکتا ہے کہ مجنون انا لیلیٰ کہنے لگتا ہے تو پھر ''عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود''۔ جیسا کہ حضرت شبلی رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ

''صاحبو مجنون عامری کی حالت یہ تھی کہ جب اس سے لیلیٰ کو دریافت کیا جاتا تو کہتا کہ میں ہی تو لیلیٰ ہوں وہ لیلیٰ کی محبت میں لیلیٰ کی ذات (خاص) سے بھی غائب ہو جاتا تھا۔ لیلیٰ کے مشاہدہ ہی میں رہتا تھا یہ مشاہدہ اس کو لیلیٰ کے سوا ہر چیز سے غائب کر دیتا تھا۔ تمام چیزوں (حتی کہ خود اپنے کو بھی) لیلیٰ ہی مشاہدہ کرتا تھا۔ پھر اللہ کی محبت کا دعویٰ کرنے والا یہ دعوائے محبت کیونکر کرتا ہے' حالانکہ وہ تمیز کی صفت بھی رکھتا ہے' اپنی معلومات وما لوفات اور حظوظ نفس سے تعلق بھی رکھتا ہے۔ ہیہات (ایسی صورت میں) اس کو اللہ سے محبت کا دعوے کا کیا حق''۔ ص ۹۶

اسی طرح امام ابو نصر سراج نے تصوف کی سب سے قدیم کتاب کتاب اللمع میں کسی کا قول نقل کیا ہے کہ

انا من اھوی و من اھوی انا
فاذا ابصرتنی ابصرتنا
نحن روحان معا فی جسد
البس اللہ علینا بدنا

یعنی میں محبوب کا عین ہوں اور محبوب میرا عین ہے، جب تو مجھے دیکھے ہم دونوں کو دیکھ لے گا۔ ہم دو روحیں ایک بدن میں اکٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہم دونوں کو ایک قالب پنہا دیا ہے۔ پس وہی کہ ۔۔۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تاکس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری

اسی طرح کسی اور کا قول ہے۔

یا منیۃ المتمنی افنیتنی بک عنی
ادنیتنی منک حتی ظننت انک انی

یعنی آرزو کرنے والے کی آرزو تو نے اپنے ساتھ مشغول کرکے مجھ کو خود اپنے سے فنا کر دیا اور خود سے مجھ کو اس قدر نزدیک کر لیا ہے کہ مجھ کو گمان ہونے لگا کہ تو میں ہوں"۔ (ص ۱۹۵)

اس کو نقل کرکے امام سراج فرماتے ہیں کہ "یہ محبت کے غلبہ سے ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ حال و خطاب ہے، تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو اس ذات کی محبت کا مدعی ہے، جو رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے" عجیب بات ہے کہ اوپر جو اشعار اس حال کے نقل ہوئے وہی خفیف لفظی تغیر کے ساتھ خود حضرت منصور کی طرف بھی منسوب ہیں۔ ملاحظہ ہو (ص ۲۹۴)

انا من اهوی ومن اهوی انا
نحن روحان حللنا بد نا
عجبت منک و منی افنیتنی بک عنی
ادنیتنی منک حتی ظننت انک انی

اس عام فہم توجیہ کے ہم رنگ ایک اور توجیہ خواص اہل علم کے لئے بھی قابل ملاحظہ ہے' جو تذکرۃ الاولیاء حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمہ اللہ علیہ سے القول المنصور کے ضمیمہ اول میں نقل ہے کہ

"مجھے تعجب ہے کہ بعضے اس کو تو جائز سمجھتے ہیں کہ ایک درخت سے تو انی انا اللہ کی آواز آئے اور درخت کا اس میں کچھ دخل نہ ہو' ان کے نزدیک یہ کیوں جائز نہیں کہ حسین منصور سے انا الحق کی آواز صادر ہو' اور ان کا اس میں کچھ دخل نہ ہو۔ جس طرح حضرت عمرؓ کی زبان پر حق تعالیٰ نے تکلم کیا تھا' اسی طرح منصور کی زبان پر تکلم فرمایا۔ اس میں نہ حلول کا کچھ کام نہ اتحاد کا"۔

قرب نوافل کی حدیث سے توجیہ : راقم احقر کے نزدیک اسی سے ملتی جلتی صورت قرب نوافل کی مشہور و مسلم حدیث والے قرب کی ہے' جس میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندہ کا میں پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے' ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے الی آخر الحدیث۔ جس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ بندہ اپنے ارادہ سے خالی ہو جاتا ہے' اس کے اعضاء و جوارح فعل حق کا محض آلہ رہ جاتے ہیں۔ فاعل حقیقی خود حق تعالیٰ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس قرب نوافل کے مقام میں زبان بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تکلم کا محض آلہ بن جاتی ہے اور اصل متکلم خود اللہ تعالیٰ ہوتے ہیں تو اب انا الحق منصور نے نہیں' کہا بلکہ ان کی زبان اسی طرح اس کلام کے نطق کا محض آلہ تھی جس طرح شجر طورانی انا اللہ کے نطق کا محض آلہ یا مظہر تھا' اور اصل متکلم اللہ تعالیٰ تھے واللہ اعلم بالصواب۔

حق و خلق کی غیریت پر خود حضرت منصور کا قطعی قول : خصوصًا جب

حضرت منصور کے خود اور بہت سے اقوال حلول و اتحاد کے قول و عقیدہ کے صراحتہً خلاف اور خدا و بندہ کی غیریت پر نص قطعی ہیں تو انا الحق وغیرہ کے سے مشکوک اقوال کی کوئی نہ کوئی ایسی ہی توجیہ و تاویل قبول کرنا پڑے گی ' جو حقیقی حلول و اتحاد یا عینیت کو مستلزم نہ ہو چنانچہ امام قشیری نے ان کے جو اقوال نقل فرمائے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں کہ

" اللہ تعالٰی اپنی مخلوق کے احوال سے منزہ ہے ' اس کو اپنی مخلوق سے کسی قسم کا امتزاج نہیں --------- وہ اپنی قدامت کے سبب مخلوق سے الگ ہے جیسا مخلوق اپنے حدوث کے سبب اس سے الگ ہے ------ اس کی معرفت یہ ہے کہ اس کو واحد جانو اور توحید یہ ہے کہ مخلوق سے اس کو ممتاز سمجھو ------ جو چیز اسی سے پیدا ہوئی وہ اس میں کیسے حلول کر سکتی ہے " (۱)-

قتل سے پہلے " پورے ایک ہزار تازیانے لگائے گئے مگر اس (اللہ کے بندے) نے نہ معافی طلب کی نہ آہ کی بس ہر تازیانہ پر احد احد ہی کہتے رہے -

موحد چہ برپائے ریزی زرش
چہ تیغ ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نباشد زکس
ہمیں است بنیاد توحید بس

فناء عشق کا کمال : فلسفہ کی کرسی پر بیٹھ کر وحدۃ الوجود کا لکچر تو سب ہی دے سکتے ہیں لیکن انا الحق کہنے کا کسی کو کچھ حق ہو سکتا ہے تو اس کو جو ذات حق کی محبت میں اس درجہ فنا و غرق ہے کہ " جب ہزار تازیانے لگ چکے تو ایک ہاتھ

---

(۱) ص ۱۳۱ - ۱۲

(۲) ص ۴۰ - ۱۲

کاٹا گیا ، پھر ایک پاؤں کاٹا گیا ، پھر دوسرا ہاتھ کاٹا گیا ، پھر دوسرا پاؤں کاٹا گیا ، مگر اف نہ کی بلند آواز سے صرف یہ اشعار پڑھے " ۔(ص ۱۰۴)

و حرمۃ الود الذی لم یکن
یطمع فی افسادہ الدھر
مانالنی عند ھجوم البلاء
باس ولا مسنی الضر
ماقطع عضو ولا مفصل
الا وفیہ لکم ذکر

قسم کھاتا ہوں اس محبت کی حرمت کی جس کو بگاڑنے کی زمانہ نے کبھی طمع نہیں کی (یعنی وہ محبت ایسی قوی ہے کہ انقلاب زمانہ سے اس میں ضعف و تغیر کا احتمال نہیں) مجھ کو ہجوم بلا کے وقت نہ کبھی تکلیف پہنچی نہ کوئی ضرر پہنچا ۔ میرا کوئی عضو یا جوڑ نہیں کاٹا گیا جس میں تمہاری یاد نہ ہو (یعنی تمہاری یاد ایسے وقت بھی دل سے نہ گئی (اسی سے وہ تکلیف تکلیف نہ معلوم ہوئی)

مولف رسالہ المنصور نے خاتمہ پر خوب ہی تحریر فرمایا کہ

" اسی سخت سزا اور سنگین مصیبت کو اس درجہ صبر و استقلال کے ساتھ اور خندہ پیشانی سے تحمل کرنا نہ کسی زاہد خشک سے ممکن ہے نہ کسی ساحر زندیق سے ۔ اور عین اس حالت میں نشہ توحید سے سر شار ہو کر محبت و عشق الٰہی کا ایسا درد انگیز اظہار کرنا کہ مشائخ وقت بھی نعرہ حسب الواحد افراد الواحد لہ سن کر رقت پذیر ہوگئے اور اس درد انگیز حالت میں شبلی جیسے امام طریقت کے سوالات کا جواب دینا ابن منصور کی جس شان یکتا کو ظاہر کرتا ہے ۔ زمانہ کی نگاہ نے اس کا نظارہ بہت کم کیا ہوگا " ۔

" پس حقیقت یہ ہے کہ ابن منصور کا واقعہ قتل اور سانحہ ہو شربای ان کے سچے صوفی عاشق فانی محب سبحانی اور صاحب استقلال لاثانی ہونے کی بہت

بڑی دلیل ہے " ۔

(رہا یہ امر کہ) اس مجمع میں کسی نے بھی ان کی اس حالت استقامت اور مستی محبت بدرجہ کمال سے ان کی ولایت و معرفت پر کیوں نہ استدلال کیا ! ؟ تو اہل بصیرت نے ضرور کیا ہوگا " ۔

لیکن اہل عداوت یا ابو جہلوں کے آنکھیں ہی کہاں ہوتی ہیں ۔ اور ابن منصور کے بارے میں تو تاریخ کی تحقیق کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ وزیر حامد کی سازش و عداوات کا نتیجہ تھا ۔ جیسا کہ مولانا روم نے بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

چون قلم دردست غدارے فتاد
لا جرم منصور بردارے فتاد

مغلوبیت کمال نہیں : تاہم آخر میں یہ بات ضرور پیش نظر رہے کہ حضرت منصور کی ولایت و معرفت اور عشق و محبت کی مغلوبیت سب مقبول و مسلم ، لیکن یہ مغلوبیت بہرحال مغلوبیت ہی تھی اور خالص اسلامی تعلیم و تصوف اور اسوۂ نبوت کے اعتبار سے یہ کمال نہیں بلکہ نقص کی حالت ضرور تھی ۔ جس کی طرف حضرت مخدوم شیخ عبدالحق ردولوی رحمتہ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ " منصور بچہ بوداز یک قطرہ بفریاد آمدا ینجا مردانند کہ دریاہا بافرد برندو آروغے نہ زنند (ص ٦٥) اور جس کی صاف تصریح حضرت مجدد وقت حکیم الامت رحمتہ نے فرمادی کہ

" وہ اہل باطل میں سے تو نہیں اور ایسے اقوال (و احوالؔ جن سے ان کے صاحب باطل ہونے کا وہم ہوتا ہے) یا غلط ہیں یا ماول یا قبل دخول فی الطریق کے ہوں ، مگر اس کے ساتھ ہی کاملین میں سے نہیں ۔ مغلوب الحال ہیں ، اس لئے معذور ہیں " ۔ (ص ٦٥)

یہ تو وہ حضرات تھے، جن کے سر سے ایمان و عقیدہ ہی میں خلل و فساد کی بدنامی و بدگمانی پھیلی ۔ ان سے بہت زیادہ تعداد ان اکابر کی ہے، جو اپنے عمل یا اتباع شریعت و سنت میں سستی و کوتاہی کے لئے بدنام ہیں ۔ ان میں خاص طور سے خانوادہ چشتیہ کا نام زیادہ لیا جاتا ہے اور ہمارے ملک میں اسی سلسلہ کے نام لیوا زیادہ ہیں ۔ خود حضرت علیہ الرحمہ کے سلسلہ کی نسبت یوں تو تمام نام آور سلاسل سے ہے ۔ لیکن خصوصی ربط و نسبت اسی " خاندان عالی " سے ہے ۔ اس لئے اور بھی حضرت پر اس سلسلہ کی طرف سے دفاع و تبریہ کا حق تھا ۔ " السنتہ الجلیہ فی الچشتیہ العلیہ " کے نام سے کچھ کم دو سو صفحات کی کتاب اسی موضوع پر سپرد قلم فرمائی ہے ۔ تمہید میں ارشاد ہے ۔

" مدت سے عام لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بسا ہوا ہے اور جوں جوں جہل کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اس میں قوت ہوتی جاتی ہے کہ حضرات صوفیہ میں عموماً اور چشتیہ میں خصوصاً شریعت کا اتباع نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے ۔ اس سے دو مفسدے پیدا ہوتے ہیں ایک ان حضرات کے معتقدین میں دوسرا غیر معتقدین میں ۔

" معتقدین کے اعتقاد میں تو خود شریعت ہی کا اتباع اس خیال سے ضروری نہیں رہا کہ ضروری ہوتا تو یہ حضرات ہی متبع ہوتے ۔ اور غیر معتقدین میں یہ مفسدہ ہوتا ہے کہ ان کے اعتقاد میں شریعت تو واجب الاتباع ہے، مگر چونکہ یہ حضرات ان کے زعم میں متبع نہیں، اس لئے وہ ان کی شان میں گستاخی کرنے لگے ۔ اول مفسدہ تو سرحد کفر سے ملا ہوا ہے کہ اس میں جحود (انکار) ہے شریعت مقدسہ کا جس کا وجوب نصوص قطعیہ سے ثابت ہے ۔ اور دوسرا مفسدہ گو کفر نہیں، مگر درجہ بدعت شنیعہ و معصیت قطعیہ تک یقیناً پہنچا ہے، کہ بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل مقبولان الٰہی سے بدگمانی اور ان کی شان میں بدزبانی ہے جو نصوص کے خلاف ہے اور نصوص کے خلاف علم اگر شبہہ سے ہے تو بدعت ہے ورنہ فسق و معصیت بلا شبہہ ہے ۔

" وہ نصوص یہ ہے قال تعالی ولا تقف ما لیس لک بہ علم و قال تعالی ان یتبعون الا الظن و ان الظن لا یغنی من الحق شیئا وقال تعالی اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم " ۔ ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضا ۔ وقال تعالی ان الذین یوذون المومنین و المومنات بغیر ما اکتسبوا فقد احتملوا بھتانا واثما مبینا ۔ وقال تعالی فی الحدیث القدسی من عادلی ولیاء فقد ازنتہ بالحرب وغیرہ ذلک من الایات ولا حادیث ۔ (ا)

" چونکہ یہ دونوں ضرورتیں شدید ہیں ' اس لئے ان کی اصلاح کی سخت ضرورت تھی ۔ اور کسی مفسدہ کی اصلاح کا متعین طریق اس کے سبب کا ازالہ ہوتا ہے ۔ اور اس مفسدہ کا سبب وہی ان حضرات کے تبع شریعت نہ ہونے کا خیال ہے ۔

لیکن یہ خیال بے بنیاد نہیں ' بلکہ اس کا ایک بڑا مبنٰی موجود ہے جو ان دونوں مفسدوں کا بڑا منشا رہا ہے ' وہ یہ کہ

" ان حضرات کو دوسرے طبقات مسلمین سے دو امر میں خاص درجہ کا امتیاز حاصل ہے ۔ ایک ان کے نور قلب و مشاہدات کی وجہ سے ان پر اسرار خاصہ کے انکشاف کا 'دوسرے کثرت ذکر و مراقبات کی وجہ سے غلبہ محبت کا یہ دونوں امر کبھی بعض ایسے اقوال کے صدور کا سبب ہو جاتے ہیں ۔ جس کی کنہ تک اہل ظاہر نہیں پہنچتے ۔ اور کبھی بعض ایسے افعال کے صدور کا ' جن کے عذر تک

(ا) فرمایا اللہ تعالی نے کہ " جو تم جانتے نہیں اس کے درپے نہ ہو ۔" اور فرمایا کہ " وہ محض ظن و تخمین سے کام لیتے ہیں حالانکہ ظن حق کا کام بالکل نہیں دیتا ۔ اور فرمایا کہ ظن و تخمین سے بہت کام نہ لیا کرو کیونکہ بعض ظنی باتوں سے گناہ ہو جاتا ہے " ۔ اور فرمایا کہ " ٹوہ نہ کیا کرو نہ ایک دوسرے کی غیبت کیا کرو " ۔ فرمایا کہ " جو لوگ مسلمان مرد عورتوں کو ایسی باتوں سے متہم کرتے ہیں جو انہوں نے کی نہیں ' تو یہ کھلے بہتان اور گناہ کا وبال خریدتے ہیں " ان کے علاوہ بھی بہت سے آیات و احادیث ہیں ۔ ۱۲

اہل ظاہر نہیں پہنچتے"۔

لہٰذا اصلاح کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ان اقوال و افعال کی کنہ و عذر کی تحقیق و تفصیل کی جاتی ' جس کے لئے اول تو بڑے بڑے دفتر بھی کافی نہ ہوتے دوسرے جو لوگ "انکشاف اسرار" اور "غلبہ محبت" کو نہیں جانتے کہ کیا ہے ' جیسا کہ عامتہ الناس اور اہل ظاہر کا حال ہے تو ان کے لئے یہ تفصیل و تحقیق بھینس کے آگے بین بجانا ہوتا۔

" اس لئے اکثر اوقات مصلحین نے اس کے ایک بدل کو کافی سمجھا۔ وہ یہ کہ خود ان حضرات کے اقوال و افعال سے کلی طور پر اتباع شریعت کا اہتمام و التزام ثابت کر دیا جائے۔ اور چونکہ مسلمان عقلا کے اقوال و افعال میں اصل یہی ہے کہ ان میں تعارض نہ پایا جائے اور ان کو صلاح پر ہی محمول کیا جائے ' جب تک اس کے خلاف کوئی یقینی وجہ نہ ہو ' جیسا کہ فقہاء نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔ اور ان حضرات کی مجموعی حالت کے خلاف ایسی کوئی یقینی وجہ پائی نہیں جاتی بلکہ نہ پایا جانا یقینی ہے۔

" پس یہ اجمالی دلیل اس کے لیے کافی ہوگی کہ ان کے مشتبہ اقوال و افعال کا ضرور کوئی صحیح محمل ہے۔ اور اس اجمالی دلیل کے بعد ان مشتبہات یا موہمات کی توجیہ یا عذر کی تفصیل کی حاجت باقی نہیں رہتی لیکن محتمل کو واقع کی صورت میں دکھلانے کے لئے مناسب سمجھا گیا کہ بعض توجیہات و عذرات کو بھی نمونہ کے طور پر کہیں کہیں ذکر کر دیا جائے۔

اگرچہ اس قسم کے اصلاحی مواد کو حضرت علیہ الرحمہ سے پہلے بھی مختلف بزرگ وقتاً فوقتاً جمع فرما کر نفع و رسانی فرماتے رہے اور خود حضرت علیہ الرحمہ کے اس سے پہلے شائع فرمودہ رسال التنبیہہ الطربی میں یہ مواد کافی موجود ہے تاہم

" اقتضاء وقت سے ایک خاص اضافہ کی صورت ذہن میں آئی۔ وہ یہ کہ عدم اتباع شریعت کی یہ تہمت حضرات چشتیہ کے سر خصوصیت کے ساتھ تھوپی

گئی ہے --------- جس کی وجہ ایک تو ان حضرات پر شورش و سوزش کے رنگ کا غلبہ ہے ' جس سے بعض اوقات ان کے اعتدال مائل بہ اختلال ہو جاتا ہے ۔ دوسرے ان حضرات کی یہ مسکنت کہ ملامت گر کو جواب نہیں دیتے یا کبھی نا تمام جواب دیتے ' پھر اس کے پیچھے نہیں پڑتے ' جس سے جاہل کو شبہہ ہو جاتا ہے کہ ان کے پاس واقع میں بھی جواب نہیں ۔ اور غایت فنا و محویت سے ان کے ذہن میں یہ نہیں آتا کہ ہمارے اس طرز سے دوسروں کو ضرر ہوگا ۔ بس ان کے مذاق کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ

رند عالم سوز رابا مصلحت بینی چہ کار
کار ملک است آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

ورنہ انصاف تو یہ ہے کہ حضرات چشتیہ کو اتباع سنت میں خاص امتیاز حاصل ہے ۔ حتیٰ کہ ان کی تعلیمات میں حصول مقصود کے لئے کوئی ایسی شرط نہیں جو سنت سے صراحتہً ثابت نہ ہو جس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ

" حضرات نقشبندیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے متبع سنت ہونے پر قریب قریب سب کو اتفاق ہے اور صحیح اتفاق ہے ۔ مگر خود ان کے طریق میں بعض ایسی چیزیں جو نصوص میں وارد نہیں شرط طریق ہیں ۔ اور شرط بھی اعظم و اہم ۔ چنانچہ تصور شیخ باوجود یکہ صریحاً کسی نص میں وارد نہیں ' اور پھر خطرناک بھی ہے اور بعض کو اس میں غلو بھی ہوگیا ہے ' اور اس خطرہ غلو کے سبب مولانا شہید رحمتہ اللہ علیہ اس کو منع فرماتے ہیں ۔ مگر باوجود اس کے اکابر نقشبندیہ اس کو شرط مقصود فرماتے ہیں ۔ چنانچہ انوار العارفین ذکر تصور شیخ میں کنز الہدایہ بحوالہ مکتوبات حضرت مجدد صاحب کا ارشاد نقل ہے کہ

" ذکر تنہا بے رابط و بے فنا فی الشیخ موصل نیست ۔ ذکر ہر چند از اسباب وصول است لیکن غالباً مشروط برابطہ محبت و فنا در شیخ است ۔ آر این رابطہ تنہا با رعایت آداب صحبت و توجہ والتفات شیخ و التزام ذکر موصل است ۔

" اور گو چشتیہ میں بھی مثل دیگر طرق کے ایسے اشغال ہیں جو صریح سنت میں وارد نہیں ۔ مگر کوئی شغل شرط طریق نہیں ۔ بلکہ مطلق شغل بھی شرط نہیں ۔ بعض کے لئے صرف ذکر ہی کافی ہو جاتا ہے ۔ پس چشتیہ کی شان بالکل حنفیہ کے مشابہ ہے کہ باوجود تمام مذاہب سے زیادہ سنت میں شدید الاتباع ہونے کے ' جیسا کہ ان کے اصول سے ظاہر ہے ۔ جیسے کہ اوپر ایک اصل دلیل گذری کہ ان کے طریق میں کوئی امر ایسا شرط مقصود نہیں جو سنت میں وارد نہ ہو ۔ اور اصول ہی اصل معیار ہیں " ۔

لیکن حضرت علیہ الرحمہ کا احتیاط و ادب کا مذاق حضرات نقشبندیہ پر بھی کسی ایسے شبہہ کا تحمل کیسے فرما سکتا تھا اس لئے آگے بڑھے بغیر پہلے اس کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ " شرط مقصود " میں مقصود سے مراد اصلی نہیں بلکہ " کچھ خاص کیفیت ہیں جو خود مقصود اصلی کے لئے شرط نہیں " ۔

اہل تأمل و انصاف کے لئے تو اصولاً یہ تمہیدی گفتگو اور اس کے اشارات ہی حضرات چشتیہ پر سے اتباع سنت میں سستی و کوتاہی کی تہمت کو دور کر دینے کے لئے کافی ہیں ' تاہم عام نفع کے لئے بعض چیزیں اصل کتاب سے پیش کر دینا ضروری ہے ۔ پوری کتاب میں تین ابواب ہیں ۔

" باب اول میں ان حضرات کے بعض وہ اقوال ہیں جن میں اتباع کی تاکید فرمائی گئی ہے ۔ باب ثانی میں بعض وہ افعال ہیں جن میں خود ان کا شدید الاتباع ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ باب ثالث میں بعض ایسے اقوال ہیں یا انعام کی توجیہ ہے اور ان کے اشکال کا رفع ہے ' جن سے عدم اتباع کا وہم ہوتا ہے " ۔

اب ان ابواب میں سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں باقی " قیاس کن زگلستان من بہار مرا " ۔ اتباع شریعت کے لئے سب سے مقدم علم شریعت ہے ۔ اس علم کی تحصیل و تقدیم کا ایک واقعہ سنئے کہ حضرت فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ حفظ قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم کے بعد ابھی ملتان میں علوم ظاہری کی تحصیل میں

مصروف تھے کہ حضرت خواجہ قطب الدین اوشی کا ادھر سے گزر ہوا تو

" آپ نے پوچھا صاحب زادہ کیا پڑھتے ہو ۔ انہوں نے عرض کیا کہ نافع ۔ فرمایا نافع خواہد شد انشاء اللہ تعالیٰ ۔ یہ فرمانا ایسا موثر ہوا کہ مرید ہوگئے اور آپ کے ساتھ دہلی جانا چاہا ۔ حضرت خواجہ نے منظور نہ فرمایا اور کہا بالفعل یہیں رہو اور تحصیل علوم ظاہری میں خوب کوشش کرو ' پھر میرے پاس آؤ کہ " زاہد بے علم مخرہ شیطان است " ۔

اسی طرح حضرات چشتیہ کے سرتاج خود حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ علیہ نے اپنے پیر خواجہ عثمان ہارونی رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات میں نقل فرمایا ہے ۔

" علم دین کے فضائل میں ارشاد ہوا کہ جو کوئی ایک کلمہ بھی حق کا سنے تو وہ ایک سال کی عبادت شبانہ روز سے بڑھ کر ہے ' اور جو شخص عالم حقانی کے درس میں بیٹھے ' تو گویا اس نے ایک بردہ آزاد کیا اور علم اندھے کی روشنی ہے ۔ جنت کی راہ بتلانے والا ہے ۔ اور علم کو خدا تعالیٰ کبھی اور کہیں ضائع نہیں کرتا نہ دنیا میں نہ آخرت میں " ۔

خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ کے حال میں ہے کہ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کا نسخہ خود آپ اپنے ہاتھ سے نقل فرمایا (۱) تھا ۔ علم کے بعد عمل میں سب سے زیادہ مقدم نماز ہے ' جس کے عمداً ترک کو حدیث میں کفر کے مرادف ٹھہرایا گیا ہے " من ترک الصلوۃ متعمدا فقد کفر " پھر نماز ہی نہیں نماز باجماعت کی بھی جیسی کچھ احادیث میں تاکید ہے معلوم ہے ۔ حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " جی چاہتا ہے کہ کسی کو حکم دوں کہ لکڑیاں جمع کرے پھر اذان کا حکم دوں اور کسی سے کہوں کہ امامت کرے اور میں لوگوں کے گھروں پر جاؤں

---

(۱) السنۃ الجلیہ فی الچشتیہ العلیہ ص ۱۷ ۔ ۱۲

جو جماعت میں نہیں آتے ان کے گھروں کو جلا دوں ۔ اس لئے جماعت کا بلا عذر عمداً ترک بھی ایک قسم کے کفر کے سوا کیا ہوسکتا ہے ۔ چنانچہ ملفوظ بالا ہی کے سلسلہ میں "کفر کی ایک قسم جماعت سے نماز نہ پڑھنے کو فرمایا" ۔

نماز اور جماعت تو بہت بڑی چیز ہے ' فرض و واجب ہے ۔ مستحبات تک میں ان حضرات کے اہتمام و اتباع کا یہ عالم رہا کہ حضرت خواجہ اجل (معین الدین چشتی) اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات میں حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ

" ایک وقت ہم اور خواجہ اجل بیٹھے نماز مغرب کا وقت تھا ۔ خواجہ تازہ وضو کرتے تھے انگلیوں میں خلال کرنا سہواً رہ گیا ہاتف غیبی نے کان میں کہا کہ اے اجل ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہو ' ان کی امت سے کہلاتے ہو اور ان کی سنت کو تم نے ترک کیا ۔ اس کے بعد خواجہ اجل نے قسم کھائی کہ جس دن سے یہ نداسنی موت کے وقت تک کوئی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے ترک نہ ہوگی " ۔

یہ غیبی تنبیہہ یا یاد دہانی دراصل غائت اہتمام ہی کی برکت تھی ' کہ ایسے حضرات خود مراد و محبوب بن جاتے ہیں حتیٰ کہ سہواً بھی ان کی کسی طاعت سے محرومی گوارا نہیں فرمائی جاتی اور کیسے گوارا فرمائی جب کہ سہو پر بھی ان کی ندامت کا یہی حال ہوتا ہے ' کہ اسی ملفوظ میں ہے کہ

" ایک وقت خواجہ اجل کو بہت متردد دیکھا اور پوچھا کہ کیا حال ہے فرمایا کہ جس روز سے انگلیوں کا خلال مجھ سے فوت ہوا ہے مجھ کو حیرت ہے کہ کل کے روز قیامت میں یہ منہ خواجہ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر دکھلاؤں گا "

۔ (السنتہ الجلیہ ص ۸)

اور اتباع شریعت و سنت کا یہ اہتمام صرف عبادات یا نماز روزہ وغیرہ کے واجبات و مستحبات ہی تک نہ تھا بلکہ معاملات اور کھانے پینے کے جائز و ناجائز

حلال و حرام کے معاملہ میں تو ان حضرات کے ہاں یہ مسلمات سے ہے کہ حضوری جو اس راہ کا بڑا مقصود ہے ' وہ لقمہ حلال کے بغیر میسر نہیں آسکتی ۔ حضرت شکر گنج کا ارشاد ہے کہ

" اس راہ میں اصل دل کی خصوری ہے ' اور دل کی حضوری اس وقت میسر ہوگی جب کہ حرام لقمے سے بچے گا اور اہل دنیا کی صحبت سے پرہیز کرے گا (کیونکہ اہل دنیا اصل میں وہی ہے جو حرام چیزوں سے پرہیز نہیں کرتے)

حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ

" کوئی شخص کسی کو سید سمجھ کر نذر دیتا ہے ۔ پھر اگر وہ سید نہیں ہے ' تو اس کو لینا حرام ہے ۔ اس طرح جو درویش طاعت و عبادت میں مصروف ہے ' بیت المال میں اس کا کچھ حق نہیں ' جو درویش تعلیم و تعلم یا درس و تدریس کا سلسلہ نہیں رکھتے ' جن میں مسلمانوں کا نفع ہے ان کو بیت المال سے کیا تعلق " ۔(ص ۳۷)

شریعت کا حرام تو خیر حرام ہے ہی ۔ حدیہ ہے کہ

" خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ یہ حکم تو شریعت کا ہے کہ شراب حرام ہے ' اور طریقت میں تو جو پانی پینا کہ طاعت و عبادت میں کاہلی و سستی پیدا کرے وہ مثل شراب کے حرام اور وہاں اس کی بھی باز پرس ہوگی (جب ہم پیدا ہی عبادت کے لئے کئے گئے ہیں جو چیز بھی اس میں مخل ہوگی اس کی باز پرس کیوں نہ ہو گی ۔

اس کی نقل کے بعد خود ہمارے حضرت علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ

" دیکھئے جو شخص شریعت کے مباحات کو بھی اثر مذموم کی وجہ سے غیر مباح سمجھتا ہو وہ علم بالشریعت کو کس درجہ لازم سمجھے گا ۔ بلکہ ان تدقیقات کی بنا پر اگر ان حضرات پر تشدد فی الاعمال کا شبہہ کیا جائے تو ظاہراً گنجائش ہے ۔ باقی تساہل فی الاعمال کے شبہہ کی گنجائش ہی نہیں ۔ (ص ۸)

کھانے پینے تک کے آداب میں سنت کی یہ رعایت کہ

" کھانا لایا گیا تو فرمایا دستر خوان پر لاؤ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوان (چوکی) پر نہیں کھایا ۔ لیکن منع بھی نہیں فرمایا ' لہٰذا اگر کوئی کھالے تو روا ہے ۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ و اہلبیت رضوان اللہ علیہم سب دستر خوان پر کھاتے تھے " ۔

" دیکھئے باوجودیکہ چوکی پر کھانا رکھ کر کھانے کو جائز سمجھتے تھے ۔ (یہ تو آپ کی رائے تھی) مگر سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کو پسند نہ کیا ۔ کس درجہ اتباع سنت ہے " ۔ (ص ۵۹)

ایک شبہہ یہ بھی ہے کہ ان حضرات کے ہاں عرفی اذکار کو تلاوت کلام اللہ سے بھی زیادہ مہتم بالشان خیال کیا جاتا ہے ۔ بلکہ بقول حضرت علیہ الرحمہ کے کہ نام نہاد صوفی تارکان شریعت تو ذکر متعارف کو علاً و عملاً قرآن پر ترجیح دیتے ہیں ۔ لیکن اکابر چشتیہ اکثر حافظ تھے ۔ اور حضرت بابا صاحب جو خود بھی حافظ تھے ارشاد فرماتے ہیں کہ

" کوئی ذکر کلام اللہ سے بڑھ کر نہیں ۔ اس کی تلاوت کیا کریں ۔ کیونکہ اس کا نتیجہ کل طاعتوں سے بڑھ کر ہے " ۔

پھر قرآن مجید کی یہ تلاوت کس طرح کرنا چاہئے اس کا حال حضرت سلطان الاولیاء رحمہ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے ذرا سنیں کہ

" سکون و اطمینان کے ساتھ ایک ایک حرف پڑھنے میں تلاوت کا ثواب ہے اور بغیر حضور قلب کے پڑھنا ٹھیک نہیں ۔ تمام خیالات و خطرات کو دل سے دور رکھے ۔ معنی جانتا ہو تو دل میں دھیان کرے ------- قرآن پڑھتے وقت دل خدا کے ساتھ مشغول ہو ' اور سمجھے کہ خدا کے ساتھ ہمکلام ہوں ۔ میں اس لائق کہاں تھا کہ یہ دولت میسر ہوتی ۔ اور جس کو یہ حالت میسر نہ ہو وہ تصور کرے کہ خدا کے سامنے پڑھ رہا ہوں کہ ضرور مجھے اس کا ثواب ملے گا ۔

" قرآن شریف ترتیل و تردید کے ساتھ پڑھنا چاہئے ۔ ترتیل یہ ہے کہ تمام حروف و مد وغیرہ ٹھیک ادا ہوں ' اور تردید ہے کہ جس آیت میں ذوق و حلاوت حاصل ہو اس کو مکرر پڑھے " ۔

اس کے بعد ہمارے حضرت فرماتے ہیں کہ "کیا آج کل کے مدعی قرآن مجید کا اتنا احترام و اہتمام کرتے ہیں ' بجز خاص اور اوراد و اذکار کے قرآن مجید کو آنکھ سے بھی نہیں لگاتے ۔ (۱) راقم سطور عرض کرتا ہے اور بیسیوں ذاتی تجربات کے بعد عرض کرتا ہے کہ ان نقلی مدعیوں کا ذکر ہی کیا ' خود علماء ظاہر کا جو صوفیا اور بزرگوں پر زبان طعن کھولتے ہیں یہ حال ہے کہ معمولی صحت مخارج تک کا تعلیم و تعلم قرآن میں خود اپنے اور اپنے بچوں تک کے اہتمام نہیں فرماتے ۔ دین کے نام سے کتنے ایسے بڑے بڑے مدارس کھول رکھے ہیں جن میں تجوید یا تصحیح مخارج کے ساتھ تعلیم قرآن کا انتظام ندارد ہے !۔

تصوف کے متعلق بہت سے مدعیان علم اور جہلا اور خود جاہل صوفیہ اور ان کے جاہل تر معتقدین میں بعض باتیں بالکل ہی خلاف شریعت بلکہ ملحدانہ مشہور ہو گئی ہیں ۔ مثلاً سب سے بڑھ کر یہ کہ صوفیانہ کمال توحید و خدارسی یا باطنی کمالات کے لئے ایمان و اسلام بھی شرط نہیں ۔ اس کی نسبت حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمہ اللہ علیہ کے ایک مکتوب کا اقتباس ملاحظہ ہو فرماتے ہیں ۔

" عام مسلمانوں کی ایمانی توحید اور خدا پر ایمان بالغیب اور صرف آخرت کے ثواب و عقاب پرنظر اس کو توحید مقید کہتے ہیں اور توحید مطلق کا اس کو زینہ جانتے ہیں ۔ اس توحید مقید کے بغیر تو مطلق ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی ' نہ اس تک رسائی ہو سکتی ہے ۔ اس لئے کہ بدوں ایمان کے کوئی توحید توحید ہی نہیں

---

(۱) السنتہ الجلیہ ص ۳۵ ۔ ۱۲

اس لئے کہا ہے کہ اس راہ (توحید مطلق یا تصوف) میں کون چلتا ہے ایمان ہی چلتا ہے ' اس خونخوار جنگل کو کون قطع کرتا ہے ۔ اس دولت تک کون پہنچتا ہے ایمان ہی پہنچتا ہے ۔

ہرکہ در راہ محمدؐ رہ نیافت
تا ابد گردے ازین درگہ نیافت

ایسے غلط کار لوگ " احکام شریعت سے ہٹ گئے حلال و حرام کو چھوڑ دیا اور گمراہی میں پڑ گئے ۔ کل کے دن یہ لوگ کفار کے ساتھ جہنم میں ہوں گے ۔ لیکن اگر توحید دین کی درستی ' احکام شرع کی پابندی اور دینی عقیدوں کے ساتھ ہوتی ' تو وہ کشف یا مقال زبان یا حال جس درجہ کی بھی ہوتی کچھ ضرر نہ کرتی ' بلکہ مطلوب راہ و مقصود درگاہ ہوتی " ۔

اسی طرح ایک جاہلانہ غلطی یہ ہے کہ لوگ حضوری و مشاہدہ اور خدا رسی کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا ہی میں خدا تعالیٰ کا دیدار میسر آجاتا ہے ۔

" سلطان فیروز شاہ حضرت شیخ جلال الدین کی زیارت کے لئے پانی پت حاضر ہوا ۔ اور حضرت سے عرض کیا کہ بندہ ایک بات دریافت کرنے کی اجازت چاہتا ہے ۔ حضرت نے فرمایا پوچھو عرض کیا کہ کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے ؟ فرمایا کہ خدا کو سر کی ان آنکھوں سے دیکھنا شریعت کی رو سے ممکن نہیں ۔ البتہ اس کے سایہ کو میں نے دیکھا ہے " ۔

" دیکھئے ذات و صفات کے متعلق یہ کیسا صحیح عقیدہ اہل سنت و جماعت کے موافق ہے " ۔

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں کسی نے یہ حدیث نقل کی " رایت ربی علی صورۃ امرد جعد قطط "یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو گھونگر بالوں والے امرد کی صورت میں دیکھا " ۔

حضرت خواجہ نے فرمایا کہ اول تو یہ حدیث مشہور کتابوں میں نہیں ' اور اگر حدیث ہے تو اس کو متشابہات پر محمول کیا جائے گا - اور متشابہات پر ایمان لانا چاہئے بحث و تاویل نہ کرے -

" دیکھئے نقل حدیث میں کیسی احتیاط ہے اور عقائد کے باب میں کیسی سنت کے موافق تحقیق ہے " -

باقی اس رویت حق کے باب میں ذرا ایک مفصل و محققانہ مکتوب حضرت شیخ عبد القدوس رحمتہ اللہ علیہ کا قابل دید ہے - فرماتے ہیں کہ

" بھائی دیدار آخرت میں ہوگا ' دنیا میں نہ ہوگا اس لئے کہ پاک اور باقی کے دیدار کا وقوع عالم فانی میں ہونا حکمت و وعدہ کے خلاف ہے گو کہ عقلاً ممکن ہے اور جو چیز ممکن ہو اس کا امکان کسی خاص زمان و مکاں کے ساتھ مختص نہیں ہوتا - خصوصًا حق تعالٰی جو جہت اور مکاں و زماں سب سے پاک ہے ' اس کا دیدار کسی زماں و مکاں کے ساتھ مقید نہ ہوگا " -

" اور اہل حق و اہل سنت کا اجماع بھی اس پر ہے کہ خدا تعالٰی کا دیدار دنیا میں نہ ہوگا نہ سر کی آنکھ سے نہ دل کی آنکھ سے ' اس طرح کہ موجودات کا پردہ دل سے اٹھا دیا جائے - باقی یہ جو بزرگوں نے فرمایا ہے کہ

هر کرا آفتاب این جاتافت
هرچه آنجا بود این جایافت
دیگران را وعده گر فردا بود
لیک مارا نقد هم این جابود

اور جو اس قسم کے اقوال ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ رویت کا وعدہ آخرت کے متعلق ہے ' یہاں یقین کی آنکھ سے اس کا مشاہدہ ہو گیا - اور جو کچھ رویت کے وقت حاصل ہوگا اس مشاہدہ میں اس سے زیادہ حاصل ہوا -

" چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر حجاب اٹھا دیا جائے تو

میرے یقین میں کچھ اضافہ نہ ہوگا - یعنی میرا یقین مشاہدہ خدا کا اس درجہ پر پہنچا ہوا ہے کہ (سر کی آنکھ سے) دیکھنے میں وہی بات ہوگی جو مشاہدہ یقین سے حاصل ہے - اور اس کو (اصطلاح میں) دیدار السّر کہتے ہیں (سالکین) اس مقام کے عروج میں ' انکشاف حق اور مشاہدہ رب کے بہت ہی بلند درجہ پر پہنچ جاتے ہیں - اور زمان و مکان کو اس وقت لپیٹ دیتے ہیں -

" اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہر میں زمان و مکان کو لپیٹ دیتے ہیں اور دنیا کو (بالائے طاق) رکھ دیتے ہیں ' اور در حقیقت عالم آخرت میں چلے جاتے ہیں کیونکہ یہ اعتقاد تو باطل ہے - (بلکہ مطلب یہ ہے کہ نظر قلب سے عالم محجوب ہو جاتا ہے ' اور اس کی جگہ مجوب حقیقی سما جاتا ہے) مردان حق کے اس مقام میں مختلف مراتب ہوتے ہیں - کافر کو یہ مرتبہ ہرگز حاصل نہیں ہوتا- مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا" -

بعض اہل حال کے ہفوات کا بھی کچھ حال سن لیں - حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے -

" ایک شخص نے سوال کیا کہ خواجہ بایزید قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا ہے کہ لوائی اعظم من لواء محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات کیونکر ہے - خواجہ نے فرمایا کہ مشائخ کے بعض کلمات حال و کیفیت کے ہوتے ہیں جن کو ہفوات کہتے ہیں -

جیسے یہ قول کہ لیس فی حببی سوی اللہ تعالیٰ اور یہ کہ سبحانی ما اعظم شانی - سو ان سب کو ہفوات عشاق کہتے ہیں یہ باتیں ان سے غلبہ احوال میں سرزد ہوتی ہے ' جو ہمارے فہم سے خارج ہیں " -

" کیساسنت کے موافق عقیدہ ہے ' جس سے ثابت ہوتا ہے ' کہ ان حضرات چشتیہ میں افراط و تفریط نہ تھا " -

اسی طرح کی باتوں کے متعلق حضرت عبد القدوس رحمتہ اللہ علیہ ایک مکتوب

میں فرماتے ہیں کہ غلبہ حال میں

" مشائخ سے جو اقوال و ارشادات ظاہر ہوئے ہیں ان کا تعلق انہیں کے مرتبہ سے ہے - اور بعض اہل ظاہر ان اقوال کو شطحیات کہتے ہیں ' اس لئے کہ ظاہر شریعت کے خلاف ہیں - چنانچہ یہ قول کہ لیس فی الدارین غیر اللہ اور انا الحق اور سبحانی ان کا نہ انکار ورد جائز ہے کیونکہ یہ اہل حق و اہل سنت و جماعت کے اقوال ہیں اور نہ ان کا قبول کرنا لازم ہے ' اس لئے وہ معصوم نہیں ' ممکن ہے ان کو لغزش ہو گئی ہو - انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں ان کے اقوال (خلاف ظاہر) کو شطحیات نہیں کہتے ' بلکہ مجمل و متشابہ کہتے ہیں " - (ص ۵۴

ایک بد نامی یہ ہے کہ حدیث کی نقل و قبول میں حضرات صوفیہ احتیاط نہیں کرتے لیکن اکابر چشتیہ کی احتیاط اس باب میں دیکھئے کہ حضرت علاء سنجری نے فوائد الفواد کے نام سے حضرت سلطان نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے جو ملفوظات جمع کئے ہیں اس میں لکھتے ہیں کہ " بندہ نے عرض کیا کہ ایک شخص پانی پیئے اور دوسرے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں تو یہ سنت ہے ' اس پر حضرت سلطان جی نے

" تھوڑا تامل کیا ' حاضرین میں سے ایک نے چند لفظ پڑھے اور کہا یہ حدیث ہے - حضرت نے فرمایا کہ حدیث کی مشہور کتابوں میں تو ہے نہیں - اور انکار کر نہیں سکتے کہ شاید ہو - جو حدیث لوگ سنیں تو یہ نہ کہیں کہ حدیث نہیں ہے - ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ معتبر حدیث کی کتابوں میں نہیں پائی جاتی " -

" کس قدر حدود کی حفاظت ہے کہ نہ ایسی حدیث کے حدیث ہونے کا جزم کیا جائے اور نہ اس کی نفی کا جزم کیا جائے - کہ دونوں باتیں تخمینی ہیں " -

ایک اور موقع پر ہے کہ

" بندہ نے عرض کیا کہ حضرت خواجہ اویس قرنی رضی اللہ نے ایک نماز فرمائی ہے کہ وہ تین اور چار اور پانچ کو پڑھی جاتی ہے - میرے جی میں یہ خطرہ

گزر رہا ہے کہ جو دعائیں وغیرہ اور بزرگی اس نماز کی فرمائی ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی گئی ہیں یا صحابہ کبار سے یا خواجہ اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، غرض کہ یہ متعینہ سورتیں اور دعائیں کہاں سے ہیں۔ اور ان کا ثبوت کیا ہے"۔

خود یہ سوال بتلاتا ہے کہ ان حضرات میں حدیث کے بارے میں کتنی احتیاط تھی بہرحال حضرت سلطان جی نے جو جواب عطا فرمایا وہ یہ تھا کہ یہ "معنی الہام سے بھی ہیں۔ اب اس پر ہمارے حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کا تحقیقی افادہ ذرا غور سے سن لیں۔

"کسی امر کو حضور کی طرف منسوب کرنے میں کس قدر احتیاط فرمائی اور کس قدر اعتدال سے کام لیا کہ نہ منقولات کا انکار کیا اور نہ حد سے بڑھایا، بلکہ حقیقت بیان کر دی جس سے افراط و تفریط کی اصلاح ہوگئی۔ اور جو حدیث نہ ثابت ہو نہ دلائل صحیحہ کے معارض ہو اور کسی بزرگ سے منقول ہو اس میں بھی الہامی اور کشفی ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے۔

"جیسا کہ علمائے ظاہر احادیث منامیہ (خواب کی احادیث) کو نقل کرتے ہیں اور اس کو بھی حدیث کہتے ہیں جیسے صاحب مشارق الانوار نے خواب میں بارہ ذیقعدہ ۱۱۶ھ فجر کے قریب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث اذا وضع العشاء واقیمت الصلوۃ کے متعلق تحقیق کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حدیث صحیح ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں۔ اور اس کو ایک درجہ کی حدیث قرار دیا گیا۔

"البتہ وہ منامی ہونے کی تصریح فرما دیتے ہیں، اور صوفیہ اس کی تصریح کا التزام نہیں کرتے ممکن ہے اصل راوی اس کا التزام کرتے ہوں، پھر اہتمام نہ

رہتا ہو" ۔(۱)

باقی حدیث و سنت پر نفس عمل کی انتہاء تو اکابر چشتیہ کی یہاں تک ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ کے تذکرے میں ہے کہ

" ابتدائے عمر سے آخر عمر تک استقامت میں فرق نہ آیا ۔ ایک روز مرض میں خادم سے دوائیں طلب کی ' خادم نے معجون کا ڈبہ حاضر کیا ' آپ نے اس میں تھوڑی سے نکالی اور چاہا کہ نوش فرمائیں (اچانک) اس کو پھر ڈبہ میں ڈال دیا اور چارپائی سے نیچے تشریف لے آئے تب استعمال کیا ' اس لئے کہ چارپائی پر کھانا شرعًا ممنوع ہے " ۔

" یہ جداگانہ امر قابل تحقیق ہے کہ چار پائی پر کھانا کیسا ہے ' دیکھنا یہ ہے کہ حضرت موصوف کی تحقیق یہی تھی اور اس کی کس قدر رعایت فرمائی کہ دوا کھانے کو عرف میں کھانا نہیں کہا جاتا ہے ' مگر وہ بھی چارپائی پر نہیں کھائی "

ہمارے حضرت کو ان حضرات کی حمایت کا جیسا کچھ التزام تھا اس کی کرامت و برکت کہئے کہ بعد کو اس کی اصل بھی احیاء العلوم آداب الاکل میں یہ مل گئی کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت مبارک تھی کہ جب کھانا آپ کے سامنے لایا جاتا تو آپ اس کو دستر خوان بچھا کر ' زمین پر رکھتے " ۔

اور اتباع سنت و شریعت کا یہ اہتمام اپنی ذات ہی تک نہ تھا ۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ

" شریعت کی متابعت میں اس قدر مضبوط و راسخ تھے کہ ظاہری و باطنی احکام میں ذرہ برابر تجاوز کرنے کو جائز نہ سمجھتے تھے نہ اپنے لئے نہ دوسروں کے لئے اگر کسی سے کوئی امر خلاف شریعت معلوم ہوتا تو اس سے بیزاری و تبری

---

(۱) السنۃ الجلیہ ص ۶۵ ۔ ۱۲

فرماتے اور اپنے پاس تک نہ آنے دیتے " ۔(۲)

دوسروں کا کیا ذکر شریعت کے مقابلہ میں حضرت شیخ عبدالحق ردولوی رحمتہ اللہ علیہ نے خود اپنے شیخ و مرشد حضرت شیخ جلال الدین پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ

" شیخ جلال الدین رحمتہ اللہ علیہ کے کسی مرید نے دعوت کی جس میں شیخ احمد کو بھی مدعو کیا ۔ اس مجلس میں بعض امور خلاف شرع تھے ' تو انہوں نے فوراً بیعت فسخ کر دی اور اسی وقت طاقیہ (خاص ٹوپی) جو شیخ جلال الدین سے ملی تھی واپس کر دی اور جنگل کی طرف چل دیئے " ۔

پھر غیب سے ایک تنبیہہ ہوئی اور اپنی غلطی معلوم کرکے تائب ہوئے اور تجدید بیعت کی یہ الگ بات ہے ۔ لیکن بقول ہمارے حضرت علیہ الرحمتہ کے

" اپنے نزدیک جس امر کو خلاف شرع دیکھا اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بیعت فسخ کر دی اورنشانی واپس کر دی ' مگر واقع میں وہ امور خلاف شرع نہ تھے یا شیخ کو کچھ عذر ہوگا ' اس لئے غیب سے پھر اس طرف ان کو متوجہ کیا گیا ۔ مگر اس سے ان کا مذاق تو معلوم ہوگیا ' اور حضرت شیخ جلال الدین کا بھی یہی مذاق تھا ورنہ غایت ناراضی سے ان کی دوبارہ درخواست کو قبول نہ فرماتے "۔

اور تو اور سفارش تک میں حدود شریعت کی رعایت کا ایک واقعہ سنئے کہ حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے درخواست کی کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے پاس ایک سفارش نامہ تحریر فرما دیں ۔ کیسی عجیب جامع معرفت و شریعت سفارش فرمائی کہ

---

(۱) السنتہ الجلیلہ ص ۸۱ ۔ ۱۴

(۲) ایضا ص ۸۲ ۔ ۱۴

" رفعت قضیہ الی اللہ ثم الیک فان اعطیتہ شیئا فالمعطی ھو اللہ وانت المشکور وان لم تعطہ شیئا فالمانع ھو اللہ وانت المعذور یعنی اس شخص کے معاملہ کو پہلے خدا تعالٰی کے روبرو پیش کرتا ہوں پھر تمہارے سامنے۔ پس اگر تم نے اس کو کچھ دیا تو دینے والا (حقیقت میں) خدا ہے۔ اور (چونکہ بظاہر تم بھی ہو اس لئے تم) قابل شکریہ کے ہو اور اگر تم نے اس کو کچھ نہ دیا، تو نہ دینے والا خدا ہے اور تم معذور ہو "۔

اس دور میں معاملات و شریعت کے ان حدود و دقائق کی فہم و رعایت بس مجدد وقت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے ہاں دیکھی، ورنہ یہ باتیں تو ایسی متروک ہیں کہ گویا شریعت سے ایسی باتوں کے لوگوں کے نزدیک کوئی سروکار ہی نہیں۔

جن حضرات (چشتیہ) کے ہاں بظاہر معمولی معمولی معاملات و معاشرات میں قدم قدم پر شریعت کا یہ اہتمام و اتباع ہو، ان کے ہاں دیگر عبادات اور نوافل و مستحبات کا اہتمام کیا کچھ نہ ہوگا۔ حضرت شیخ عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ ہی کے حالات میں ہے کہ

" بڑھاپے اور آخر عمر میں سو رکعت نماز شب برات کی، نماز تراویح رمضان المبارک کی اور تمام وظیفے رات دن کی پابندی سے پورے کرتے تھے، کبھی ناغہ نہ فرماتے عزیمت پر عمل کرتے، رخصت کی قدر و قیمت ان کے نزدیک نہ تھی۔ بالخصوص جس دن بارش کی کثرت ہوتی جاڑا شدت سے ہوتا یا ہوا تیز چلتی تو اپنے نفس پر سختی فرماتے، اور وضو نماز اور دوسرے عبادات کا عمل زیادہ کر دیتے۔

" غرض دین میں حضرت کی استقامت سے عقل حیران تھی۔ حضرت کا معاملہ معمولی بشری طاقت سے خارج تھا، جیسا کہ کسی نے ایسے ہی حضرات کی نسبت کہا ہے کہ

می ندانم کاین چہ مردان بودہ اند
کز عمل یکدم نمی آسودہ اند

ایسے حضرات کے اقوال و افعال میں اگر اتفاق سے کوئی بات بظاہر خلاف شریعت و سنت معلوم و مشاہد بھی ہو تو اس کی وجہ تحقیق و اجتہاد میں خطایا کسی شدید غلبہ حال وغیرہ کے عذر کے سوا اور ہو ہی کیا سکتی ہے' ایسے عذروں کی تفصیل بھی چنداں ضروری نہ تھی تاہم حضرت علیہ الرحمتہ نے اتمام حجت کے لئے ایک مستقل باب میں کچھ ایسے اقوال و افعال کی توجیہات بھی فرما دی ہیں ۔

" جو دو قسم کی ہیں ایک کلی اور وہ بعض واقعات میں تو یہ ہے کہ ان حضرات پر اکثر باطنی حالات کا غلبہ رہتا تھا جس سے لازماً بعض نظری' بلکہ بدیہی' بلکہ حسی امور تک کی طرف التفات نہیں ہوتا ۔ اور بعض واقعات کی وجہ یہ ہے کہ بعض احکام دقیق ہوتے ہیں' جن کا استحضار مزاولت علوم کے بدون وقت پر نہیں ہوتا ۔ اور یہ حضرات مزاولت کے لئے فارغ نہ تھے ۔ اور بعض واقعات کی توجیہہ یہ ہے کہ کسی غیر ثابت روایت کو ثابت سمجھ کر یا اپنے بزرگوں کو مجتہد سمجھ کر عمل کر لیتے تھے اور بعض واقعات کی صورت یہ ہے کہ جو اقوال یا افعال محل اعتراض ہیں وہ ان بزرگوں سے ثابت ہی نہیں' اور بعض میں معترض واقعہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھا ۔ اور بعض ایسے ہیں جن کا صدور بلاشعور یا بلاعذر ہوگیا ۔ اس کو غلبہ حال سے تعبیر کیا جاتا ہے " ۔

ایک بڑی غلط فہمی خود اس غلبہ حال کے معاملہ میں ناواقف اعتراض کرنے والوں کو یہ ہو جاتی ہے' کہ ان کے نزدیک غلبہ حال کے معنی ہمہ وقت مد ہوش رہنے یا بالکل مجذوب ہو جانے کے ہیں ۔ حالانکہ نہ اس کا اتنا شدید ہونا ضروری ہے نہ اتنا مدیدیا طویل کہ لوگوں کو محسوس بھی ہو' جس کے نظیر میں خود حضرت علیہ الرحمہ نے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا ہے کہ

" جمعہ کا دن تھا ۔ قیلولہ کا وقت نہیں ملا ۔ شب کو بھی کچھ بد خوابی رہی تھی ' اس لئے آنکھوں میں نیند بھری تھی مجمع بھی کثیر تھا ۔ اور وہی وقت ڈاک لکھنے کا بھی تھا ۔ میں باتیں بھی کر رہا تھا اور خطوط بھی لکھ رہا تھا 'بات کرنے میں تو نیند کا غلبہ نہ ہوتا تھا ' لیکن خطوط لکھنے میں بعض اوقات اتنا اثر ہو جاتا تھا کہ کچھ کا کچھ لکھ جاتا تھا ' مگر قلم برابر چل رہا تھا اور بیچ بیچ باتیں بھی کرتا جاتا تھا ' جن میں کوئی لغزش نہ ہوتی تھی جس سے اس غلبہ نوم کا کسی کو ادراک نہ ہوتا تھا ۔ پھر لکھ کر خود ہی افاقہ ہوتا تھا ' اور لکھے ہوئے کو دوبارہ دیکھ کر تصحیح کرتا تھا ۔ بڑی دیر تک یہ حالت رہی ۔

" جب کہ نیند کے خفیف اثر سے یہ حالت ہو جاتی ہے کہ شعور و اختیار مختل ہو جاتا ہے اور بوجہ عدم اشتداد و عدم امتداد دوسروں کو اس کا احساس نہیں ہوتا ' تو حالات باطن تو اس سے بھی اشد اور زیادہ غامض ہیں ' وہاں ایسا ہو جانا کیا بعید ہے ۔ مگر صحو (افاقہ و اطلاع کے بعد وہ حضرات اس کا تدارک فرما دیتے ہیں " ۔

حضرت نے نیند کا واقعہ بیان فرمایا ' ورنہ بیداری میں بھی کسی وقت جب کہ کسی فکر و خیال میں آدمی زیادہ ڈوبا ہوتا ہے ' تو دوسری طرف التفات نہ ہونا معمولی بات ہے ۔ بلکہ جو لوگ کسی خاص مشغلہ زندگی میں زیادہ انہماک و یکسوئی کے ساتھ لگے ہوتے ہیں ' وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں تو اکثر بالکل سادہ لوحی کی باتیں کرتے ہیں ۔ راقم ہذا کو تو بعض ایسے ہی واجب الاحترام اہل علم و اہل اصلاح تک کا تجربہ ہے 'کہ ان سے دینی خدمات ہی کے کسی خاص شعبہ میں غایت اشتغال و انہماک کی بدولت ' بعض دوسرے دینی احکام میں تسامح ہو جاتا ہے بلاشبہ مستقلاً ایسی حالت و کیفیت اسوہ نبوت و سنت کے اعتبار سے ضرور ناقص حالت ہے ۔ ورنہ کبھی کبھی عارضی و وقتی طور پر کاملین کیا حضرات انبیاء و ملائکہ علیہم السلام کو بھی یہ حال پیش آجاتا ہے ۔

" بدر کے روز خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا اللھم ان تھلک ھذہ العصابہ لم تعبد بعد الیوم (کہ اے اللہ اگر آپ نے اس جماعت کو ہلاک فرما دیا تو اس دن کے بعد آپ کی عبادت نہ ہوگی) اور فرعون کے غرق کے وقت جبریل علیہ السلام کا اس کے منہ میں کیچڑ ٹھونسنا اگر غلبہ حال نہیں تو اور کیا۔ بس اتنا فرق ہے کہ معصوم سے اس حالت میں ظاہراً بھی خلاف شرع کا صدور نہیں ہوسکتا اور غیر معصوم سے ہوسکتا ہے ' مگر وہ اس حالت میں معذور ہوتا ہے "۔

جو اقوال و افعال کبھی کبھی بظاہر شریعت و سنت کے خلاف مسلم حضرات اہل اللہ سے ظاہر و صادر ہوگئے ہیں ' چونکہ اس کا سبب زیادہ تر یہی غلبہ حال کی معذوری رہی ہے ' اس لئے اس کی ذرا یہ تحقیق و تفصیل ضروری تھی ' باقی دوسرے قسم کے ایسے وقعات جو بظاہر شریعت کے خلاف اور بدعت معلوم ہوتے ہیں ' ان کی نجوف طوالت صرف دو مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

" صاحب اخبار الاخیار لکھتے ہیں کہ اوائل مجاہدہ میں حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ فرید رحمتہ اللہ علیہ کو طے کے روزہ کے لئے ارشاد فرمایا کہ تین دن کے بعد افطار کرنا انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس پر اشکال یہ ہوتا ہے کہ صوم وصال کو فقہا نے مکروہ لکھا ہے۔

" حل اشکال یہ ہے کہ خود فقہاء میں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ چنانچہ نووی نے نقل کیا ہے کہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ علماء نے صوم وصال کی حدیث میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا اس کی ممانعت شفقت و تخفیف کی بنا پر ہے لہذا جو شخص قدرت رکھتا ہے ' اس کے لئے حرج نہیں ' اور سلف کی ایک جماعت نے کئی کئی دن کا صوم وصال رکھا ہے۔ اور جمہور نے عموم نہی کی وجہ سے (ممانعت پر) استدلال کیا ہے۔ پھر کراہت کے قول میں بھی در مختار میں تنزیہی ہونے کی تصریح ہے اس لئے ایسے مختلف فیہ کو خلاف شرع نہیں کہہ سکتے

دوسری مثال بظاہر اس سے بھی سخت ہے کہ " شیخ نے کنویں میں الٹے لٹک کر چلہ کشی کی - ایسی مشقت بدعت ہے - اور حدیثوں میں اس سے کم مشقت پر نکیر آئی ہے - اس کا جواب یہ ہے کہ

" بدعت اس وقت ہے جب اس مشقت کو قربت مقصودہ سمجھے یا بلا ضرورت ہو ' جیسے صحابہ کو بعض مشقتوں کی ضرورت نہ تھی یا عدم تحمل کی وجہ سے صحت کو کوئی ضرر ہو - حدیثوں میں جو ممانعت ہے اس کا یہی مطلب ہے - باقی معالجہ کے طور پر کرے اور تحمل بھی کرسکے تو کوئی وجہ ممانعت کی نہیں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک طول قیام سے ورم کر جاتے تھے ' پھٹ جاتے تھے ' پوچھنے پر آپ نے اس کو اپنے خصائص میں نہیں فرمایا ' بلکہ افلا اکون عبد شکورا سے جواب دے کر عموم شکر میں اس کو داخل فرمایا ' جس سے اذن کلی ثابت ہوگیا " -

" یہ تو نفس مشقت کا جواب ہے - باقی الٹا لٹکنا سو فی نفسہ یہ ایک فعل مباح ہے - جو کسی مباح مصلحت سے مباح ہے ' جیسے کسی غریق کو الٹا لٹکا دینا ' جس سے پیٹ کا پانی نکل جائے بالاجماع مباح ہے - حضرت ابولبابہ انصاری کا ایک غلطی پر اپنے کو ستون سے باندھ دینا اور چھ روز تک بندھا رہنا صرف نماز کے وقت ان کی بی بی کا کھول دینا ' پھر نزول توبہ کے بعد مستقلاً حضورؐ کا ان کو کھولنا ' اس اباحت کا موید ہے " -

اور شیخ کا الٹا لٹکنا بھی ممتد نہ تھا عشاء کے بعد سے تہجد کے قبل تک تھا (۱)-

اسی طرح حضرت خواجہ فرید الدین رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات راحتہ القلوب (جمع فرمودہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ) میں ہے کہ عشاء کے بعد

---

(۱) ص ۱۵۰ - ۱۲

وہ صلوٰۃ معکوس پڑھا کرتے تھے ۔ اپنے دونوں پاؤں باندھ کر لٹکا دیتے تھے ' یہاں تک کہ صبح ہو جاتی تھی " ۔

" اس کو صلوۃ مجازاً و تشبیہاً کہہ دیا ہے ' جیسے نماز میں توجہ الی اللہ ہوتی ہے ' اس میں بھی ہوتی ہے ۔ کیونکہ مقصود اس کا نفس کو خوگر کرنا ہے تحمل تعب کا تاکہ توجہ الی اللہ کی تعب سے گریز نہ کرے (البتہ) ایسی مشقتوں کو قربت مقصود سمجھنا بے شک بدعت ہے ' لیکن اگر صرف تدبیر سمجھا جائے اور تجربہ سے مفید ہو تو کیا حرج ہے ۔ جیسے بعض بدنی مصالح کے لئے بعض ریاضات تجویز کی ہیں ' اہل طریق نے بعض نفسانی مصالح کے لئے ایسی ریاضات تجویز کی ہیں ۔ لیکن جس کو تحمل نہ ہو اس کے لئے جائز نہیں (۱)

عجیب بات ہے حضرت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ

" اس کے بعد فوائد الفواد (ملفوظات حضرت سلطان جی رحمتہ اللہ علیہ) میں ایک ملفوظ میں یہ روایت نظر سے گزری کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز معکوس بھی پڑھی ہے ۔ اس سے ایک اور جواب نکل آیا کہ انہوں نے اتباع سنت کے قصد سے ایسا کیا ہو ۔ یہ دوسرا سوال رہا کہ یہ روایت ثابت نہیں ۹۲)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرات صوفیہ

" اس میں معذور ہیں کہ ان کو تحقیق احادیث کے لئے فراغ میسر نہیں ہوا ۔ جس راوی پر علمی و عملی حالت سے حسن ظن ہو ' اس سے روایت نقل کر

---

(۱) السنۃ الجلیہ ص ۱۳۶ ۔ ۱۲

(۲) ص ۱۳۷ ۔ ۱۲

دی ۔ جس سے علمائے ظاہر بھی خالی نہیں ایک کی روایت کو دوسرا بے اصل و موضوع بتلاتا ہے ۔ اور دونوں معذور ہیں ۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیجئے ۔ اور کچھ چشتیہ کی خصوصیت نہیں سب صوفیاء بلکہ فقہا و مفسرین کے کلام میں بھی ایسی روایات پائی جاتی ہیں غنیتہ و احیاء العلوم اور بیضاوی و ہدایہ ملاحظہ ہو ۔ مکتوبات مجددیہ میں ذکر بطریق حبس دم حضرت صدیقؓ سے منقول فرمایا ہے ۔

" مگر یہ تساہل اصل مقصود کو مضر نہیں ' کیونکہ اس پر دوسرے دلائل صحیح قائم ہیں ۔ اس مخدوش پر مدار نہیں ۔ پھر اس مقصود میں تفصیل ہے کہ اگر یہ صرف فن میں مقصود ہے عین میں مقصود نہیں تو اس دلیل صحیح کا سمعی یعنی حدیث وغیرہ ہونا ضرور نہیں ' دوسری دلیل بھی اس کے لئے کافی ہے بشرطیکہ وہ شرعاً باطل نہ ہو ' جیسے حبس دم کہ مقصود فی الدین نہیں ' تو گو یہ حدیث وغیرہ سے ثابت نہیں مگر ایسے قواعد طبیہ سے ثابت ہے جن پر شریعت نے نکیر نہیں کیا اور اگر وہ مقصود دین میں بھی مقصود ہو تو دلیل صحیح کا سمعی ہونا بھی ضروری ہے ۔ جیسے اعمال مامور بہا و منہی عنہا کی مطلوبیت و متروکیت کہ ان کے متعلق اگر کوئی خاص روایت ثابت نہ ہو ' مگر دوسری صحیح روایات تو بکثرت ثابت ہیں " ۔

ایسے جزئیات کا استقصار کہاں تک کیا جاسکتا ہے ۔ انصاف پسند اہل اعتراض کے لئے اتنی مثالیں کافی ہیں ۔ مزید کے طالب اصل رسالہ بھی ملاحظہ فرما سکتے ہیں ۔ البتہ ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں ' جن کے لئے حضرات چشتیہ بالعموم زیادہ متہم ہیں ' ان میں سب سے زیادہ عموم سماع کو حاصل ہے ' اور کثرت اکابر چشتیہ اہل سماع گزرے ہیں ۔ اس لئے ذرا اس کی تحقیق و تفصیل بھی سن لیں ' پہلی بات تو یہ ہے کہ سماع کا عدم جواز کوئی متفق علیہ مسئلہ نہیں ۔

" خود علماء میں مختلف فیہ ہے ۔ سو حضرات چشتیہ نے بھی علماء ہی کا ایک قول لے لیا ۔ اس میں خاص قیود لگا دی ہیں ' جس سے کسی قسم کا مفسدہ نہیں رہ گیا ہے ۔ پھر باوجود اس کے کسی نے اس کو طریق کا جز نہیں قرار دیا نہ

طالبوں کو اس کا حکم دیا ' جس طرح کہ ذکر و شغل کا حکم دیتے تھے ۔ البتہ بعض ضرورتوں یا مصلحتوں سے خود سنا ہے " ۔

اب وہ قیود و شرائط جن کی پابندی کے ساتھ علی العموم ان اکابر نے سماع سنایا سننا جائز رکھا وہ اس سلسلہ کے سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کی زبان سے ان اصاغر کے لئے بالخصوص کان کھول کر سننے کے لائق ہیں ' جو اپنے ان اکابر کا نام لے کر ان کو بدنام کرتے اور سارے قیود توڑ کر سارے مفاسد جمع کر کے سنتے ہیں ۔

" فرمایا کہ سماع کی چار قسمیں ہیں ۔ حلال ' حرام ' مکروہ اور مباح (خلاف اولی) اگر صاحب وجد کا میلان خاطر حقیقت کی طرف زیادہ ہو تب تو حلال (مباح) ہے اور اگر مجاز کی طرف زیادہ ہو تو مکروہ ' اور اگر بالکل ہی حقیقت کی طرف ہو تب حلال ' اور اگر بالکل مجاز ہی کا دھیان ہے تب حرام ہے ۔

" فرمایا کہ سماع کے واسطے تین باتیں درکار ہیں زماں ' مکاں ' اخوان ------ سماع کے واسطے کئی باتیں درکار ہیں ' جب یہ موجود ہوں اس وقت سنے ۔ مسمع ' مستمع ' مسموع آلہ سماع مسمع یعنی گانے والا پورا مرد ہو لڑکا یا عورت نہ ہو ۔ مستمع یعنی سننے والا یاد حق میں مشغول ہومسموع یعنی گانا فحش اور کسی کی ہجو نہ ہو ۔ آلہ سماع یعنی مزامیر وغیرہ نہ ہوہ تب یہ سماع مباح ہے " ۔

اور شرائط تو جیسے کچھ ضروری ہیں ظاہر ہی ہے ' حضرت کے کسی مرید نے عرض کیا کہ مولانا رکن الدین ایسی مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جہاں مزامیر بھی ہوتے ہیں ۔

" جب مولانا حاضر ہوئے تو آپ نے دریافت فرمایا ۔ عرض کیا ایسی مجلسوں میں بندہ کا کوئی دوست نہ تھا (جو میری تائید کرتا) اور گمان غالب تھا کہ میرے منع کرنے سے وہ لوگ باز نہ رہیں گے ۔ حضرت نے فرمایا کہ تم منع کرو وہ لوگ باز آجائیں فبہا ' ورنہ تم وہاں سے اٹھ کھڑے ہو " ۔

حاصل یہ کہ

" مزامیر تو مطلقاً ممنوع اور سماع محض اگر بشرائط ہو تو مختلف فیہ جس میں صوفیہ نے اباحت کا قول لے لیا ہے "۔

لیکن چشتیہ چونکہ فقہ میں حنفی مذہب کے مقلد ہوتے ہیں ' اس لئے " ایک سوال یہ باقی رہا کہ انھوں نے اپنے مذہب کے خلاف کیوں کیا۔ اس کا

" ایک جواب تو یہ ہے کہ محقق اتنے اختلاف سے حنفیت سے نہیں نکلتا دوسرا جواب وہ ہے جس کو اقتباس الانوار میں حضرت قطب صاحب کے تذکرہ میں سیرالاقطاب سے قاضی حمید الدین ناگوری رحمتہ اللہ علیہ کی طرف منسوب کیا ہے کہ وہ حاضر تھے کہا کہ

" میں ہوں حمید الدین کہ سماع سنتا ہوں اور بوجہ علماء کی روایت کے مباح کہتا ہوں ۔ اس لئے کہ میں دل کا مریض ہوں اور سماع اس کی دوا ہے ۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے شراب سے ایسے وقت علاج کرنے کی اجازت دی ہے ' جب کہ ازالہ مرض کے لئے اور دوا ہی نہ ہو ' اور حکیموں کا اتفاق اس پر ہوگیا ہو کہ صحت بدون شراب کے ناممکن ہے ۔ اب چونکہ میرے لا علاج مرض کی دوا سرود سننا ہے ' لہٰذا وہ میرے لئے مباح ہے اور تم پر حرام ہے "

" اس سے بھی معلوم ہوا کہ اباحت کا حکم ایسی اضطراری حالت میں ہے ' جس میں حرام دوا حلال ہو جائے ۔ کیا اس وقت ایسا اضطرار کسی میں دیکھا جاتا ہے " ۔(ص ۸۶)

حضرت سلطان جی ہی کے دو قول اور اس باب میں سننے کے لائق ہیں ۔ بعض اہل تعلق کی نسبت یہ شکایت پہنچی کہ انھوں نے مزامیر کے ساتھ سماع سنا ' تو آپ نے فرمایا کہ ' انھوں نے اچھا نہیں کیا میں نے تو بالکل منع کر دیا ہے کہ مجلس میں محرمات نہ ہوں ———— پھر فرمایا کہ

" اگر کوئی شخص کسی مقام (ولایت وغیرہ) سے گرے گا تو شریعت میں رہے گا ' اور جو وہاں سے بھی گرگیا وہ کہاں کا رہا " ۔(ص ۲۵)

ایک اور موقع پر کسی نے کہا کہ " آپ کو تو حکم ہوا ہے کہ جس وقت چاہیں سماع سنیں آپ کے لئے حلال ہے ۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ

" جو شے حرام ہے وہ کسی کے لئے حلال نہیں ہوتی اور جو حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام نہیں ہوتی ۔ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے ۔

حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ دف کے ساتھ سماع کو مباح فرماتے ہیں ' اور ہمارے علماء اس کے خلاف ہیں " ۔

سماع کے ساتھ اور اس سے بڑھ کر گوناگوں مفاسد کا مجموعہ آج کل کے عرس اور میلے ہیں اس کی تحقیق و تفصیل بھی ایک چشتی بزرگ شیخ عماد الدین سہروردی کی اس نقل کے سلسلہ میں فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنے پیروں کا عرس بھی کرتے تھے اور اس میں سماع بھی سنتے تھے ۔ اس مسئلہ میں حضرت علیہ الرحمتہ نے سب سے پہلے تو مخالفین کے تشدد کو اس طرح نرم فرمایا ہے کہ

" حدیث میں ہے کہ عن ابن عمرؓ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یزور قباء اویاتی قباء و فی روایہ کل سبت راکیا و ماشیا فیصلی فیہ رکعتیں (للستہ الا الترمذی جمع الفوائد) وعن ابی ہریرۃ مرفوعا لاتختصو لیلہ الجمعہ بقیام من بین اللیالی ولا تختصو یوم الجمعہ بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصومہ احد کم (للشیخین وابی داؤد و الترمذی جمع الفوائد)

" ان دونوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ کسی مقصود مباح یا کسی طاعت کے لئے کسی خاص دن کا تعین اگر قربت کے اعتقاد سے نہ ہو بلکہ کسی مباح مصلحت سے ہو تو جائز ہے ۔ جیسے مدارس دینیہ میں اسباق کے لئے گھنٹے متعین ہوتے ہیں ۔ اور اگر قربت کا اعتقاد ہو تو منع ہے ۔

" پس عرس میں جو تاریخ متعین ہوتی ہے ' اگر اس تعین کو قربت نہ

سمجھیں بلکہ کسی اور مصلحت سے ہو ' مثلاً سہولت اجتماع تاکہ تداعی (بلاوے) کی صعوبت یا بعض اوقات اس کی کراہت سے مامون رہیں ۔ اور خود اجتماع اس مصلحت سے ہو کہ ایک سلسلہ کے احباب باہم مل کر حب فی اللہ کو ترقی دیں ' اور اپنے بزرگوں کو آسانی سے اور کثیر تعداد میں جو کہ اجتماع میں حاصل ہے ' ثواب پہنچانا بے تکلف میسر ہو جائے نیز اس اجتماع میں طالبوں کو اپنے لئے شیخ کا انتخاب بھی سہل ہوتا ہے ۔ یہ تو ظاہری مصالح ہیں جو مشاہد ہیں ۔

" یا کوئی باطنی مصلحت داعی ہو ' جیسا میں نے بعض اکابر اہل ذوق سے سنا ہے کہ میت کو اپنے یوم وفات کے آنے پر وصول ثواب کے انتظار کی تجدید ہوتی ہے ۔ اور یہ مصلحت محض کشفی ہے ' جس کی تکذیب میں کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہیں اس لئے صاحب کشف کو یا اس کے متعقدین کو بدرجہ ظن اس کی رعایت کرنا جائز ہے ۔ البتہ جزم یا یقین جائز نہیں ۔ بہرحال اگر ایسے مصالح سے یہ تعیین ہوتی ہو تو فی نفسہ جائز ہے ۔

" لیکن اگر کوئی موجب ممانعت عارض اس میں شریک ہو جائے مثلاً خلاف شرائط سماع یا مردوں اور عورتوں کا اختلاط یا نفس مجمع کو جمع کرنے کا اہتمام ۔ خصوصًا فاسقوں فاجروں کی شرکت ' یا شرکت کے بعد بلا ضرورت ان کا احترام یا عوام کے فساد عقیدہ کا احتمال تو ان عوارض سے پھر وہ مباح بھی ممنوع ہو جائے گا ' اور ایسے عرس کا ترک کرنا قطعاً واجب ہوگا ' جیسا کہ اس زمانہ کے اکثر عرسوں کی حالت ہوگئی ہے ۔

" پس پرانے مشائخ سے جو اعراس منقول ہیں اگر ان کی سند نقل صحیح ہو ان میں کوئی امر منکر ثابت نہیں ۔ لہٰذا ان کے فعل میں کوئی اشکال نہیں ۔ البتہ اس وقت کے عرسوں کو ان پر قیاس کرنے کی قطعًا گنجائش نہیں ' کہ اس میں علاوہ فساد اعتقاد کے التزام و اہتمام ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایسی عید ہو جاتے ہیں ' جن کی حدیث میں ممانعت ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا

تجعلوا قبری عیدا وصلوا علی فان صلوتکم تبلغنی حیث کنتم ۔ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری قبر پر عید نہ منانا ' اور مجھ پر درود پڑھنا ' اس لئے کہ تم جہاں بھی ہو تمہارا درود مجھ کو پہنچ جائے گا " ۔ (ص ۱۶۷ ' ۱۶۶)

" کیونکر قبر کی عید سے صاحب قبر کی عید مقصود ہوتی ہے ۔ جب خود ذات بابرکات (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کی قبر کی عید جائز نہیں " تو بدیگراں چہ رسد " ۔

سماع مزامیر اور عید کے معاملہ میں بالعموم جو دو حدیثیں زیر بحث آتی ہیں وہ کہ

" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ابوبکرؓ اندر داخل ہوئے تو میرے پاس انصار کی دو بچیاں وہ گیت گا رہی تھیں جو انصار نے جنگ کے دن کہا تھا اور وہ (باقاعدہ یا پیشہ ور) گانے والیاں نہ تھیں (پھر بھی) ابوبکرؓ نے فرمایا کہ شیطان کے مزامیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان میں کیوں جمع کر رکھا ہے ۔ اور یہ واقعہ عید کے دن کا ہے ۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکر ہر قوم کے واسطے ایک عید ہے اور یہ دن ہمارے لئے عید ہے " ۔ (بخاری ابواب العیدین)

دوسری حدیث یہ ہے کہ

" ربیع بنت معوذ بن عفرا نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے پس اندر داخل ہوئے جس وقت میری رخصتی ہوئی تھی ' اور بیٹھے میرے فرش پر جس طرح تم بیٹھے ہو ۔ اس کے بعد ہماری چھوٹی بچیاں دف بجانے لگیں ' اور جنگ بدر میں جو بڑے مقتول ہوئے ہیں ان کا مرثیہ گانے لگیں ۔ دفعتاً ان میں سے ایک نے کہا کہ وفینا نبی یعلم ما فی غد (یعنی ہم میں ایک ایسے نبی موجود ہیں جو آئندہ کے واقعات جانتے ہیں) حضورؐ نے فرمایا کہ اس کلمہ کو چھوڑ

دو ' اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں (بخاری ابواب النکاح)

ان دونوں حدیثوں کو حضرت مجدد وقت علیہ الرحمہ نے یہی امر فیصل قرار دے کر ان سے حسب ذیل نتائج اخذ فرمائے ہیں کہ

" گانے والیاں نابالغ بچیاں تھیں (۲) وہ اس فن کی (باقاعدہ) جاننے والیاں نہ تھیں ' ان کی حالت بالکل ایسی تھی جیسے اکثر گھروں میں چھوٹی بچیاں جھولے میں دل بہلانے کو مہندی وغیرہ کے گیت گا لیتی ہیں (۳) گیت گا مضمون شہوانی نہ تھا ' بلکہ شجاعت انگیز تھا ' اور ایک نے بے موقع مضمون شروع کیا تو حضور اقدس نے روک دیا ' اب بے موقع ہونے کی خواہ وجہ کوئی ہو (۴) چونکہ اس فن کو نہ جانتی تھیں ظاہر ہے کہ دف بھی باقاعدہ نہ بجاتی تھیں ۔ فقہاء نے بھی جو شادی کے اعلان کے لئے دف کی اجازت دی ہے ' اس میں عدم تطریب کی شرط لگا دی ہے (۵) بدون (کسی خاص موقع یا) داعی کے اس شغل کو اس قدر نا پسندیدہ قرار دیا گیا کہ حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے قول میں یہ ترمیم فرمائی کہ وہ یوم عید کو اس کا داعی (موقع) نہ سمجھے تھے آپ نے اس کا داعی ہونا بتلا دیا باقی بلا داعی اس اشتغال کے مذموم ہونے کی حضورؐ نے نفی نہیں فرمائی ۔

" پس حدیث تقریری سے بلا داعی ایسے اشتغال کا مذموم ہونا ثابت ہوگیا اب یہ دوسری بحث ہے کہ دوسرے کن کن دواعی کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے ' سو یہ مجتہدین کا منصب ہے ' جن میں محققین مشائخ داخل ہیں ۔ غیر مجتہدین کو اس میں کچھ دخل نہیں " (ص ۱۷۰)

اسی سلسلہ میں (گو اصل موضوع سے ذرا دور) ایک تشدد کا بھی ازالہ فرما دیا گیا ہے ۔ وہ یہ کہ بعض متشددین اہل ظاہر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کو بھی ممنوع قرار ٹھہرا دیا ہے ۔

" کسی نے تو نفس سفر ہی میں کلام کیا اور اس حدیث سے تمسک کیا لا تشدو الرحال الا الی ثلثۃ مساجد حالانکہ اس حدیث کی تفسیر خود دوسری حدیث

میں آگئی ہے فی مسند احمد عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم **لا ینبغی للمطی ان یشد رحالہ الی مسجد ینبغی فیہ الصلوہ غیر المسجد الحرام والاقصی و مسجدی ھذا** (یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ ناجائز ہے مسافر کے لئے یہ بات کہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے سواری تیار کرے بجز مسجد حرام و مسجد اقصیٰ اور میری مسجد کے)

"اور کسی نے اجتماع سے منع کیا ہے اور اس حدیث سے تمسک کیا ہے لا تجعلو قبری عیدا حالانکہ نہ وہاں کوئی تاریخ معین ہے نہ اجتماع میں تداعی (بلاوا) یا اہتمام ہے' اور عید کے یہ دو لوازم ہیں۔ اور بعض نے خیرالقرون میں یہ سفر منقول نہ ہونے سے استدلال کیا ہے۔ حالانکہ حضرت عمرابن عبدالعزیز سے جو جلیل القدر تابعین ہیں ثابت ہے کہ وہ روضہ اقدس پر سلام پہنچانے کے لئے قصدا قاصد کو بھیجتے تھے اور کسی سے اس پر نکیر منقول نہیں تو ایک قسم کا اجماع ہوگیا اور جب دوسرے کا سلام پہنچانے کے لئے سفر جائز ہے تو خود اپنا سلام عرض کرنے کے لئے بدرجہ اولیٰ جائز ہے"۔

"اور نسائی باب ساعہ الاجابتہ یوم الجمعہ میں بصرہ بن ابی بصرہ کا قول ہے کہ لو لقیتک (یا اباھریرہ) من قبل ان تاتیہ (ای الطور) لم تاتہ - (یعنی اے ابوہریرہ اگر میں آپ سے آپ کے طور پر جانے سے پہلے ملاقات کرلیتا تو وہاں نہ جاسکتے) اور اس پر حدیث لا تعمل المطی الا الی ثلثہ مساجد سے استدلال فرمایا ہے۔

"تو اس سے مطلق زیارت طور کی ممانعت لازم نہیں بلکہ سفر باعتقاد قربت سے ممانعت ہے' کیونکہ سفر طور کا قربت ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں۔ اور اگر کسی سفر کا موجب قربت ہونا ثابت ہو یا سفر باعتقاد قربت نہ ہو تو وہ اس میں داخل نہیں۔ (ص ۱۷۲)

• اس ضمن میں ایک اور چیز بزرگوں کے آثار کا مسئلہ ہے۔ اس میں بھی لوگوں نے افراط و تفریط سے بہت کام لیا ہے۔ اور اعتدال و تحقیق کے مسلک کو حضرت نے ایک مختصر رسالہ میں واضح فرمایا ہے۔ تھانہ بھون کے قریب ایک قصبہ

جلال آباد ہے وہاں ایک جبہ تھا (بعد کو ریاست رامپور چلا گیا) جو عام طور سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ اصل میں اس پر ہے اور السنتہ الجلیہ کا جز بنا دیا گیا ہے۔ (۱) اس میں ارشاد ہے۔ کہ

"کسی ذات کا عشق لزوماً مقتضی ہے اس کے متعلقات و ملابسات کی محبت کو ---- اور تعلق کے تفاوت کے درجات سے محبت کے درجات میں بھی تفاوت لازم ہے اس اصل پر عشاق محمدی کو سب سے زیادہ محبت کا تعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے ہوگا' پھر اپنے اپنے درجہ میں حضرات صحابہ اہل بیت و ذریت اور آپ کے نائبین و وارثین یعنی علماء و اولیاء سے حتٰی کہ اپنے درجہ میں آپ کے لباس تک سے محبت ہوگی۔

در منزلیکہ جاناں روزے رسیدہ باشد
با خاک آستانش داریم مرحبائے

اور اس تعلق کو نہ جاننے سے کبھی اس میں افراط و تفریط ہو جاتی ہے۔ اس لئے مدت سے خیال تھا کہ اس کے متعلق ضروری تحقیق لکھ دی جائے تاکہ علماً و عملاً افراط و تفریط سے بچنا ممکن ہو۔"

اس تحقیق کے بعض اجزاء کا تعلق تو خاص اس جبہ کے تاریخی ثبوت وغیرہ سے ہے اور بعض کا عام تبرکات سے' جو ملخصاً درج ذیل ہیں پہلا جزء تو یہ ہے کہ مقبولین کے آثار برکت کی چیز ہیں اور ان سے بطریق مشروع برکت حاصل کرنا ہے جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وقال لھم نبیھم ان ایۃ ملکہ ان یا تیکم التابوت فیہ سکنۃ من ربکم و بقیۃ مما ترک ال موسی وال ھارون تحملہ الملائکۃ الایہ** ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی (طالوت کی) بادشاہت کی علامت

---

(۱) جو اس میں ص ۸۹ سے شروع ہے ۱۲

تابوت کا آنا ہے ' جس میں تمہارے رب کی جانب سے اطمینان کا اور موسیٰ و
ہارون کے ترکہ کا بقیہ ہوگا ۔ اس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے ۔ اس کی
تفسیر (جلالین) میں ہے کہ وہ لوگ اس تابوت کے واسطہ سے اپنے دشمنوں پر
فتح و نصرت کی دعا کیا کرتے تھے اور جنگ میں اس کو سب سے آگے رکھتے تھے '
اور اس کے سبب مطمئن رہتے تھے ----- اس بقیہ ترکہ میں موسیٰ علیہ السلام
کی نعلین مبارک و عصا تھا اور ہارون علیہ السلام کا عمامہ مبارک تھا ۔

" حدیث میں عثمان بن عبداللہ بن وہب سے روایت ہے کہ مجھ کو میرے
گھر والوں نے ایک پیالہ پانی لے کر حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں بھیجا ۔ بات
یہ تھی کہ جب کسی کو نظر لگتی یا اور کوئی بیماری ہوتی تو ان کی خدمت میں ایک
لگن بھیجا جاتا تھا ۔ اس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک
جس کو انہوں نے چاندی کی نلکی میں رکھ چھوڑا تھا پانی میں ڈال کر پلا دیتیں ۔

" اسی طرح اسما بنت ابی بکر کے پاس ایک جبہ تھا ' جس کے متعلق انہوں
نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے ' جو حضرت عائشہؓ کے پاس
تھا ' جب ان کی وفات ہوئی تو میں نے اس کو لے لیا ۔ ہم اس کو بیماروں کے
لئے دھو کر اس کے واسطہ شفا چاہتے ہیں ۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے اپنی صاحب زادی حضرت زینب کے
غسل و تکفین کے وقت اپنا تہہ بند پھینکا اور فرمایا کہ پہلے اس کو ان پر لپیٹ دو
" ۔ شیخ نے کہا کہ صالحین کے آثار و لباس سے حصول برکت کے لئے یہ حدیث
اصل ہے ۔

اہل محبت کی تو تعظیم آثار کے معاملہ میں حد یہ ہے کہ احمد بن فضلویہ جو تیر
انداز مجاہدین میں ہیں جب سے ان کو یہ معلوم ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے کمان کا استعمال فرمایا ہے ' تو پھر بلاوضو کسی کمان کو ہاتھ نہیں لگایا ! حضرت عمرؓ
کے متعلق روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست گاہ پر ہاتھ رکھ کر

پھر اس کو (برکت و محبت کی راہ سے) اپنی پیشانی پر رکھا۔
بس اس قسم کے آثار و تبرکات سے برکت حاصل کرنے کی شرط یہ ہے کہ " احکام کا ادب ضائع نہ ہو اور ان کے ساتھ کوئی معاملہ خلاف شرع نہ کیا جائے یعنی

" ان کی عید نہ منائی جائے ' جس میں میلوں کی طرح مجمع ہوتا ہے ' تاریخ کی تعیین ہوتی ہے دور دور سے آدمی آتے ہیں ' عورتوں کا اجتماع ہوتا ہے ' بلکہ نماز روزہ سے زیادہ اس کا اہتمام ہوتا ہے ۔ لکھی ہوئی چیزیں قبر میں نہ رکھی جائیں ' جیسے شجرہ یا عہد نامہ میت کے پیپ لہو کے تلوث سے ان کا احترام باطل ہوتا ہے ۔ ان کی نذر نہ مانی جائے ' کیونکہ نذر عبادت ہے جو مخلوق کے لئے نہیں ہوسکتی ہے ۔ اس کے لئے کچھ وقف نہ کیا جائے کیونکہ وقف میں شرط ہے کہ مصرف قربت ہو اور یہ مصارف متعارفہ خود بدعت ہیں ۔ البتہ اگر اس نیت سے وقف کیا جائے کہ جو فقرا و مساکین اس کی زیارت کے لئے آویں ان پر صرف کیا جائے ۔ اور جو اس کے متولی ہوں وہ بھی بقدر حاجت لے لیا کریں تو یہ وقف صحیح ہے " ۔

" نہ ان کی تعظیم میں غلو کیا جائے ' جس سے شرک و بدعت تک نوبت پہنچے ' نہ کسی قسم کی اہانت کی جائے کہ اس کی اہانت میں عرفاً اس کی اہانت ہے ' جس کی طرف یہ منسوب ہے ' جس سے بچنا واجب ہے ۔ ہر حال میں اعتدال ملحوظ رہے علماً بھی عملاً بھی ۔ (ص ۹۲) تبرکات کی زیارت پر معاوضہ لینا جائز نہیں ۔۔۔۔۔۔ البتہ بلا شرط و بلا عرف و بلا جبر و بلا ذلت مضائقہ نہیں ۔ البتہ پھول چڑھانا چونکہ شعار اہل بدعت کا ہوگیا ہے اچھا نہیں ۔ اگر کسی مقتدا یا ذی اثر کی شرکت زیارت سے عوام کسی غلط فہمی میں پڑجائیں تو وہ علانیہ اسی شرکت سے احتراز کرے (ص ۱۰۲ و ص ۱۰۴)

ان کے علاوہ اور بہت سی ہدایات ہیں جو کثیر الوقوع نہیں ' اس لئے بخوف

طوالت نقل نہیں کی جاتیں۔ اصل مدعا تمام ہدایات کا شرعی احکام کی حفاظت اور اعتدال کی رعایت ہے۔ اس اعتدال کی کیفیت کو واضح فرمانے کے لئے خود حضرت نے بطور نمونہ دو تحریریں نقل فرمائی ہیں۔ ایک حرمین شریفین اور روضہ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشہ کو بوسہ دینے اور آنکھوں سے لگانے کے بارے میں حضرت مولانا گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ " ان نقشوں کو بوسہ دینا اور آنکھوں سے لگانا ثابت نہیں۔ اور اگر غایت شوق میں کسی سے ایسا ہو جائے تو اس پر عتاب و ملامت بھی درست نہیں "۔ (ص ۹۳)

دوسری تحریر اس معاملہ میں مجددانہ تفصیل کے ساتھ خود حضرت علیہ الرحمتہ کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بحث طلب دو باتیں ہیں۔

ایک یہ کہ فی نفسہ ایسے نقشے یا تمثال کو سر پر رکھنا بوسہ دینا اس کے توسل سے دعا کرنے کا کیا حکم ہے، دوسرے یہ کہ عوام کے موجودہ و آئندہ مفاسد کے احتمال غالب کے اعتبار سے ان کا کیا حکم ہے۔

" امر اول کی تفصیل یہ ہے کہ اگر دین و عبادت سمجھ کر ایسا کیا جائے تب تو بدعت ہے۔ کیونکہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ اور اگر طبعی ادب و شوق سے کیا جائے تو حرج نہیں۔ ایسے امور طبعیہ کے جواز کے لئے جزئی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اتنا کافی ہے کہ مخالف دلیل نہ موجود ہو جیسے حضرت عثمان کا ارشاد کہ ولا مست ذکری بیمینی منذ بایعت بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ظاہر ہے کہ ایسا ادب و رعایت کوئی شرعی حکم نہیں، ورنہ نجس کپڑے کا نچوڑنا یا رگڑنا داہنے ہاتھ سے جائز نہ ہوتا بخلاف نہی عن مس الذکر فی الاستنجاء کہ وہ ایک تعبدی حکم ہے۔

" امر دوم کی تحقیق یہ ہے کہ جہاں مفاسد کا احتمال غالب ہو وہاں روکا جائے۔ اور عوام کی حالت اس وقت واقعی ایسی ہے کہ اس پر نظر کرکے احتیاط ہی مناسب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری جانب بھی اصلاح ضروری ہے

مثلاً ایسے نقشوں کے ساتھ قصداً اہانت کی کوئی حرکت کرنا"۔ (ص ۹۴)

مفاسد کے غالب احتمال کی تفصیل یہ ہے کہ

" یہ احتمال خواہ عوام کے فعل میں ہو خواہ خواص کے یعنی اگر کسی مقتدا کے ایسے فعل سے عوام کے غلو یا حدود سے نکل جانے کا اندیشہ ہے تو اس مقتدا کو روکنا ضروری ہے ' چاہے وہ دینی مقتدا ہو یا دنیوی اثر کے سبب عوام اس کے قول و فعل کا اقتداء کرتے ہوں ———— کیونکہ احکام کی حفاظت و حمایت تبرکات کی زیارت و رعایت سے زیادہ ضروری ہے ۔ اور عوام کے دین کی حفاظت یہ بھی شرعی حکم ہے "۔

" دیکھئے سیدالعاشقین حضرت خواجہ اویس قرنی رحمتہ اللہ علیہ باوجود اس کے کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا ' مگر والدہ کی خدمت کے سبب کہ وہ شرعی حکم تھا کیونکہ وہ محتاج تھیں اور دوسرا کوئی خادم نہ تھا ۔ عمر بھر آتش فراق میں جلتے رہے اور حضور کی زیارت نہ کی ———— جب احکام زیارت ذات پر مقدم ہیں تو زیارت تبرکات پر کیوں مقدم نہ ہوں گے ۔ فقہا نے تو جس بات میں عوام کے مفسدہ کا وہم ہو خواص کے لئے ترک مستحبات تک کا فتویٰ دے دیا ہے ۔ (ص ۹۵)

غرض محبوب کے حکم کی بجا آوری کو اس کے تبرکات کیا اس کی ذات کی زیارت پر بھی مقدم رکھنا سچا عشق ہے ۔ کیونکہ احکام کی اتباع میں محبوب کی رضا و خوشنودی ہے اور اس کی ذات یا تبرکات کی زیارت میں اپنے جذبات عشق کی ۔ اور کامل و صادق عشاق کا مسلک یہ ہے کہ

ترک کار خود گرفتم تا بر آید کار دوست

الطرابی المنصور اور السنتہ الجلیہ ان مستقل تالیفات کے علاوہ بھی تصوف یا صوفیاء کی معتبرو مستند کتابوں یا کلام میں اگر کہیں کوئی خلاف شریعت اشکال نظر آیا یا کسی کی طرف سے پیش کیا گیا' تو اس کا بھی حسب موقع حل و ازالہ فرمایا گیا ہے مثلاً گلستان اور بوستان کے بعض اشعار کا۔ حدیہ کہ یوسف زلیخا کوئی تصوف کی کتاب نہیں۔ لیکن ایک مسلم جلیل القدر صوفی مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ کی تصنیف بہرحال ہے۔ کسی نے اس کے اشعار ذیل کو پیش کرکے سوال کر دیا کہ ایسی کتاب کا پڑھنا پڑھانا جائز ہے ؟

دو پستان ہر یکے چو قبہ نور
حبا بے ساختہ از عین کافور
دو نار تازہ تر رستہ زیک شاخ
کف امید شان ناسودہ گستاخ
شکم چون تختہ قاقم کشیدہ
بزے دایہ نافے رابریدہ
سرینش کوہ اما سیم سادہ
چوکوہ کز کمر زیر اوفتادہ

اگر کسی حاکم کی بی بی کی بھی ایسی تعریف کی جائے تو وہ کتنا خشمناک ہوگا نہ کہ یوسف علیہ السلام کی بی بی کی "۔ جواب میں ارشاد ہوا اور قرآن مجید کی سند کے ساتھ ارشاد ہوا کہ

"گو ایسی مدح خلاف احترام ہے' مگر ایسی حالت کے اعتبار سے ہے کہ اس وقت وہ (زلیخا) واجب الاحترام نہ تھیں۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام' کے نکاح میں آنے بلکہ اسلام لانے کے بھی قبل۔ جس حالت میں خود حق تعالیٰ نے ان کا قصہ ہادم (خلاف) احترام ذکر فرمایا ہے کہ وراودتہ التی ھو فی بیتھا الخ قالت ما جزاء الخ جو کذب و کید وغیرہ کو مستلزم ہے۔

" لہٰذا یہ سبب تو اس کے پڑھنے پڑھانے کا مانع ہو نہیں سکتا۔ البتہ اگر ایسے مضامین سے قوائے شہویہ کے ہیجان کا احتمال ہو تو صرف یہ مضمون نہ پڑھایا جائے ۔(۱)

خیر یہ تو کوئی تصوف کی کتاب تھی نہ تصوف کی بات ۔ البتہ مولانا جامی ہی کی فن تصوف کی مسلّم و مستند کتاب لوائح کے بعض مقامات کے متعلق کسی نے اشکال پیش کیا مثلاً لائحہ ۲۵ میں ہے ۔

" پس عالم ظاہر حق است و حق باطن عالم ۔ عالم پیش از ظہور عین حق بود و حق بعد از ظہور عین عالم بلکہ فی الحقیقت یک حقیقت است ۔ و ظہور و بطون و اولیت و آخریت از نسبت و اعتبارات روند ۔

دوسرے مقامات میں بھی ایسا ہی ہے ' جیسے کہ لائحہ ۱۸ میں کہ

" پس نیست در خارج الا حقیقتے واحد کہ بواسطہ تلبس و شیون و صفات متکثرہ متعدد می نماید نسبت بآنان کہ درضیق مراتب محبوس اند و باحکام و آثار ان مقید " ۔

جواب اور حل ملاحظہ ہو کہ

یہاں ایک اصل ہے اور بعض اصطلاحات ' جن کے پیش نظر رہنے سے ایک یہ عبارت کیا کہ تمام لوائح حل ہو جائے گی وہ یہ کہ ان حضرات کے نزدیک خارج میں تحقق صرف ایک وجود واجب کا ہے ۔ باقی دوسرے موجودات کو اس وجود حقیقی کے ساتھ ایک خاص تعلق رکھنے کے سبب موجود کہا جاتا ہے ۔

" اس تعلق کی کیفیت ان حضرات کے نزدیک ایسی ہے ' جیسے متصف (موجود) بالعرض کا تعلق متصف (موجود) بالذات کے ساتھ ۔ بس اس بناء پر موجود بالذات صرف ذات حق ہے ' اور ممکنات موجود بالعرض ۔ اور اس مرتبہ

---

(۱) بوادر النوادر ص ۷۲ و ص ۷۳ ۔ ۱۳

میں ممکنات کو غیر موجود بھی کہہ دیا جاتا ہے ۔

" اور چونکہ یہ موجودات بالعرض محسوس و مشاہد ہیں اور موجود بالذات غیر مشاہد (یا محسوس) اس لئے عالم کو ظاہر حق اور حق کو باطن عالم کہہ دیا ظاہر و باطن کے وہ معنی نہیں جس " معنی کرکے روح کو باطن انسان اور جسد کو ظاہر انسان کہا جاتا ہے ۔ بلکہ ظاہر کے معنی مظہر کے ہیں اور باطن کے ذی مظہر کے "

" اور چونکہ مابہ الاتصاف بالذات و مابہ الاتصاف بالعرض شے واحد ہے ۔ تغایر محض اعتباری ہوتا ہے " اس لئے دونوں کو ایک دوسرے کا عین کہا جاسکتا ہے ۔ اور اس مابہ الاتصاف (وجود) کے اعتبار سے دونوں اتصاف کو اور پھر دونوں اتصاف کے اعتبار سے دونوں متصف کو تجوزاً و تسامحاً عین کہنا صحیح ہوسکتا ہے اور درحقیقت عینیت کا حکم خود ان دونوں حیثیتوں میں ہے ۔

" پس اس بناء پر عالم اور حق کو عین کہہ دیا۔اور اس میں قبل ظہور و بعد ظہور کی دونوں حالتیں اصل میں متساوی ہیں ۔ مگر چونکہ قبل ظہور عالم میں خفاء محض تھا ۔ اس لئے اس کو حق میں مندرج کہہ دیا اور بعد ظہور امر بالعکس ہوگیا ۔ اس لئے اس کے عکس کا حکم کر دیا بس یہ عینیت دو چیزوں کے اتحاد کے ہم معنی نہیں ۔ بلکہ شے واحد (ایک ہی شے) کی وحدت کے معنی میں ہے " ۔(۱)

چونکہ لوائح کا بڑا مسئلہ یہی وحدۃ الوجود کی بحث ہے ' جس میں بہتوں کو خالق و مخلوق کی عینیت کا التباس ہو جاتا ہے ' اس لئے اس میں شک نہیں کہ مذکورہ عبارتوں کا حل دراصل ساری کتاب (لوائح) کا حل ہے ۔ تاہم یہ حل اس مذاق کے اہل علم و تحقیق ہی کے لئے ہے ۔ دوسروں کو اس پھیر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ' خود سائل بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس مذاق کے نہ تھے ' اس لئے ان کو

---

(۱) بوادر النوادر ص ۱۲۹ ـ ۱۳

آخر میں حضرت نے ہدایت فرمائی کہ "ایسی کتابیں دیکھنا مضر ہے آئندہ نہ پوچھا جائے"۔

عارف شیرازی رحمتہ اللہ علیہ : ایک اور حضرت خواجہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ ہیں، جن کا حال و مقال سب اس لئے مشتبہ ہوگیا کہ "ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو" مگر ان سے "بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح بعضوں نے تاریخ دانی کا فرض حضرت منصور کو ملحد و زندیق قرار دے کر ادا کیا، اسی طرح بعضوں نے سخن فہمی کی داد یہ دی کہ عارف شیراز کی مستی میں شراب انگور اور شراب معرفت کے فرق کو نہ سمجھ سکے۔ مدت تک خود یہ بے تمیز راقم بھی ایسی ہی خوش فہمی میں مبتلا رہا۔ اور بمبئی یونیورسٹی کے دکن کالج و گجرات کالج کے لیکچروں میں حضرت خواجہ کی روح کے لئے سامان اذیت بنا رہا "اللھم اغفرلی فانما انا بشر فایما مومن اذیتہ او شتمتہ فاجعلھالہ صلوۃ و زکوۃ تقربہ بھا الیک"

حالانکہ ذرا آنکھیں کھول کر پڑھا جائے تو "بادہ و ساغر" محض "مشاہدہ حق کی گفتگو" کا ایک باریک پردہ ہے۔ وہ بھی فن کی اصطلاحات نہ جاننے والوں کے لئے۔ مثلاً پہلی ہی غزل کے ان اشعار میں "عشق، وے"۔ اور "پیرمغان" سے مجاز سوا بدمذاق کے کون مراد لے سکتا ہے۔

الا یا ایھا الساقی ادر کا ساوناولہا ۔ کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا

بے سجادہ رنگین گرت پیرمغان گوید ۔ کہ سالک بے خبر نبوز راہ و رسم منزلہا

پھر غزلیں کی غزلیں ایسے اسرار معرفت اور مضامین حقیقت سے پر ہیں، جن کو زبردستی بھی مجاز کے معنی نہیں پہنائے جاسکتے۔ مثلاً

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند

وندران ظلمت شب آب حیاتم دادند

بیخود از پر توشعشہ ذاتم کردند

بادہ از جام تجلی بصفا تم دادند

اسی طرح اس کے بعد ہی کی دوسری غزل

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسر شتند و بہ پیمانہ زدند
ساکنان حرم سر عفاف ملکوت
بامن راہ نشین بادہ مستانہ زدند

دونوں مسلسل ۲۲ شعر کی غزلیں تمام تر حقیقت و معرفت ہی کے معالات و مضامین کی ترجمان ہیں۔

غرض دیوان حافظ اصل میں عرفان حافظ ہے۔ حضرت نے اسی نام سے ایک معتدبہ حصہ کی مستقلاً شرح تحریر فرما دی ہے تاکہ اہل ہوس اس کے "مے و معشوق" کو اپنے جذبات ہوسناکی کی حقیقت کا آئینہ نہ بنائیں، اور دوسری طرف مذاق سخن سے نا آشنا بعض بظاہر خلاف شریعت شاعرانہ تعبیرات و عنوانات کی بناء پر اس کو اپنی رندی و آزادی کی حجت نہ ٹھہرائیں۔ مثلاً اس طرح کے آزاد منش بارہا بے تکلف یہ شعر پڑھ کر اپنے نزدیک شریعت سے آزادی حاصل کر لیتے ہیں کہ

مباش درپئے آزار ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازین گناہے نیست

حالانکہ جس کو ذرا بھی مذاق سخن ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دل آزاری کے سوا شریعت میں اور کوئی گناہ گناہ ہی نہیں۔ اصل میں حقوق عباد کو شاعرانہ مبالغہ سے واضح کرنا مقصود ہے۔ جس کو حضرت نے شرح میں ایک لفظ سے واضح فرما دیا کہ "غیر ازین گناہ ہے نیست" سے مراد یہ ہے کہ "برابر ازیں گناہے نیست"۔ اور

"مبالغۃً باین عنوان (کہ غیر ازین گنا ہے نیست) تعبیر نمودہ جس سے مقصد بالخصوص حقوق العباد کے بارے میں اہتمام تقویٰ کا امر فرمانا ہے جو سالک کے لئے سب سے بڑھ کر مضر ہے۔ کیونکہ اس کا تدارک (بارہا) اختیار میں نہیں ہوتا۔ نیز سلوک میں قلب میں خشوع پیدا کرنا خصوصیت کے ساتھ مطمح نظر ہوتا ہے کہ وہ منبع ہے تمام اخلاق حسنہ کا اور آزار دینا قساوت قلب کی علامت ہے، جو خشوع کے منافی ہے، اس لئے بھی یہ اشد ہے"۔(۱)

اسی طرح ایک اور شعر رندمنش جو از رندی مین پڑھ دیا کرتے ہیں کہ "ترسم کہ حرفہ نبرد رو زباز خواست نان حلال شیخ ز آب حرام ما" حالانکہ اس کے معنی جیسا کہ حضرت شارح رحمہ اللہ کا ارشاد ہے یہ ہیں کہ

"گو ہم گنہگار ہیں اور شیخ عابد اہل ظاہر متقی ہے۔ لیکن ہم ہیں چونکہ عجز و مسکنت اور اعتراف تقصیر ہے اور اس عابد میں ریا و دعویٰ و تکبر اور دوسروں کی تحقیر پائی جاتی ہے۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ شاید ایسے شیخ کا تقویٰ ہماری معصیت پر ذریعہ نجات ہونے میں غالب نہ آ سکے، بلکہ مغلوب ہو جائے اور اس پر وارد گیر ہونے لگے اور ہماری تقصیرات سے درگذر ہو جائے۔ غرض مقصود پندار و تکبر سے منع کرتا ہے نہ کہ گناہ پر جرات دلاتا ہے"۔(۱)

مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ: نے "بادہ و ساغر" کے مجاز کا پردہ بھی نہیں رکھا ہے اور کھلی کھلی "مشاہدہ حق کی گفتگو" ہے اس کے علاوہ مثنوی شریف تصوف کی کتاب نہیں کتب خانہ ہے، اور اس کو عوام و خواص بلکہ غیروں تک میں جو قبول نصیب ہوا وہ کسی دوسری انسانی کتاب کو شاید ہی ہوا ہو۔ اپنے پرائے، عقل و نقل سنت و بدعت والے سب ہی اس پر سر دھنتے اور اس سے حجت پکڑتے ہیں بڑوں بڑوں نے اس کے درس و تدریس کا شغل رکھا اور شرح و حواشی سے

---

(۱) عرفان حافظ ۲۴۔ ۱۳

اس کے مطالب کو حل کیا ہے۔

لیکن حضرت علیہ الرحمہ کا خاص نقطہ نظر تھا کہ تصوف اسلام اگر تصوف اسلام ہے تو پھر اس میں تعلیم اسلام کے خلاف کوئی بات کیسے ہو سکتی ہے اور کسی مسلمان صوفی خصوصًا مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ جیسے محقق و کامل کی زبان و قلم سے خلاف اسلام کوئی بات کیسے نکل سکتی ہے ' اس اعتبار سے حضرت کی شرح کلید مثنوی واقعی مثنوی کے ایسے مشکلات کی پوری کلید ہے۔ اور حضرت نے اس کی چند سطری تمہید میں اسی خصوصیت کی خاص تصریح فرمائی ہے کہ دیگر " خواشی و شرح اکثر یا طویل زیادہ ہیں یا دقیق ہیں اور بعضے اصل مطلب سے دور یا اصول شرعیہ سے گزرے ہوئے ہیں ——— اس لئے اس کی حاجت معلوم ہوئی کہ ایک مختصر شرح لکھ دی جائے جس میں اصل مطلب یا جس مسئلہ پر اصل مطلب موقوف ہو سلیس تقریر میں پورا آ جائے اور الحاد زندقہ یاحشو زوائد نہ آنے پائے "۔

کلید مثنوی : افسوس کہ بعض عذرات کی بناء پر حضرت سارے دفاتر کی شرح نہ فرما سکے تاہم اول و آخر یعنی پہلے اور چھٹے دفتر کی ایسی شافی و وافی شرح فرما دی ہے کہ دیگر دفاتر کی کلید بھی انہیں سے ہاتھ آ جاتی ہے۔ اولاً تو کلام مجید کی طرح مثنوی کے مضامین بھی متشابہ ہیں ' اس لئے جس طرح سورۂ بقر کی تفسیر پڑھ لینے سے باقی کے حل میں اعانت ہوتی ہے ' اسی طرح " ایک دفتر کی شرح دوسرے دفاتر کے حل میں معین ہو سکتی ہے "۔

پھر دیگر دفتر ششم کی شرح کو خصوصًا اس وجہ سے اختیار فرمایا کہ

" حضرت سیدی و مرشدی (حاجی امداد اللہ مہاجر مکی) قدس سرہ سے سنا تھا کہ دفتر ششم میں اسرار و معانی زیادہ ہیں اور خود دفتر مذکور کے شروع میں ایک شعر میں بھی اس طرف اشارہ ہے۔

بوکہ فیما بعد دستور ے رسد

راز ہائے گفتنی گفتہ شود

اور بعض شارحین نے مولانا سے تصریحاً بھی اس کو نقل کیا ہے کہ ہر متاخر دفتر معانی کے اعتبار سے زیادہ جامع ہے بہ نسبت دفتر مقدم کے ۔ تو دفتر ششم کی شرح گویا تمام دفاتر سابقہ کی شرح ہو جائے گی ۔(۱)

بہرحال جو حضرات مثنوی شریف کا مطالعہ اس حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سب سے مشہور و مسلم مسلمان صوفی کی اور سب سے مشہور و مسلم اسلامی تصوف کی کتاب ہے ' ان کو سب سے زیادہ اس مطالعہ و تحقیق میں مدد انشاء اللہ کلید مثنوی ہی سے ملے گی ۔

مسائل مثنوی : اول و آخر کے دو دفتروں کی مستقل شرح کے علاوہ ایک مستقل رسالہ مسائل مثنوی کے نام سے رقم فرمایا ہے ۔(۲) جس میں تصوف کے بہت سے خاص مسائل کی توجیہہ و تفصیل مثنوی ہی کے اشعار سے فرمائی گئی ہے ۔ اور بھی جا بجا مختلف مواقع پر مثنوی کے متفرق مشکلات کا حل فرمایا گیا ہے ۔ جن میں اس اہتمام کو بیش از بیش پیش نظر رکھا گیا ہے کہ کتاب و سنت یا شریعت کا سر رشتہ طریقت کے ہاتھ سے جانے نہ پائے ۔ ذیل میں محض اندازہ کے لئے دو ایک مثالوں پر قناعت کی جاتی ہے ۔ بعض جگہ تو محض کسی لفظی غلطی پر متنبہ فرما کر سارا اشکال یادر ہوا فرما دیا ہے مثلاً

ایک لفظ سے اشکال دور : کور کور انہ مرو در کربلا ۔ تا نیفتی چون حسین اندر بلا

" اس میں اشکال منشا تمامتر لفظ تا ہے ۔ توجیہ کرنے والوں نے اس کو عموماً تعلیل پر بمعنی تاکہ کے محمول کیا ہے اور احقر اس کو غایت پر بمعنی جب

---

(۱) تمہید دفتر ششم کلید مثنوی ۱۲

(۲) جو بعد میں التکشف میں شامل فرما دیا گیا ہے ۱۲

تک کہ تحمل کرتا ہے "۔

اور فارسی میں جب " تا " دونوں معنوں کے لئے آتا ہے ' تو کیا وجہ ہے کہ وہ دوسرے ہی معنی نہ لئے جائیں جن سے اشکال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اور شعر کے معنی کیسے صاف ہو جاتے ہیں کہ جب تک حضرت حسین علیہ السلام کی طرح مقام امتحان و ابتلا (بلا) کے لئے کمربستہ نہ ہو چکو اس وقت تک اندھوں کی طرح کربلا کا رخ نہ کرو۔ اسی کو حضرت فرماتے ہیں کہ

" جب تک امام عالی مقام حسین علیہ السلام کی طرح مجاہدہ و بلا و صبر و تحمل جفاء میں واقع نہ ہو چکو اس وقت تک کربلا کے مقام عشق میں ناعاقبت اندیشی کے ساتھ قدم نہ دھرو۔ البتہ جس طرح امام علیہ السلام نے اول اپنی ہمت کو قوی کر لیا تھا اور سب بلاؤں کو برداشت کرنے کے لئے مستعد ہوگئے تھے ' اس وقت میدان کربلا میں تشریف لے گئے تھے "۔

" اسی طرح اگر تم پہلے ریاضات و مجاہدات سے نفس میں قوت پیدا کر لو اس وقت طریق عشق میں آنا مبارک ہو۔ حاصل وصول الی اللہ کے طریقوں میں سے طریق عشق کی شرائط کا بیان کرنا ہے ' اور جو شخص ان شرائط پر قادر نہ ہو اس کے لئے دوسرا طریقہ ابرار کا جو عافیت کا ہے موجود ہے۔ اسی کو حضرت شیخ شیرازی نے دوسرے عنوان سے ذکر کیا ہے "۔

اگر مرد عشقی کم خویش گیر
ورنہ رہ عافیت پیش گیر(۱)

قصہ حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام سے غلط استدلال: بہتیرے کم علم و فہم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ کی بناء پر اپنے نزدیک گویا قرآن مجید ہی سے علم باطن یا طریقت کے علم ظاہر یا شریعت سے افضل ہونے کو منصوص قرار دیتے ہیں۔ مثنوی میں جہاں اس قصہ کا بیان ہے ' اس

---

(۱) التکشف حصہ دوم ۱۲

سے بھی اس کا بظاہر وہم ہوتا اور استدلال کیا جاتا ہے۔

آن پسر راکش خضر بُرید حلق
سر آن را در نیابد عام خلق
گر خضر در بحر کشتی را شکست
صد درستی در شکست خضر ہست
وہم(۱) موسیٰ باہمہ نور و ہنر
شد ازان محجوب تو بے پر مپر

حالانکہ خضر علیہ السلام کے اس علم کا حاصل اس کے سوا اور اس سے زائد کیا تھا کہ بعض دور کے زمانی و مکانی تکوینی واقعات کا علم ان کے ظہور سے قبل ان کو ہوگیا تھا یا الہاماً عطا فرما دیا گیا تھا۔ جبلی و فطری الہام یا وحی اللہ تعالیٰ حیوانات بلکہ جمادات تک کو فرماتے ہیں، جیسا کہ خود کلام مجید سے ثابت ہے (۲) اور یوں بھی آدمی علمی تجربات سے تکوینی واقعات قبل از وقوع جان لیتا ہے۔ مثلاً کسوف و خسوف، زلزلہ و طوفان باد و باراں وغیرہ کا پہلے ہی سے علمی تجربات کے اندازوں اور علم ہیئت کے حسابوں سے ہو جاتا ہے۔ اور حضورؐ کی تو حدیث ہی موجود ہے کہ "دنیوی (تکوینی) باتوں کو تم زیادہ جانتے ہو"۔(۳)

بخلاف اس کے حضرات انبیاء علیہم السلام کا اصل فضل و کمال یہ ہے کہ ان کو کائنات اور انسان کے مقصد تخلیق کا علم اور اس مقصد کی تکمیل کے احکام خود اس کے خالق کی طرف سے بے خطا وحی کے ذریعہ عطا ہوتے ہیں۔ جس سے آدمی کو اپنے خالق کی معرفت اس کے قرب و رضا اور آخرت یا "خیر وابقی" زندگی کی فوز و فلاح کی راہ ملتی ہے۔ تکوینی کے مقابل میں اس کا نام تشریعی علم

(۱) وہم کے لفظ سے وہم نہ کیا جائے اس سے مراد مطلق خیال ہے جیسا حضرت نے لکھا ۱۲

(۲) کما قال اللہ اوحی الی النحل۔ واوحی الی الارض۔

(۳) انتم اعلم بامور دنیا کم ۱۲

ہے۔ یہی "تشریعی علم" حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نبوی "نور و ہنر" تھا، جس کے آگے ساری کائنات ارض و سموات کا تکوینی علم بھی گرد ہے۔ اب خود حضرت کی زبان سے سنیں کہ

"اس قصہ سے بعضوں کو شبہ ہوگیا کہ علم باطن علم شریعت سے افضل ہے ——— نیز اس سے مستنبط کیا ہے کہ اگر شیخ خلاف شرع کچھ حکم کرے تو مرید کو اس کا اتباع واجب ہے۔ سو خوب جان لو کہ یہ سب دعوے باطل ہیں۔ علم باطن کا علم شرع سے افضل ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دو وجہ سے۔

"اول یہ کہ علم باطن خود ایک شعبہ علم شریعت ہی کا ہے۔ شریعت نام ہے اصلاح ظاہر و باطن کے طریقہ کے جاننے کا۔ اصلاح ظاہر یہ کہ اقوال و افعال درست کرے اور اصلاح باطن یہ کہ عقائد و اخلاق درست کرے ——— سو جز کس طرح کل سے افضل ہوسکتا ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ اس واقعہ میں حضرت خضر علیہ السلام کو جو بعض امور بعیدہ و مخفیہ کی اطلاع ہوگئی یہ سرے سے وہ علم باطن ہی نہیں جس میں گفتگو ہے۔ بلکہ چند واقعات جزئیہ و حالات کونیہ ہیں، جن کا انکشاف ان کو ہوگیا تھا، جس کا حال اس قدر ہے کہ چیزیں زماناً یا مکاناً بعید تھیں، وہ ان کے علم میں قریب ہوگئیں ——— سو دور کی چیز کا نزدیک معلوم ہونا علم باطن نہیں۔

"بخلاف علم موسیٰ علیہ اسلام کو وہ علوم شرعیہ کلیہ و معارف آلیہ ہیں کہ ظاہر و باطن اس کے شعبے ہیں۔ غرض علم خضری کسی طرح علم موسیٰ سے فائق نہیں۔(۱)

اتباع شیخ کا درجہ: رہا اتباع شیخ کا معاملہ تو اس کا فیصلہ مثنوی ہی کے اس شعر کے ذیل میں سنو کہ

---

(۱) التکشف حصہ سوم ص ۷ – ۱۲

گرامینم متہم نبود امین
گربگویم آسمان رامن زمین

اس شعر میں اشارہ ہے کہ شیخ کامل (جیسا لفظ امین سے ظاہر ہے) جو جامع شریعت و طریقت و علم و عمل ہو اگر کوئی کام مرید کی فہم و قیاس سے خاج کرے یا کوئی کلام اس سے ایسا صادر ہو تو بدگمانی نہ کرے بلکہ اپنی فہم کا قصور سمجھے کہ اس کی کنہ تک نہیں پہنچی ۔ البتہ مرید کو اگر کسی خلاف شرع کام کا حکم کرے تو جب تک اس کا موافق شرع ہونا سمجھ میں نہ آجائے عمل جائز نہیں ۔ حدیث میں ہے " لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق " ۔ لیکن اس کی خدمت میں انکار و گستاخی یا اعتراض سے پیش نہ آئے بلکہ بادب عذر کرے اور اس کی کنہ دریافت کرنے کے لئے عرض کرے ۔ بعد اطمینان عمل کرے " (ص ۲۶)

باطن پیر ہر جگہ ہے : ایک اور مثال ملاحظہ ہو ۔ بعض صوفیہ کا ایک مقولہ یہ ہے ، کہ " باطن پیر ہر جگہ ہے " ۔ اس پر مثنوی کے اس شعر کی تفہیم میں ارشاد ہے کہ

گفت جانم از محبان دور نیست
لیک بیروں آمدن دستور نیست

" اس میں مولانا نے اشارہ کیا ہے کہ اگر پیر سے محبت کامل ہو تو ظاہری دوری مانع فیض نہیں ۔ حدیث المرء مع من احب اس کی موید ہے ۔ یہی محبت معیت روحانی ہے ۔ مگر اس شخص کے لئے جس کو تعلیم کی حاجت نہ رہی ہو صرف تقویت نسبت میں مشغول ہو ، ورنہ بدون قرب جسمانی کام نہیں چلتا البتہ ثواب و برکت ضرور ہے ۔ اس مضمون کو بعض صوفیہ ان الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں کہ باطن پیر ہر جگہ ہے ۔ جس کے معنی سمجھنے میں عوام الناس غلطی کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ پیر ہر جگہ حاضر و ناظر ہے ۔ سو یہ یقیناً غلط اور خلاف واقع ہے

۔ گو بطور کرامت گا ہے ایسا واقع ہوا ہے ۔ مگر یہ امر نہ مستمر ہے نہ ضروری کہ جب پیر کی شکل نظر آئے تو سچ مچ پیر ہی ہو بعض اوقات کوئی فرشتہ وغیرہ اس کی شکل میں نظر آ جاتا ہے "۔

اس کے علاوہ " باطن پیر ہر جگہ ہے " یہ ایک خاص اصطلاح بھی ہے ' جس کی نسبت ارشاد ہے کہ

" باطن اصطلاح میں اس اسم الٰہی کو کہتے ہیں جس کا کسی مخلوق میں ظہور ہو ۔ پس شیخ کامل میں اسم ہادی کے فیض کا ظہور ہوتا ہے ۔ سو باطن شیخ سے مراد اسم ہادی ہوا ' چونکہ وہ حق تعالیٰ کی صفت ہے ' جو مکان و زمان سے منزہ ہے اور اس کا فیض عام و محیط ہے ۔ اس اعتبار سے کہہ دیا جاتا ہے کہ باطن شیخ ہر جگہ ہے ' جس کا حاصل یہ ہے کہ صفت ہادی کا فیض کسی زمان و مکان کے ساتھ خاص نہیں ۔ اور چونکہ قابلیت اس فیض کے حاصل کرنے کی شیخ کی صحبت و تعلیم سے نصیب ہوتی ہے ' اس لئے باطن کو شیخ کی طرف بادنیٰ مناسبت مضاف کر دیتے ہیں کذا قال مرشدی رحمتہ اللہ علیہ ۔(۱) (الحاج امداد اللہ مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ)

غرض کوئی عالم و محقق مسلمان صوفی شریعت اسلام یا قرآن و حدیث کے خلاف کسی بات کو سرے سے علم (یعنی علم دین) کہہ ہی کیسے سکتا ہے ۔ بلکہ عارف رومی کے نزدیک تو علم دین یا اس کے تابع علوم کے علاوہ ہر نام نہاد علم " خبیث گری " کا علم ہے ۔

علم دین فقہ است و قرآن و حدیث
ہر کہ خواند غیر ازین گرد و خبیث

الحمدللہ کہ اسلام تصوف اور سچے مسلمان صوفیوں پر جاہلوں اور دوکانداروں نے جہالت و نفسانیت نے جو پردے ڈال رکھے تھے حق تعالیٰ نے ان کو مجدد وقت

---

(۱) تکشف حصہ سوم ص ۴۴ ۔ ۱۴

کے ہاتھوں پارہ پارہ فرما کر حق کو کیسا ظاہر و بے غبار فرما دیا ۔ فاحسن اللہ جزائہ و رزقنا ابتاعہ ۔ خود اس فضل و احسان اور نعمت عظمیٰ کا شکر ادا فرماتے ہیں کہ

" اللہ کا شکر ہے کہ مدتوں کے بعد فن کی تجدید ہوئی اور طریق روز روشن کی طرح صاف و بے غبار ہوگیا ۔ ہر چیز اپنے درجہ پر نظر آنے لگی ۔ بڑی ہی گڑبڑ مچا رکھی تھی ۔ حقیقت مستور ہوچکی تھی ۔ جس کی وجہ سے بعض کو درجہ غلو کا ہوگیا تھا اور بعض کو نفرت اور یہ افراط و تفریط محض دوکاندار جاہل صوفیوں اور پیروں کی بدولت ہوتی تھی ' جو بفضلہٖ تعالیٰ اب اعتدال و تحقیق سے مبدل ہوگئی " ۔

(افاضات حصہ ششم ص ۹۰)